میرے دیدۂ تر کی بیخوابیاں　　میرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
میرے نالۂ نیم شب کا نیاز　　میری خلوت و انجمن کا گداز

سلیم کے نام خطوط

جلد سوم

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

نام کتاب	سلیم کے نام (جلد سوم)
مصنف	پرویز
ایڈیشن	ششم اکتوبر 1998
ناشر	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	25بی گلبرگ II لاہور پاکستان
مطبع	زاہد بشیر پرنٹرز

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات

مشمولات	صفحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

پیش آہنگ

"سلیم کے نام خطوط" کا تفصیلی تعارف، اس سلسلۂ زریں کی پہلی کڑی (جلد اوّل) میں کرایا جا چکا ہے۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جلد اوّل سترہ خطوط پر مشتمل تھی اور جلد دوم بارہ پر۔ زیرِ نظر جلد (سوم) میں پندرہ خطوط ہیں۔

اس طرح، اس سلسلہ میں اگست ۱۹۶۰ء تک کے خطوط آگئے ہیں۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس پورے سلسلہ کو قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو پڑھا دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ان کے وہ تمام شکوک رفع ہو جائیں گے جو اسلام کے متعلق مروّجہ (غلط) نظریات کی وجہ سے ان کے قلب و دماغ کے لئے وجہ صد اضطراب بن جاتے ہیں، بلکہ اس دین کا صحیح تصوّر بھی ان کے سامنے اجاگر ہو جائے گا، جس میں اقوامِ عالم کی مشکلات کا حل موجود ہے۔ ان خطوط کا سلسلہ کوئی بیس سال اُدھر شروع ہوا تھا۔ اس عرصہ میں انہوں نے ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و نگاہ میں جو حسین انقلاب پیدا کیا ہے اس کی زندہ شہادت وہ بے شمار سعادتمند نوجوان ہیں جو مغربی دہریت اور روسی کمیونزم کے آغوش سے نکل کر دینِ خداوندی کے شیدائی بن چکے ہیں۔ جوں جوں ان خطوط کی اشاعت کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا اس حلقہ میں بھی وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔

(۲) زیرِ نظر جلد میں خطوط کی ترتیب پہلے سے طے کردہ پروگرام کے مطابق عمل میں آئی ہے، بجز دو خطوط کے۔ یعنی چونتیسواں خط (انسانی فطرت کیا ہے؟) دوسری جلد میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔ اور چوالیسواں خط

(ضبطِ ولادت) جسے چھتیسویں خط کے بعد آنا چاہیئے تھا، آخر میں درج کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ خط شائع ہی جولائی ۱۹۶۰ء میں ہوا تھا۔ ان خطوط کے شروع میں اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے۔

(۳) ان خطوط کی اشاعت سے فارغ ہو جانے کے بعد ہمارے سامنے محترم پرویز صاحب کے مجموعۂ مضامین "فردوسِ گم گشتہ" کے جدید ایڈیشن کی طباعت کا پروگرام ہے۔ یہ مجموعہ مدت ہوئی شائع ہوا تھا اور اب عرصہ سے نایاب ہے۔ صاحبِ مضامین نے ان پر نظر ثانی کی ہے جس سے ان میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ نیز ان میں، متعدد مضامین کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ ہم اس اہم تالیف کو بہت جلد منتظرین تک پہنچانے کا انتظام کر سکیں گے۔ وما توفیقی الّا باللہ العلی العظیم۔

والسلام
طلوعِ اسلام
۲۵، بی، گلبرگ ۲۔ لاہور۔

اگست ۱۹۶۰ء۔

تیسواں خط

علماء کون ہیں؟

اس میں کوئی شبہ نہیں سلیم! کہ علم وجۂ شرفِ انسانیت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ علم کہتے کسے ہیں اور علماء کون ہیں؟ قرآن نے اس سوال کا جواب بڑا جامع اور مفصّل دیا ہے، لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے چند الفاظ تمہیداً ضروری ہیں۔ انہیں غور سے سننا۔

علم کی دنیا میں حکمائے یونان کا جو مقام ہے' اس سے تم واقف ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک نوعِ انسانی کی جس قدر تاریخ ہمارے سامنے آچکی ہے' اس میں علم و حکمت کی داستان کا آغاز یونان سے ہوتا ہے۔ ان میں سقراط SOCRATES کو ابوالآباء اور افلاطون PLATO کو اس کے بہترین شارح' اور بجائے خویش ایک مکتبِ فکر کے مؤسّس کی حیثیت حاصل ہے، لیکن سقراط صرف انسان کو قابلِ مطالعہ سمجھتا ہے۔ کائنات کو نہیں۔ KNOW THYSELF اس کے فلسفہ کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ افلاطون عالمِ محسوس کے وجود پر ہی خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کائنات جو ہمیں اس طرح محسوس CONCRETE دکھائی دیتی ہے اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ اصلی اور حقیقی کائنات عالمِ امثال WORLD OF IDEAS میں ہے اور یہ مرئی VISIBLE کائنات اس حقیقی دنیا کا عکس ہے۔ لہٰذا اس کائنات کے متعلق جو علم' حواس SENSES کے ذریعے حاصل کیا جائے (یعنی PERCEPTUAL KNOWLEDGE) وہ قابلِ اعتماد ہی نہیں یقینی علم وہ ہے جو آنکھیں اور کان بند کر کے عالمِ تصوّر میں حاصل کیا جائے۔ افلاطون کا یہی فلسفہ ہے جس پر یونانی تصوّف کی عمارت استوار ہوئی۔

تصوّف

اسی نے ہندوستان پہنچ کر ویدانت کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ ہندو فلسفہ کی رُو سے پراکرتی (مادی دنیا) مایا (فریب) ہے۔ یہ سب برہما کا سپنا (خدا کا خواب) ہے۔ یہ ایشور کی لیلا ہے یعنی ناٹک

کا کھیل جس میں کوئی شے حقیقی نہیں ہوتی بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے. نہ بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے. نہ غلام غلام نہ دریا، دریا ہوتا ہے. نہ پہاڑ، پہاڑ. یہ سب فریبِ نگاہ ہوتا ہے. اسی بناء پر ہندو فلسفہ میں خدا کو "نٹ راجن" کہا جاتا ہے. یعنی نٹوں (ایکٹروں، کھلاڑیوں) کا بادشاہ. اس مقام پر ضمناً یہ بھی سمجھ لو سلیم! کہ کائنات کو اس طرح باطل قرار دینے کا نتیجہ تھا کہ اس کی طرف سے انسان کے دل میں منفی نقطۂ نگاہ WEGATIVE ATITUDE پیدا ہو جائے. یہی منفیانہ اندازِ نگاہ تھا جس نے "خدا پرست" انسانوں کی نگاہ میں دنیا کو قابلِ نفرت بنا دیا. یہی فلسفہ ہے جو ایرانی تصوّف کے راستے مسلمانوں میں بھی آگیا اور ان کی زندگی کے ہر گوشے کو متأثر (اور مسموم) کر گیا. ہمارے تصوّف کی ساری عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے اور ہماری شاعری چونکہ اسی تصوّف کی نقیب ہے اس لئے ہمیں بھی قدم قدم پر اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں. کبھی سقراط کے اتباع میں یہ کہا جاتا ہے کہ

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درا
تو زغنچہ کم نہ دمیدہٖ درِ دل کشا بہ چمن درا (بیدل)

اور کبھی افلاطون کے تتبّع میں یہ کہ

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اور اسی سے ہمارے ہاں بھی دنیا قابلِ نفرت سمجھی جانے لگی. (یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں).

بہرحال سلیم! میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن سے پہلے کائنات سے متعلق نظریہ یہ تھا کہ اس کا حقیقی وجود کچھ نہیں. یہ محض فریبِ تخیّل ہے. سراب ہے. سایہ ہے، وہم ہے. گمان ہے. اور جب کائنات وہم و فریب ہے تو اس کے متعلق علم بھی، درحقیقت علم نہیں، ظنّ و گمان ہے. قرآن آیا اور اس نے (ہر باطل تصوّر کی طرح) افلاطون کے اس طلسم کی بھی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں.

قرآن کا چیلنج

اس نے تصوّف اور ویدانت کے نظر فریب تخیّلات میں الجھی ہوئی انسانیت کو للکار کر پکارا اور کہا کہ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَہُمَا بَاطِلًا ؕ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے باطل پیدا نہیں کیا. ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۚ یہ اُن لوگوں کا ظن و خیال اور وہم و گمان ہے جو حقیقت سے انکار کرتے ہیں. فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ؕ (۳۸/۲۷)

اور جو لوگ اتنی بڑی حقیقت سے انکار کریں (اور دنیا کو باطل اور قابلِ نفرت ٹھہرادیں) تو ان کے اس انکار کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں. تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے ایک آیت میں صدیوں کے غلط تصوّر کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا. اور اس کے انسانیت سوز نتائج کو کس طرح بے نقاب کر دیا ہے؟ پھر اس پر بھی غور کرو کہ قرآن نے کائنات کو باطل قرار دینے اور اس کی طرف سے منفیانہ تصوّر رکھنے والوں کو کافر کہہ کر پکارا ہے. تم نے سوچا کہ قرآن کی رُو سے کفر اور ایمان کی حدیں کہاں تک چلی جاتی ہیں؟ اور کافر و مومن کے امتیازی خصائص کیا ہیں؟ اور پھر یہ جو کہا کہ اس قسم کے منفیانہ اندازِ نگاہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کی مزرعِ ہستی جل کر راکھ ہو جاتی ہے. تو یہ کتنی بڑی تاریخی حقیقت کا بیان ہے؟ کائنات کے متعلق منفیانہ اندازِ نگاہ کا مظہر مسلکِ خانقاہیت ہے. اسی کو ویدانت اور تصوّف کہتے ہیں. تم اس مسلک کی تاریخ پر غور کرو اور دیکھو کہ اس راستہ میں انسانوں نے جس قدر جانکاہ مشقتیں اٹھائی ہیں اور صبر طلب ریاضتیں لیں ان کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلا کہ انسان کی عمرانی زندگی کی ہری بھری شاخیں جھلس کر رہ گئیں.

یہ تو تھا کائنات کو باطل قرار دینے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ. اس کے بعد مثبتانہ انداز میں کہا کہ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ. حقیقت یہ ہے کہ خدا نے اس پست و بلند کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے. کائنات حقیقت پر مبنی ہے، فریبِ تخیّل نہیں. یہ یکسر تعمیری مقاصد کے لئے پیدا کی گئی ہے تخریبی نتائج کے لئے نہیں. اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ° (۲۹/۴۴) اس انکشافِ حقیقت میں جو قرآن نے کیا ہے علم و آگہی کی بہت بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو اس پر یقین رکھتے ہیں. دیکھو سلیم! سابقہ آیت میں کائنات کو باطل قرار دینے والوں کو کافر کہا گیا تھا. زیرِ نظر آیت میں اسے حق سمجھنے والوں کو مومن قرار دیا گیا ہے. دیکھا تم نے کہ قرآن کس طرح اپنے مطالب کو خود ہی واضح کرتا چلا جاتا ہے.

کائنات کو "ایشور کی لیلا" قرار دینے والوں کے نظریہ کے ابطال میں کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ° (۴۴/۳۸) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے یوں ہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا. تخلیقِ کائنات ایک نہایت اہم SERIOUS پروگرام کا جزو ہے، کھیل تماشہ نہیں. اسے بالحق پیدا کیا گیا ہے.

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن اپنے اس دعویٰ کو (کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے) یونہی منوانا چاہتا ہے یا علم و بُرہان کی رُو سے تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے؟ قرآن اپنے ہر دعویٰ کو علم و برہان کی بنیادوں پر پیش کرتا

اور فکر و بصیرت کی رُو سے ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں بھی اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰/۵﴾ ہم ان حقائق کو ان لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

علم کی قرآنی تعریف

یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ علم کسے کہتے ہیں؟ سنو سلیم! قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ یاد رکھو! جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔" آیت کا اتنا حصّہ بھی کچھ کم حقیقت کشا اور بصیرت افروز نہیں۔ لیکن اس کے بعد کے چند الفاظ نے علم کی ایک ایسی تعریف DEFINITION دے دی ہے جس سے ساری بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا: اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۱۷/۳۶﴾ یہ حقیقت ہے کہ تمہاری سماعت، بصارت اور فواد ہر ایک پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تم نے سمجھا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ قرآن سمع (سننے) اور بصر (دیکھنے) کو انسانی حواس SENSES کے معنوں میں استعمال کرتا ہے اور فواد وہ چیز ہے جسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں MIND کہا جاتا ہے۔ انسانی حواس (سمع و بصر) معلومات DATA فراہم کر کے انسانی فواد MIND تک پہنچاتے ہیں اور فواد ان سے استنباطِ نتائج کرتا ہے۔ تم کارتوس کی آواز سنتے ہو تو فوراً اس نتیجہ پر پہنچتے ہو کہ کسی کے گولی لگ گئی۔ اور باہر جا کر دیکھتے ہو کہ جسے گولی لگی ہے وہ تمہارا دوست ہے تو گولی چلانے والے کے خلاف تمہارے دل میں آتشِ انتقام بھڑک اٹھتی ہے۔ اس تمام واقعہ میں تمہارے سمع و بصر و فواد کی شہادت موجود ہے لہذا یہ علم ہے۔ لیکن اگر تم نہ بندوق کی آواز سنو نہ کسی کی چیخ۔ نہ اپنے دوست کو تڑپتا دیکھو، نہ کسی گولی چلانے والے کو۔ اور یونہی کسی کی بات سن کر ایک شخص کی جان کے لاگو ہو جاؤ تو تمہارا یہ فعل علم پر مبنی نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس میں تمہارے سمع و بصر کی شہادت موجود نہیں۔ تم نے غور کیا کہ قرآن علم کے بارے میں حواس SENSE PERCEPTION کو کس قدر اہمیت دیتا ہے؟ یہ دوسری ضرب ہے جو وہ افلاطونی تصور کے خلاف لگاتا ہے اور اسے پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن نے کہا کہ جس بات کی شہادت سمع و بصر نہ دے وہ علم پر مبنی ہی نہیں۔ لیکن صرف سمع و بصر ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ فواد بھی۔

سمع و بصر سے کام نہ لینے والے

سمع و بصر و قلب کی اسی کیفیت کے پیشِ نظر قرآن نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ ان سے کام نہیں لیتے

وہ انسانی سطح پر نہیں بلکہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انہیں جہنمی قرار دیتا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ جن وانس (شہری اور صحرائی آبادیوں) میں اکثر وہ لوگ ہیں جو اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں جو انہیں سیدھی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ان کی روش یہ ہے کہ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا وہ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ یہ انسان نہیں، حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (۷/۱۷۹) یہ علم و حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس سے بھی واضح ہے کہ علم وہی علم ہے جس کی شہادت سمع و بصر و قلب دیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا علم نظری مباحث THEORETICAL PROBLEMS کے متعلق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایسے امور میں 'سمع و بصر' کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا۔ سمع و بصر کا تعلق مظاہر فطرت کے مشاہدات اور کائناتی نظام کے مطالعہ سے ہے۔ یعنی کائنات کے ایک ایک گوشے کو غور و فکر سے دیکھنا۔ اس عظیم القدر اور محیّر العقول مشینری کے ایک ایک پُرزے کا مشاہدہ کرنا۔ پھر مختلف تجربات کی رُو سے یہ دیکھنا کہ ان پُرزوں کی ساخت و پرداخت میں کونسا قانون اور ان کی نقل و حرکت میں کونسی اسکیم کارفرما ہے۔ اسی کو دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں علم سائنس SCIENTIFIC KNOWLEDGE کہتے ہیں۔ اور اسی کو قرآن مومنین کا شعار بتاتا ہے۔

غور کرو سلیم! کہ قرآن اس حقیقت کو کس قدر واضح اور حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ یقیناً اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و شعور کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ (یہاں ایک بات کا ضمناً سمجھ لینا ضروری ہے۔ ایک چیز تو ہے کائنات کا عدم سے وجود میں آنا۔ اسے قرآن نے بدع اور فطر سے تعبیر کیا ہے۔ اور دوسری چیز ہے موجودہ عناصر میں مختلف تراکیب و تناسب سے مختلف چیزیں بناتے چلے جانا۔ اسے عام طور پر تخلیق کہا گیا ہے۔ خلق کے معنی صحیح صحیح تناسب کے ہیں۔ بنابریں تخلیق ارض و سما سے مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں مختلف عناصر میں تراکیبِ نو سے جو مختلف تغیرات رونما ہوتے ہیں اور نئی نئی چیزیں ظہور میں آتی ہیں اور ان پر غور و فکر کرنے سے کائناتی پروگرام اور قانونِ فطرت کی بڑی بڑی عظیم نشانیاں سامنے آجاتی ہیں۔ میں نے اس تشریح کو اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ انسانی فکر کچھ نہیں بتا سکتا کہ کائنات کس

طرح عدم سے وجود میں آگئی۔ یہ وہ مقام ہے جو فکرِ انسانی کی حدود سے ماوراء ہے۔ لہٰذا قرآن نے اس مقام کے متعلق فکر و تدبّر کی دعوت نہیں دی۔ فکر و تدبّر کا مقام وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں اس محسوس کائنات کے تغیّرات اور حوادث ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں۔ بہرحال) قرآن نے کہا یہ ہے کہ تخلیق ارض و سماء اور اختلاف لیل و نہار میں اربابِ دانش و بینش کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ کن اربابِ دانش کے لئے؟

خُدا کا ذکر کرنے والے

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔ ان کے لئے جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی تخلیقِ ارض و سماء میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنے مشاہدات و تجارب کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے کائنات کی کسی شے کو بیکار یا تخریبی نتائج کے لئے پیدا نہیں کیا۔ غور کیا سلیم! کہ یہ کتنی بڑی بات ہے جو قرآن نے کہی ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ کائنات کی کوئی شے نہ عبث و بیکار ہے اور نہ تخریبی نتائج کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ ہر شے ایک متعیّن مقصد رکھتی ہے اور نوعِ انسانی کے لئے کسی نہ کسی پہلو سے نفع بخش ہے۔ لیکن قرآن کا یہ مقصد نہیں کہ ہم اس کے اس دعویٰ کو یونہی مانتے رہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا فریضہ ہے کہ تم کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کرو اور مسلسل مشاہدات اور پیہم تجربات کے بعد ان کے متعلق ثابت کرو کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ سوچو سلیم! یہ کتنا بڑا پروگرام ہے جو قرآن نے جماعتِ مومنین کے سامنے رکھا ہے۔ یہ کتنی عظیم ذمہ داری ہے۔ کائنات کی ہر شے کے متعلق عملاً ثابت کرنا کہ وہ فلاں فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے، یہ ہے قرآن کو ماننے والوں کا فریضہ (غور کرو کہ اس کے لئے کس وسیع اور عمیق سائنٹیفک تحقیقات کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کتنی بڑی بڑی معمل LABORATORIES درکار ہیں) سُبْحٰنَكَ۔ تو اس سے بہت دور ہے کہ کسی شے کو محض تخریب کے لئے پیدا کر دے۔ یہ چیز تیری شانِ ربوبیت سے بہت بعید ہے۔ یہ تو ہماری کم علمی اور سائنٹیفک تحقیقات کا فقدان ہے جو ہم ان کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتے ہیں۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ تو ہمیں ان کی تحقیقات کی توفیق عطا فرما تاکہ ہم اس قسم کے دردناک عذاب سے محفوظ رہیں۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ○ اس لئے کہ جو قومیں اس قسم کی تحقیقات RESEARCHES سے اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتی ہیں وہ تسخیرِ فطرت نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ۔ اور پھر ان ظالمین کا دنیا بھر میں کوئی

یار و مددگار نہیں ہوتا۔ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ (۳/۱۹۱) تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے اس ایک آیت میں کتنی بڑی حقیقتوں کو بیان کر دیا ہے۔ بہرحال بات یہ ہو رہی تھی کہ قرآن کی رُو سے امتِ مسلمہ اور جماعتِ مومنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ کائنات کی ایک ایک چیز کا مشاہدہ کریں۔ اور پیہم تجربات سے ان کے منفعت بخش پہلوؤں کو بے نقاب کرتے جائیں۔

کائنات میں آیات اللہ

اسی کو قرآن نے ذکر و فکر سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی کائناتی قوانین کو اپنے سامنے رکھنا اور ان میں ہر آن غور و تدبّر کرتے رہنا۔ یہی مومنین کا شعار تھا۔ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۴۵/۳) مومنین کے لئے کائنات کے ہر گوشے میں آیاتِ خداوندی بکھری پڑی ہیں۔ انہی سے انسان کو خدا کی خداوندی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ وَ فِیْ خَلْقِکُمْ وَ مَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۝ (۴۵/۴) اور خود تمہاری تخلیق اور دیگر ذی حیات کی افزائشِ نسل میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو قانونِ خداوندی پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ (۴۵/۵) اور رات اور دن کی گردش میں اور اس بارش میں جو بادلوں سے برستی ہے اور ہر جاندار کے لئے اپنے اندر نشوونما کا سامان رکھتی ہے اور جو زمینِ مُردہ کو از سرِ نو زندگی عطا کرتی ہے۔ اور ان ہواؤں میں جو مختلف موسموں میں مختلف سمتوں کو چلتی ہیں۔ ان تمام مظاہرِ فطرت میں اس قوم کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتی ہے۔ اِن حقائق کے بیان کرنے کے بعد قرآن ایک ایسی عظیم حقیقت کو سامنے لاتا ہے جس سے بیک وقت حیرت و بصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ فرمایا۔ تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ ۚ یہ وہ آیات ہیں جنہیں ہم حق کے ساتھ تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۢ بَعْدَ اللّٰہِ وَ اٰیٰتِہٖ یُؤْمِنُوْنَ ۝ (۴۵/۶) سو جو لوگ قوانین خداوندی پر غور و فکر آیاتِ الٰہیہ کے مشاہدہ اور مطالعہ کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے تو پھر ان کے سامنے اور کون سی حقیقت ایسی آئے گی جس کی رُو سے وہ خدا پر ایمان لائیں گے؟ یعنی اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے لئے مظاہرِ فطرت کا مشاہدہ اور اس کے کائناتی قوانین کا مطالعہ کرو۔ اگر کسی کو ان کے ذریعے بھی خدا پر ایمان حاصل نہیں ہوتا تو پھر کوئی اور حقیقت ایسی نہیں رہ جاتی جس سے اسے ایمان نصیب ہو سکے۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن مشاہدۂ کائنات اور مطالعۂ فطرت پر کس قدر زور دیتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ صحیح اور

علیٰ وجہ البصیرت ایمان حاصل ہی اس سے ہوتا ہے۔ اس سے "خدا بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے"۔

میں نے جو یہ کہا ہے کہ اس سے خدا بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے، تو یہ محض شاعری نہیں۔ یہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے۔ ایک آیت کا نہیں۔ متعدد آیات میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔ ذرا کان کھول کر سنو اور سوچو کہ قرآن نے چند الفاظ میں کتنی بڑی حقیقت کو سمٹا کر رکھ دیا ہے۔

انسانی زندگی کا منتہیٰ کیا ہے؟ ایک خدا پرست انسان کی آخری آرزو کیا ہو سکتی ہے؟ احکامِ خداوندی کی پابندی سے انتہائی مقصود کیا ہے؟ ان سوالات کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ ہر خدا پرست کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اسے خدا مل جائے۔

لقاءِ رب

اس کی اپنے رب سے ملاقات ہو جائے۔ اب دیکھو سلیم! قرآن اس کے لئے کیا طریق بتاتا ہے۔ سورۂ رعد میں ہے اَللّٰهُ الَّذِىْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا اللہ کی ذات وہ ہے جس نے ایسے ایسے عظیم کرّوں کو فضا کی بلندیوں میں، بغیر کسی ایسے ستون کے جو تمہیں نظر آئے، اس حسن و خوبی سے اٹھا رکھا ہے۔ ضمناً اس آیت میں تَرَوْنَهَا کا لفظ غور طلب ہے۔ یعنی یہ کرّے اس فضا میں "ستونوں" کے سہارے قائم ہیں۔ لیکن وہ ستون ایسے نہیں جو تمہیں دکھائی دے سکیں۔ وہ VISIBLE نہیں۔ یہ ستون وہ کششِ ثقل و انجذاب ہے جس سے یہ کرّے اس طرح فضا میں معلّق ہیں اور کشش کی قوت ایسی چیز نہیں جو آنکھوں سے دکھائی دے سکے۔ اس ضمنی تشریح کے بعد، پھر اصلی آیت کی طرف آؤ۔ اس کا بقایا حصّہ یہ ہے ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اور وہ خدا اس تمام کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں رکھے ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اس نے چاند اور سورج کو اپنے قانون کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ وہ مقرّر کردہ راستوں پر ایک وقتِ معیّن تک کے لئے بلا چون و چرا چلے جا رہے ہیں۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ وہ خدا اپنے اس پروگرام کو حسنِ تدبیر سے چلائے جا رہا ہے، يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ اور اپنی ان آیات کو تمہارے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ٥ (۱۳/۲) تاکہ تم اپنے ربّ کی ملاقات کا پورا پورا یقین کر سکو۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے یہاں کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ نظامِ کائنات کے متعلق یہ تمام تفصیلات اس لئے بیان کی جاتی ہیں کہ تمہیں اس بات کا یقین آجائے کہ تم اپنے رب سے مل سکتے ہو۔ تمہارا رب تمہارے سامنے آسکتا ہے۔ اس کا مطلب صاف

ہے کہ اگر تم اپنے رب کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم نظامِ کائنات کا مطالعہ کرو، ایک ایک شے پر غور و فکر کرو۔ مختلف تجربات سے اس حقیقت کا انکشاف کرو کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات کس محکم قانون کے مطابق چل رہا ہے اس طرح وہ تمام پردے ایک ایک کر کے اُٹھ جائیں گے جو خدا کے نظامِ ربوبیت کو سطحِ بین نگاہوں سے چھپائے رکھتے ہیں۔ اور تم علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لو گے کہ اس کا قانونِ ربّ العالمینی کس طرح کائنات کی نشو و نما کئے جا رہا ہے۔ اس طرح تم اپنے رب کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لو گے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے آنکھوں سے دیکھ لینا تو ایک طرف، اس کا تصور بھی ذہنِ انسانی میں نہیں آ سکتا۔

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (۶/۱۰۳) انسانی نگاہیں اسے پا ہی نہیں سکتیں۔ اس لئے "لقاءِ رب" کے یہ معنی نہیں کہ خدا کی ذات بے نقاب ہو کر انسان کے سامنے آ سکتی ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ فطرت کے مشاہدے سے خدا کا نظامِ ربوبیت انسان کے سامنے بے نقاب ہو کر آ جاتا ہے اور وہ اس کی ربّ العالمینی کی کارفرمائیوں اور کرشمہ سازیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ بہرحال یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے 'لقاءِ رب' کا یقین انہی کو آ سکتا ہے جو فطرت کا مشاہدہ کریں۔ لیکن اس کے لئے بڑی جدّ و جہد درکار ہوتی ہے۔ پیہم سعی و عمل اور مسلسل تگ و تاز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے کبھی ہمالیہ کی چوٹیوں پر چڑھنا پڑتا ہے اور کبھی بحرِ اٹلانطک کی گہرائیوں میں اُترنا۔ کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں جھلسنا پڑتا ہے اور کبھی قطبِ شمالی کے برف پوش میدانوں میں ٹھٹھرنا۔ کبھی شیروں کے مُنہ میں ہاتھ دینا پڑتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو سانپوں سے ڈسوانا۔ کبھی ایک پتے کی تحقیق میں مہینوں وقفِ فکر و تدبّر رہنا پڑتا ہے اور کبھی ایک جرثومہ کی تشریح میں برسوں محوِ مطالعہ و مشاہدہ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کچھ وہی قومیں کر سکتی ہیں جو حاضر و موجود پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں بلکہ مستقبل کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہیں۔ دیکھو سلیم! قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے۔ إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ٥ یقیناً دن اور رات کی گردش

متقی کون ہے

اور کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اس کی تخلیق میں تقویٰ شعار قوم کے لئے خدا کی آیات ہیں۔ (ضمناً تم نے غور کیا سلیم! کہ خدا نے متقیوں کی کیا علامت بتائی ہے؟)۔ اس کے بعد ہے إِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ

الدُّنیا۔ اس کے برعکس جو لوگ "ہماری ملاقات" کی توقع نہیں رکھتے۔ جن کے دل میں اس کی آرزو موجزن نہیں ہوتی۔ یعنی وہ لوگ جو پیش پا افتادہ مفاد، حال کی قریبی زندگی پر راضی ہو جاتے ہیں وَ اطْمَاَنُّوْا بِھَا اور جو کچھ سامنے پڑا ہوا اسی پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ٥ یعنی وہ لوگ جو ہماری ان کائناتی نشانیوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ٥ (۱۰/۷-۸) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال کی بدولت جہنم کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔ پہلے تو اس بات پر غور کرو سلیم! کہ قرآن کریم نے وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا اور وَ اطْمَاَنُّوْا بِھَا سے کتنی بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ دنیا میں قوموں کی نکبت و زبوں حالی اور عروج و اقبال کا بنیادی راز کیا ہے؟ کیا یہی نہیں کہ ایسی قومیں اس پر شاکر اور قانع ہو کر بیٹھ جائیں جو انہیں آسانی سے میسر آ رہا ہو وہ ندرتِ فکر اور قوتِ عمل سے محروم ہو کر ذلت و پستی کے عمیق گڑھوں میں جا گرتی ہیں۔ اور زندہ قوموں کی صفوں سے کہیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ان کے برعکس جو قومیں حاضر و موجود پر قانع نہیں رہتیں بلکہ مسلسل محنت و مشقت سے نت نئی ایجادات اور نت نئے انکشافات کرتی رہتی ہیں وہ مصافِ زندگی میں کہیں آگے نکل جاتی ہیں۔ یہ وہ قومیں ہیں جو خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھنے کے نشہ میں سرشار ہوتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ آسمان ان پر اپنی قوتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ زمین اپنے چھپے ہوئے خزانے ان کے حوالے کر دیتی ہے۔ جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ اس سامانِ ربوبیت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ لِقَآئِہٖٓ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ

سامانِ ربوبیت سے محرومی

جو لوگ ان آیاتِ خداوندی اور ملاقاتِ ربی سے انکار کرتے ہیں وہ خدا کے عطا فرمودہ سامانِ نشوونما و ارتقاء سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ٥ (۲۹/۲۳) یعنی یہ لوگ ایک دردانگیز عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تم نے دیکھا سلیم! خدا کے سامانِ ربوبیت سے محرومی کو قرآن نے عذابِ الیم کہا ہے۔ اسی کو سورۂ آلِ عمران اور سورۂ یونس میں عذابِ نار سے تعبیر کیا گیا ہے (۳/۱۹۱ ؛ ۱۰/۸)۔ (یہ آیات پہلے لکھی جا چکی ہیں) ذرا سوچو! کہ حجاز کے بے برگ و گیاہ صحرا کے نیچے ذہبِ سیال LIQUID GOLD یعنی پٹرول کے دریا صدیوں سے بہہ رہے تھے لیکن چونکہ وہ لوگ حاضر و موجود پر مطمئن تھے اس لئے وہ اس بیش بہا نعمتِ خداوندی کی نفع بخشیوں سے محروم تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ وہ نانِ شبینہ تک

کے لئے دوسروں کی خیرات کے محتاج تھے۔ یہ خدا کا بہت بڑا عذاب تھا (قرآن نے بھوک کو خدا کا عذاب کہا ہے۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲) اب اقوامِ مغرب کی نگہ خارا شگاف نے پگھلے ہوئے سونے کے ان دریاؤں کا سراغ پا لیا اور اپنی مسلسل کوہ کنی سے انہیں کھینچ کر باہر لے آئے۔ اس سے حجاز کا نقشہ بدل گیا۔ خود ہمارے خطۂ زمین پاکستان میں فطرت نے ممکنات POTENTIALITIES کی ایک دنیا چھپا رکھی ہے۔ لیکن ہم چونکہ حاضر و موجود پر مطمئن ہیں اور میسرہ (جو کچھ محنت کے بغیر حاصل ہو جائے) پرشاکر و قانع' اس لئے روٹی تک کے لئے بھی دوسروں کے محتاج ہیں۔ یورپ کی بعض قوموں کے پاس چپہ چپہ بھر زمین ہے لیکن وہ اسی زمین سے اتنا کچھ پیدا کرتے ہیں کہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد دوسرے ملکوں کو بھی سامانِ زیست بھیجتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ فطرت کے مخفی خزانوں کو بے نقاب دیکھنے کے لئے مصروفِ سعی و عمل رہتے ہیں۔ ہم نے اس قانونِ خداوندی سے صدیوں سے اعراض برت رکھا ہے۔ اس لئے ہم پر ہماری معیشت تنگ ہو رہی ہے۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (۲۰/۱۲۴) یہ خدا کا کھلا ہوا فیصلہ ہے جو کسی کی خاطر بدل نہیں سکتا حتیٰ کہ مدتِ دراز سے اپنے سمع و بصر سے کام نہ لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری یہ صلاحیتیں ہی سلب ہو چکی ہیں۔ اور ہمارا شمار ان لوگوں میں ہو چکا ہے جن کے متعلق ارشاد ہے کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (۱۶/۱۰۸) یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب اور سمع و بصر پر مہریں لگ چکی ہیں۔ یہ لوگ ہماری آیات سے بالکل بے خبر ہیں۔

بعض کے نزدیک "لِقاءِ ربّ" سے مراد یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد اپنے اعمال کی جزا و سزا کے لئے خدا کے سامنے جائے گا۔ اگرچہ سیاق و سباق کے پیشِ نظر یہ مفہوم زیادہ موزوں نہیں۔ لیکن اگر اسے بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ قرآن کی رُو سے اس "لقاءِ ربّ" کے یقین کے لئے کائنات میں آیات اللہ کا مشاہدہ اور مطالعہ ضروری ہے۔

تم نے دیکھا سلیم! قرآن کس طرح مختلف انداز سے اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ

(۱) علم وہی ہے جس میں انسان اپنے حواس سے پورا پورا کام لے۔

(۲) حواس سے کام لینے سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اس محسوس کائنات کے اسرار و غوامض سے پردہ کشائی کرے۔ اشیائے فطرت کا وسیع مشاہدہ کرے۔ قوانینِ فطرت کا گہرا مطالعہ کرے اور مسلسل

تجربات اور پیہم تگ وتاز سے خدا کے نظام و قوانینِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھتا چلا جائے۔

(۳) قومِ مومنین کا یہی شعار ہے۔ گروہِ متقین کا یہی فریضہ ہے۔ یہی خدا کا ذکر ہے۔ اس فکر سے چھپی ہوئی حقیقتیں اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں اور انسان کائنات کی ایک ایک شے کے متعلق علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتا ہے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔

قرآنی صداقت کی شہادت

اتنا ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ خود قرآن کی صداقت کی شہادت بھی انہی کائناتی آیات سے ملتی ہے۔ سورۂ حٰم سجدہ میں ہے سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ ہم انہیں اپنی آیات عالمِ آفاق اور عالمِ انفس میں دکھائیں گے۔ تا آنکہ یہ بات ان کے سامنے اُبھر کر آجائے کہ قرآن فی الواقعہ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ یعنی زمانے کے پیچ وخم میں لپٹے ہوئے حقائق جوں جوں انسانی علم وکاوش کے ہاتھوں کھلتے جائیں گے۔ قرآن کے دعاوی کے ثبوت ایک ایک کر کے سامنے آتے جائیں گے۔ جوں جوں زمانہ مشاہداتِ فطرت اور علومِ سائنس میں آگے بڑھتا جائے گا قرآنی حقائق بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ اس آیت میں قرآن نے خارجی کائنات (آفاق) کے ساتھ خود انسانی دنیا (انفس) کو شامل کر کے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ سائنس کا تعلق صرف طبیعیات PHYSICS ہی سے نہیں بلکہ انسانی زندگی سے متعلق جس قدر علوم ہیں وہ بھی اس دائرے کے اندر آجاتے ہیں۔ لیکن ان علوم کے متعلق محض نظری بحثیں مطلوب نہیں بلکہ ان کی تحقیق بھی عملی مشاہدات اور تجارب کی رُو سے کی جائے گی۔ تاریخ عمرانیات SOCIOLOGY اور عملی سائیکالوجی کو اس باب میں خاص اہمیت حاصل ہوگی۔ طبیعی سائنس اور انسانی زندگی سے متعلق علوم کی رُو سے جوں جوں حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے، قرآن کی پیش کردہ صداقتوں کی دلیلیں سامنے آتی جائیں گی۔ یہ اس لئے کہ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ قرآن اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی راز مستور نہیں۔ اس کے سامنے کائنات کی ہر شے بے نقاب رکھی ہے۔ وہ ہر شے کا ہر وقت مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اور یہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ وہ ان اشیاء کے متعلق جو کچھ کہے گا ٹھیک ٹھیک کہے گا۔ اس کا بیان علم وحقیقت پر مبنی ہوگا، ظن وقیاس پر نہیں۔ اس لئے کہ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۵/۶) قرآن اس خدا کی طرف

سے نازل ہوا ہے جو کائنات کے تمام رموز و اسرار سے واقف ہے۔ لیکن جو لوگ کائنات کی ان آیات سے بے خبر رہتے ہیں انہیں درحقیقت لقاءِ رب کا یقین نہیں ہوتا۔ اَلَآ اِنَّھُمْ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّھِمْ۔ حالانکہ انہیں اس کے لئے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی شے کی بھی ریسرچ شروع کر دیں تو انہیں خدا کا قانونِ ربوبیّت جھلمل جھلمل کرتا نظر آئے۔ اس لئے کہ اَلَآ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (۵۴ - ۴۱/۵۳) خدا کا قانونِ ربوبیّت ہر شے کو محیط ہے۔ کسی ایک چیز کے ساتھ ہی وابستہ نہیں۔ اس لئے

چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

تمہیں یاد ہوگا سلیم! میں نے تم سے ایک دفعہ ایک بڑی عمدہ کتاب کا ذکر کیا تھا جس کا نام تھا THE GREAT DESIGN۔ اس کتاب کا پلان یہ تھا کہ دنیا کے مختلف علوم کے آئمۂ فکر و تحقیق کے پاس یہ سوال نامہ بھیجا گیا کہ آپ نے اپنے شعبۂ علم میں جس قدر تحقیق کی ہے کیا اس کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظامِ کائنات کسی خاص نظم و ضبط کے مطابق چل رہا ہے یا یونہی ھنگامی طور پر وجود میں آ گیا اور ہنگامی طور پر چلے جا رہا ہے؟ اس سوال کے جو جوابات ان بڑے بڑے سائنسدانوں کی طرف سے موصول ہوئے انہیں بلا تنقید و تبصرہ محوّلہ صدر کتاب میں یکجا جمع کر دیا گیا ہے۔ ان جوابات کا احاطہ کس قدر وسیع تھا اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ایک عالمِ نباتیات کے مقالہ کا عنوان تھا "ایک سبز پتّہ"، اور غالباً سر جیمز جینس نے "ستاروں کی گذرگاہوں" کے عنوان سے جواب لکھا تھا۔ ان میں سے ہر محقق اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ہمیں کائنات کے ذرّے ذرّے میں کسی علیم و حکیم قوّت کے مستحکم اور غیر متبدّل نظم و نسق کی کارفرمائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کائناتی نظم و ضبط کی یہی وہ کارفرمائیاں ہیں جن کے سامنے ان آئمۂ فکر و تحقیق کی نگۂ عقیدت قدم قدم پر جُھک جاتی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے سامنے قرآن نہیں اس لئے وہ اس ہستی کے متعلق صحیح صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے جو اس نظام کو بایں حسن و رعنائی چلا رہی ہے۔ بایں ہمہ، وہ اس کے نظامِ ربوبیّتِ کبریٰ کا مشاہدہ آنکھوں سے کر رہے ہیں (ان کے لئے اس مقام سے قرآن تک پہنچ جانا کچھ دشوار نہیں بشرطیکہ کوئی ان کے سامنے قرآن پیش کرنے والا ہو)۔

یہاں تک تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ قرآن کی رُو سے علم کی تعریف کیا ہے۔

علماء کون ہیں؟ اس کے بعد اس نکتہ کی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ قرآن کی رُو سے عالم کسے کہتے ہیں اور علماء سے مراد کون لوگ ہیں؟ لیکن قرآنِ کریم کا اعجاز دیکھو کہ اس نے اس حقیقت کو خود ہی واضح کر دیا ہے تاکہ اس باب میں کسی قسم کا شبہ یا ابہام نہ رہے. قرآن میں "علماء" کا لفظ صرف دو مقامات پر آیا ہے. ایک جگہ سورۃ شعراء میں (۲۶/۱۹۷) جہاں علمائے بنی اسرائیل کا ذکر ہے. اور دوسری جگہ سورۃ فاطر میں جہاں خدا کے بندوں میں سے علماء کا ذکر ہے. اس تذکرہ کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے. اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ۚ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں. وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ ۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۞ اور پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ و سفید طبقے ہیں جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں اور ان میں بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں. وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اور اسی طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کے بھی مختلف اقسام ہیں. تم نے دیکھا سلیم! ان آیات میں کن امور کا ذکر ہو رہا ہے؟ کائنات کے مختلف گوشوں کا. بساطِ فطرت کے متنوع شعبوں کا. سائنس کے مختلف علوم کا. طبیعیات PHYSICS. نباتیات BOTANY. طبقات الارض GEOLOGY حیوانیات ZOOLOGY اور انسانیات کے تمام شعبے اس کے اندر آجاتے ہیں. ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد ہے. اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت اور ہیبت چھا جاتی ہے. اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۞ (۳۵/۲۸-۲۷) کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے. اور کس طرح ایسے عظیم کارگہ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر آگے بڑھائے جا رہا ہے. تم نے غور کیا کہ قرآن نے علماء کا لفظ کن لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے؟ انہی کے لئے جنہیں ہم آج کی اصطلاح میں سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر کہتے ہیں. وہ لوگ جو کائناتی نظام کا مطالعہ کرتے اور مسلسل مشاہدات و تجربات کے بعد فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے ہیں. یہ حقیقت ہے کہ خدا نے فطرت کی تمام قوتیں ہمارے لئے مسخر کر رکھی ہیں (وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ)

لیکن ان قوتوں کو اپنے کنٹرول میں وہی لاسکتا ہے جو اِن قوانین سے واقف ہو جن کے مطابق یہ قوتیں کام کرتی ہیں، یہ قوانین، فطرت کے مشاہدہ اور مطالعہ اور پیہم تجربات سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ ان قوانین کا علم حاصل کرتے ہیں انہیں قرآن علماء کہہ کر پکارتا ہے۔

ہمارے علماء

علماء کی اس قرآنی تعریف DEFINITION کے بعد تم غور کرو سلیم! کہ ہمارے ہاں جو حضرات علماء کہلاتے ہیں انہیں علم الفطرت (سائنس کے علوم) سے کس قدر تعلق ہوتا ہے ؛ وہ علم الفطرت کے مبادیات تک سے واقف نہیں ہوتے۔ ان کا علم نظری مباحث اور لفظی کتر بیونت سے ایک قدم آگے نہیں جاتا۔ اور یہ نظری مباحث بھی ان مسائل سے متعلق جنہیں نہ کائنات سے کچھ تعلق ہوتا ہے نہ انسان کی عملی زندگی سے کچھ واسطہ۔ ہمارے مذہبی مدارس کا نصاب قریب دس سال پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس دس سال میں سے بیشتر عرصہ منطق، فلسفہ، معانی، بیان ادب، نحو وغیرہ کی تحصیل میں صرف ہو جاتا ہے۔ اور منطق و فلسفہ بھی وہ جو اب عہدِ پارینہ کی داستان بن چکا ہے۔ اس نصاب میں ہیئت، ہندسہ اور حساب کی بھی دو تین کتابیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں بھی وہ کچھ پڑھایا جاتا ہے جو زندگی میں کسی کام نہیں آتا۔ اور تو اور (تم حیران ہو گے کہ) ان کے نصاب میں قرآنِ کریم بھی داخل نہیں۔ تفسیر میں جلالین پڑھا دی جاتی ہے جس میں صرف قرآنی الفاظ کے مرادفات دیئے گئے ہیں۔ اور آخری سال سورۂ بقرۃ[1] کی تفسیر بیضاوی۔ بس یہ ہے ان کا نصاب جس کی تکمیل کے بعد انہیں عالم ہونے کی سند مل جاتی ہے۔ اشیائے فطرت کے متعلق ان حضرات کے علم کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ جب ہندوستان میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال شروع ہوا تو علمائے کرام سے اس کے جائز یا ناجائز ہونے کے متعلق فتوے مانگا گیا۔ اس فتوے کے جواب میں جمعیت العلماء کے صدر مفتی کفایت اللہ مرحوم نے لکھا تھا کہ،

> جس آلہ کے متعلق سوال کیا گیا ہے وہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ مگر سننے میں آیا ہے کہ وہ ایک ایسا آلہ ہے جسے خطیب یا قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور وہ اس کی طرف رُخ کئے ہوئے قرآت یا خطاب کرتا ہے۔ پس وہ آلہ آواز کو جذب کر کے

---

[1] اور اب تو صرف ابتدائی پانچ رکوع ہی داخلِ نصاب ہیں۔ (۱۹۸۴ء)۔

اتنی دُور نشر کرتا ہے کہ اس کے چوتھائی فاصلہ تک بھی بغیر اس کی مدد کے آواز پہنچانا مشکل ہے۔　　(بحوالہ نقیب ۱۰/۱۱/۴۱ء)

اس کے بعد مفتی صاحب نے اس کے جواز کا فتوےٰ دے دیا۔ لیکن دارالعلوم (دیوبند) کے ایک بہت بڑے مفتی (محمد شفیع) صاحب نے (جو اب پاکستان میں قیام فرما ہیں[1]) اس کے خلاف ان فتاویٰ کا مجموعہ شائع کیا جن میں "عباداتِ مقصودہ" کے لئے اس آلہ کو حرام قرار دیا گیا تھا۔ انہوں نے اس رسالہ میں (جس کا نام البدائع المفیدہ فی حکم الصنائع الجدیدہ تھا) لکھا تھا کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے اور وہ کس طرح کام کرتا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے الیگزینڈرا ہائی اسکول بھوپال کے سائنس ماسٹر برج نندلال صاحب سے دریافت فرمایا۔ انہوں نے کہا کہ

برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے۔ اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے۔

چنانچہ اس تحقیقِ انیق کے بعد مفتی صاحب نے عبادات کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو حرام قرار دے دیا۔ یعنی ماسٹر برج نندن صاحب کی بات کی بنیاد پر یہ فیصلہ فرمایا کہ خدا اور رسولؐ کا اس باب میں یہ حکم ہے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ اشیائے فطرت کی تحقیقات اور علومِ جدیدہ کے متعلق ان حضرات کی معلومات کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ ان چیزوں کے متعلق ان کی معلومات کا تو یہ عالم ہوتا ہے، لیکن یہ ان کے حرام و حلال ہونے کے متعلق فتوے ضرور صادر کرتے رہتے ہیں۔ اور اب پاکستان میں معاملہ فتویٰ کی حد سے بڑھ کر قانون سازی تک پہنچ گیا ہے۔ مثلاً اگر اب یہ معاملہ حکومت کے سامنے آجائے کہ خطبات کے لئے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال جائز ہے یا ناجائز۔ اور اس کے لئے کسی قانون کے وضع کرنے کی ضرورت ہو تو یہ قانون حضرات علمائے کرام مرتب کریں گے۔ یعنی یہ حضرات پہلے (کسی) ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت کریں گے کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ہوتا کیا ہے اور اس کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کی بنا پر اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ اس کا استعمال از روئے کتاب و سنت جائز ہے یا ناجائز اور یہ فیصلہ

---

[1] اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (طلوعِ اسلام ۱۹۸۲ء)۔
[2] اب یہی علمائے کرام لاؤڈ اسپیکر کو نماز اور خطبات میں بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔

مملکت کے قانون کی حیثیت سے ملک میں نافذ ہوگا۔ (چنانچہ یہی مفتی صاحب جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے، آئینِ پاکستان کی تدوین کے سلسلہ میں مجلسِ آئین ساز کے شرعی مشیروں کے زمرہ میں شامل رہے ہیں)۔ یہ حضرات سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے ہیں کہ اگر ہم نہ ہوں تو لوگوں کو شریعت کے مسائل کون بتائے؟ سو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلامی مملکت میں شریعت کے مسائل اس مملکت کے قوانین سے الگ نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان کے بتانے کے لئے کسی خاص گروہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ یہ کام حکومت کے اعمال کا ہوتا ہے نہ کہ مولویوں کے گروہ کا۔ جب رسول اللہؐ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں اسلامی مملکت قائم تھی تو اس وقت مولویوں کی کوئی جماعت نہ تھی۔ یہ سب بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں۔

باقی رہے ایسے معاشرتی احکام جو روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ مثلاً نکاح کیسے پڑھانا چاہیئے۔ جنازہ کی نماز کس طرح ہوتی ہے۔ تو ان امور کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ یہ ایسی باتیں نہیں جن کے لئے کسی دارالعلوم میں جانا پڑے۔ یہ ہمارے عام مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اور اگر نہیں پڑھائی جاتیں تو پڑھائی جانی چاہئیں۔ اس لئے جو لوگ علومِ سائنس کے ماہر ہوں گے وہ ان امور کو بھی جانتے ہوں گے۔ بہرحال اسلامی معاشرے میں اس قسم کی تمام باتیں عام مسلمانوں کو معلوم ہونی چاہئیں۔ لہٰذا ان کے لئے بھی کسی خاص گروہ کی ضرورت نہیں۔

ان تصریحات سے تم نے دیکھ لیا ہوگا سلیم! کہ قرآنِ کریم کی رُو سے مومنین، متقین، خدا کا ذکر کرنے والے، "لقاءِ رب" کی آرزو اور یقین رکھنے والے وہی ہیں جو کائناتی نظام پر غور و فکر، اشیائے فطرت کی تحقیقات (ریسرچ) کے لئے عملی جدّ وجہد کرتے ہیں۔ اسی کا نام قرآن کی رُو سے علم ہے، اور اسی علم کے حاملین کو وہ علماء قرار دیتا ہے۔

ایک شُبہ کا ازالہ

اس مقام پر تمہارے دل میں یقیناً یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس بناء پر تو یورپ کی قومیں صحیح معنوں میں مومن و متقی ہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ جماعتِ مومنین اور گروہِ متقین کے لئے علم الفطرت کی تحصیل نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ جتنا غلط ہے کہ ہر وہ قوم جو علم الفطرت حاصل کرلے، مومن اور متقی ہو جاتی ہے۔ یہ فرق اہم ہونے کے ساتھ ذرا باریک بھی ہے۔ اس لئے اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مومن و متقی وہ ہیں جو تسخیرِ فطرت کے بعد،

فطرت کی قوتوں کو ان قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتے ہیں جو قرآن میں درج ہیں۔ مومن اور متقی ہونے کے لئے یہ دونوں شرطیں ناگزیر ہیں۔ یعنی (۱) تسخیرِ فطرت اور (۲) اس کے ماحصل کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ اگر کسی قوم میں ان دو شرطوں میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو وہ قوم مومن اور متقی نہیں ہو سکتی۔ قرآن اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (۲/۲۰۸) کا حکم دیتا ہے یعنی قرآن کے پورے کے پورے نظام کو اپنے اوپر وارد کرنے کا حکم۔ ہم صحیح معنوں میں مومن اور متقی نہیں۔ کیونکہ ہم میں شرطِ اوّل (تسخیرِ فطرت) کی کمی ہے (اور جب ہم شرطِ اوّل (تسخیرِ فطرت) ہی پوری نہیں کرتے تو شرطِ دوم (قوائے فطرت کا قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اقوامِ مغرب مومن اور متقی نہیں کیونکہ ان میں شرطِ دوم کی کمی ہے۔ لیکن وہ قومیں اس اعتبار سے ہم سے آگے ہیں کہ انہوں نے تسخیرِ فطرت سے اپنی طبعی زندگی کو خوشگوار بنا لیا ہے اور ہم روٹی تک کے لئے ان کے محتاج ہیں۔

قوائے فطرت کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے لئے قرآن کے علم کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ قوانینِ خداوندی قرآن کے اندر ہیں۔ یہی وہ الراسخون فی العلم (۳/۶) ہیں جو قرآن پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں۔ اور تمام امور کے فیصلے اسی کے مطابق کرتے ہیں کہ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ مومن نہیں، کافر ہیں۔ اس کفر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ دولت اور رزق کی فراوانی کے باوجود جہنم بن جاتا ہے (جیسا کہ اس وقت یورپ کا حال ہو رہا ہے)۔ وہ لوگ سائنس کا اس قدر وسیع علم رکھنے کے باوجود انسانی زندگی کے معاملات کا صحیح حل دریافت نہیں کر پاتے۔ یعنی اس باب میں ان کا سمع و بصر و فواد انہیں کچھ کام نہیں دے رہا۔ قرآن کریم نے ایسی ہی قوموں کے متعلق کہا ہے کہ وَلَقَدْ مَکَّنّٰھُمْ فِیْمَآ اِنْ مَّکَّنّٰکُمْ فِیْہِ وَجَعَلْنَا لَھُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَۃً ۔ ہم نے ان قوموں کو دنیا میں اس قدر تمکن عطا کیا تھا کہ تمہیں بھی ایسا تمکن نہیں عطا کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں سمع و بصر و فواد بھی عطا کیا تھا۔ لیکن فَمَآ اَغْنٰی عَنْھُمْ سَمْعُھُمْ وَلَآ اَبْصَارُھُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُھُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ کَانُوْا یَجْحَدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ (۴۶/۲۶) لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی کی صداقت سے انکار کیا جو رسولوں کی وساطت سے انہیں ملے تھے تو ان کے سمع و بصر و فواد انہیں تباہی سے

نہ بچا سکے۔ یہ تمام علم ان کے کسی کام نہ آسکا۔ اگر یہ لوگ کائنات کی قوتوں اور فطرت کی بخششوں کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کریں تو وہ جہنم جس میں دنیا اس وقت مبتلا ہے اس جنت میں تبدیل ہو جائے جس کی تلاش میں انسانیت ماری ماری پھر رہی ہے۔ دیکھو سلیم! اس حقیقت کو قرآن کیسے حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ تم سورۂ یونس کی ان آیات کو پھر اپنے سامنے لاؤ جن میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ کائنات میں غور و فکر سے خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب نہیں دیکھنا چاہتے اور جو کچھ انہیں یونہی میسر آجاتا ہے اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ (۱۰/۸) یہ لوگ جہنم میں رہتے ہیں۔ اس کے بعد ہے إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جو لوگ ان کے برعکس آیاتِ خداوندی پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں يَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِإِيمَانِهِمْ ان کا نشوونما دینے والا ان کے اس ایمان کی بنا پر زندگی کے صحیح نقشوں کی طرف ان کی راہنمائی کر دیتا ہے۔ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خوشگواریوں کے ان باغات میں رہتے ہیں جن کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔ دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ اس جنتی معاشرہ کو دیکھ کر ان کے لب پر بے ساختہ یہ پکار آجاتی کہ بارِ الٰہا! فی الواقعہ یہ بات تجھ سے بہت بعید تھی کہ تو اس کائنات کو باطل پیدا کر دیتا۔ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ اور اس معاشرہ میں ان کی ایک دوسرے کے متعلق آرزوئیں بڑی ہی حیات بخش اور سلامتی افروز ہوتی ہیں۔ جو لوگ اس معاشرہ کو قائم کریں گے وہ مسلسل جدوجہد اور پیہم سعی و عمل سے اس کی حدود کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں گے۔ تاآنکہ آخرالامر یہ تمام نوعِ انسانی کو محیط ہو جائے گا۔ اور ہر دیکھنے والا پکار اٹھے گا کہ خدا کا یہ نظامِ ربوبیت کس طرح ہر قسم کی حمد و ستائش کا سزاوار ہے۔ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱۰-۹/۱۰) یہ نتیجہ ہوتا ہے فطرت کی نعمتوں کو خدا کے قانون کے مطابق صرف اور تقسیم کرنے کا۔

حرفِ آخر

ان تصریحات سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی سلیم! کہ اگر ہم اپنے معاشرہ کو قرآنی خطوط پر متشکل کرنا چاہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم اس قسم کے ریسرچ سکالرز اور سائنسدان پیدا کریں جو انفس و آفاق کے ہر شعبے میں قوانینِ فطرت کے مشاہدات و تجربات سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے جائیں اور اس کے ساتھ وہ قوانین

خداوندی جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں اس طرح عام کئے جائیں کہ فطرت کی ان قوتوں کو ان قوانین کے مطابق تقسیم اور استعمال کرنے میں کوئی دقّت نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن کی رُو سے علماء کہا جائے گا۔ جب تک "علم اور علماء" کے متعلق ہمارا موجودہ تصوّر نہیں بدلتا' خدا تک پہنچنا تو ایک طرف' ہم زندہ قوموں کے زمرے میں بھی شامل نہیں ہو سکتے۔ وَفِیۡهَا اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ۔

والسّلام
پرویز

ستمبر ۱۹۵۶ء

اکتیسواں خط

تصوّف

سلیم میاں! میں مسلسل تین ماہ تک کوشش کرتا رہا کہ تم اپنے اس سوال کے جواب کے لئے اصرار نہ کرو، لیکن میں جس قدر انکار کرتا رہا اسی قدر تمہارا اصرار بڑھتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ تم پہلے اسلام (یعنی مسلمانوں) کی تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ کر لو اور پھر ان مسائل کے پیچھے نکلو۔ اُس وقت یہ باتیں تمہاری سمجھ میں زیادہ آسانی سے آسکتی تھیں۔ مگر تمہاری ضد کا کیا علاج! لیکن اس میں بھی، میں محسوس کرتا ہوں کہ زیادہ قصور خود میرا ہی ہے۔ اس لئے میں ہارا، تم جیتے۔ لو اب غور سے سنو۔

تمہارے سوال کا جواب تو میں ایک فقرے میں دے سکتا تھا اور وہ بھی اپنے الفاظ میں نہیں بلکہ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں، جو انہوں نے ۱۹۱۷ء میں سیّد سلیمان ندوی مرحوم کے نام اپنے ایک خط میں لکھے تھے کہ

> اس میں ذرا شک نہیں کہ تصوّف کا وجود ہی سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔

لیکن اس سے تمہارا اطمینان نہیں ہوگا، اس لئے ذرا تفصیل سے لکھتا ہوں۔

اگرچہ تصوّف MYSTICISM قریب قریب دنیا کی ہر قوم میں موجود ہے اور آج سے نہیں، بلکہ تاریخ کے اوّلیں اوراق سے اس کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود (مذہب یعنی RELIGION کی طرح) اس کی بھی کوئی جامع اور مانع تعریف PRECISE DFINITION آج تک نہیں ہو سکی۔ اس کا دائرہ بہت سے تجارب و کیفیات، احوال و مقامات اور شعائر و مناسک کو

محیط ہے. لیکن ان میں دو بنیادی عناصر ایسے ہیں جو تصوّف کی اصل سمجھے جاتے ہیں. یعنی (۱) انسان کا خدا کے ساتھ براہِ راست مکالمہ اور (۲) نفسِ انسانی کا حقیقتِ مطلقہ (یعنی خدا) کے ساتھ مل جانا، جسے وصال یا فنا کہتے ہیں. یہ تمام کیفیات ہر فرد کی ذاتی (یعنی انفرادی) ہوتی ہیں جن میں کوئی دوسرا فرد شریک نہیں ہوتا، نہ وہ فرد ان کیفیات کو کسی دوسرے کو محسوس کرا سکتا ہے. اس اعتبار سے تصوّف، بہ حیثیت ایک مذہب کے، یکسر شخصی یا ذاتی PERSONAL RELIGION ہوتا ہے اور یہ تجارب EXPERIENCES اس کائنات کے حسّی یا مشاہداتی علم کے بغیر ایک ایسے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں جو بالکل نگاہوں سے مستور اور حواس سے پوشیدہ رہتا ہے. اس کو باطنی ذریعۂ علم کہتے ہیں. اس علم کے حصول کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ نفسِ انسانی جب باطن کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے تو وہاں یہ اس حقیقتِ کلّی میں جذب ہو جاتا ہے جو کائنات کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے. اور اس طرح نفسِ انسانی اور حقیقت، REALITY ایک ہو جاتے ہیں. اور وہ بغیر کسی ذریعہ یا واسطہ کے تمام حقائق کا براہِ راست مشاہدہ کر لیتا ہے. مشاہدہ کیا، وہ خود ہی حقیقت بن چکا ہوتا ہے. چونکہ حقیقتِ مطلقہ تمام مادی اور محسوس نسبتوں سے بلند اور منزّہ ہے. اس لئے نفسِ انسانی اس کے ساتھ اسی صورت میں پیوست (بلکہ اس کے اندر ضم) ہو سکتا ہے جب یہ خود تمام محسوس اور مادی علائق سے بلند اور پاک ہو جائے. اس کے لئے نہ صرف دنیوی حظائظ و لذّات سے ترکِ تعلّق ضروری ہے بلکہ اپنے قلب و دماغ کو بھی اس مقام پر لے جانا ہوتا ہے جہاں اس محسوس دنیا کے نقوش اور خیالات کا کوئی گذر نہ ہو. یعنی مادی دنیا کی آلائش تو ایک طرف، محسوس اشیاء کے تصوّرات اور خیالات تک بھی دماغ میں نہ آنے پائیں. تصوّف کی اصطلاح میں اس کیفیت کو "مکمّل تاریکی" COMPLETED DARKNESS سے تعبیر کیا جاتا ہے. یہ لوگ دنیائے محسوسات سے اس قدر دُور چلے جاتے ہیں کہ ان کے عقیدہ کی رُو سے وحی کے الفاظ بھی محسوسات میں داخل سمجھے جاتے ہیں. اس لئے وہ انہیں چھوڑ کر، وحی کا صحیح مفہوم اس باطنی دنیا سے متعیّن کرتے ہیں جس کا علم انہیں براہِ راست حاصل ہوتا ہے. اسے وہ حقیقت کا باطنی علم یا خود "حقیقت" کہتے ہیں. چونکہ اس طریق سے حاصل کردہ علم کو بلاواسطہ علم DIRECT KNOWLEDGE کہتے ہیں اس لئے وہ اسے یکسر حتمی اور یقینی قرار دیتے ہیں. اور اس کے مقابلہ میں محسوسات کے ذریعہ سے حاصل کردہ علم کو ظنّی اور غیر یقینی ٹھہراتے ہیں. اسی بناء پر وہ اپنے علم کو دیگر

تمام علوم کے مقابلہ میں افضل اور اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ یہ مقام انہیں مختلف جانکاہ مشقتوں اور جگر سوز ریاضتوں سے حاصل ہوتا ہے جن میں بعض اوقات جان تک کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔

یہ ہیں سلیم! مختصر الفاظ میں تصوّف کے مبادیات، اور لزوم و خصائص۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا میں چار بڑے بڑے مذاہب تھے۔ یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور بُدھ مت۔ آخر الذکر دونوں مذاہب (مجوسیت اور بدھ مت) میں وحی کا کوئی امتیازی اور خصوصی تصور نہیں تھا۔ اس لئے یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے ہاں ایک نبی کی وحی اور اربابِ تصوّف کے کشف و الہام میں فرق کیا جاتا تھا یا نہیں۔ لیکن یہودیت اور نصرانیت میں یہ فرق ضرور تھا، اگرچہ بہت مبہم طور پر تھا۔ یہودی، حضرت موسیٰ (علیہ السّلام) کو جس انداز کا نبی مانتے تھے، اس انداز کا نبی یرمیاہ، دانیال، یسعیاہ، حزقیل وغیرہ کو نہیں مانتے تھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ انہیں بھی نبی PROPHETS ہی کہتے تھے۔ اس لئے کہ ان کے ہاں نبی کے معنی ہی تھے پیش گوئیاں کرنے والا (اسی لئے اس کا ترجمہ PROPHET کیا جاتا ہے)۔ اس لئے بادی النظر میں یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان کے ہاں ایک رسول کی وحی اور ایک ولی کے الہام میں فرق کیا جاتا تھا یا نہیں۔ عیسائی اپنی انجیل کے مرتبین (لوقا۔ مرقس وغیرہ) کو سینٹ (ولی) کہتے ہیں اور انہیں حضرت عیسیٰؑ کا ہم مرتبہ نہیں مانتے۔ (یہ غالباً اس لئے کہ ان کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کا مقام خدائی مقام ہے۔ جس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا)۔ ان کے بعد بھی ان کے ہاں اولیاء SAINTS ہی کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ عیسائیوں کے ہاں رسولؑ کی وحی اور اولیاء کے کشف و الہام میں فرق ہے۔ لیکن (جیسا کہ میں ذرا آگے چل کر بتاؤں گا) وحی اور الہام کا فرق (خواہ وہ عیسائیوں کے ہاں ہو یا مسلمانوں کے ہاں) صرف اصطلاحی فرق ہے۔ نوعیت دونوں کی ایک ہی ہے۔ مسلمانوں کو یہ فرق زیادہ شدّت سے کیوں کرنا پڑا، اس کے متعلق بھی بعد میں لکھا جائے گا۔

یہودیت ظواہر پرستی کا مذہب ہے اس لئے اس میں باطنیت کی گنجائش بہت کم تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد، بابل کی اسیری کے زمانہ میں، جب یہ قوم اپنے ضعف و انحطاط کی انتہا تک پہنچ چکی تھی (اور یہی زمانہ تصوّف کے ابھرنے کا ہوتا ہے) ان میں بھی کچھ کچھ باطنیت کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ چنانچہ اس دَور میں ان کے "نبیوں" PROPHETS

کے احوال وظروف کچھ اس قسم کے ہیں جیسے باطنی خلوت گاہوں میں اربابِ تصوّف کے ہوتے ہیں. اسی قسم کا اسلوبِ زندگی، وہی اندازِ گفتگو، اسی طرح کے مکاشفات اور الہامات، اُسی نوع کی پیشگوئیاں۔
لیکن حقیقی تصوّف ان میں اس کے بعد جاکر آیا جب ان کے مذہبی پیشواؤں نے اسکندریہ میں یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور وہاں اس فلسفہ اور اپنے معتقدات کے امتزاج سے ایک نیا مذہب ایجاد کیا. فیلو PHILO اس مذہب کا امام ہے. تصوّف کا ابوالاباء درحقیقت افلاطون PLATO کو سمجھنا چاہیئے. اس نے سب سے پہلے یہ تصوّر پیش کیا تھا کہ اس عالمِ محسوس کے اوپر ایک عالمِ امثال ہے. وہ عالم حقیقی وجود رکھتا ہے اور یہ عالم اس کا محض پرتو ہے. اس عالم میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کی حقیقت سراب سے زیادہ کچھ نہیں. اس حقیقی عالم کے متعلق علم، حواس کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتا. باطنی طریق سے حاصل ہوسکتا ہے. افلاطون کے اس فلسفہ (یا بالفاظِ صحیح، تصوّف) کی نشاۃِ ثانیہ بعد کے فلاسفروں کی ایک جماعت، کے ہاتھوں ہوئی جن کا امام فلاطینس PLOTINUS تھا. ان فلاسفرز میں سے ایک APOLLONIUS OF TYANA نے ہندوستان کا سفر کیا اور وہاں کے براہمنوں سے ہندی تصوّف سیکھا. فلاطینس، رومی لشکر کے ساتھ ایران گیا اور وہاں کے مغوں سے مجوسی تصوّف کی تعلیم حاصل کی. اس کے بعد ان فلاسفروں نے فلاطینس کی زیرِسرکردگی افلاطون کے فلسفۂ قدیم کو، ان ہندی اور ایرانی تصوّرات کے ساتھ ملاکر ایک جدید قالب میں ڈھالا. اس کا نام نو فلاطونی فلسفہ یا NEW PLATONISM ہے. اس فلسفہ کا مرکز اسکندریہ تھا اور یہیں اس سے فیلو کا یہودی تصوّف متاثر ہوا. اس تصوّف کا سب سے پہلا اثر یہ تھا کہ تورات کی شریعت، معرفت اور حقیقت میں بدل گئی. چنانچہ یہودی تصوّف کی سب سے اہم کتاب زہار میں ہے کہ:۔

> تورات کی رُوح درحقیقت اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے۔ انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ تورات کے ان باطنی معانی کا راز پاجائے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے لگ جائے۔

تورات کی شریعت، ہر بنی اسرائیل کے لئے کھلی تھی لیکن تورات کے باطنی معانی صرف خواص تک محدود ہوکر رہ گئے. چنانچہ مشناہ (کتابِ "حقیقت") میں لکھا ہے کہ:۔

> کتابِ پیدائش کے باطنی معانی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو

نہیں دی جانی چاہیئے۔ اس کی سخت ممانعت ہے اور کتاب حزقیل کے پہلے باب کی تعلیم تو کسی کو بھی نہیں دینی چاہیئے تا وقتیکہ اس نے مقامِ ولایت حاصل نہ کر لیا ہو۔

ان کا عقیدہ یہ تھا کہ تورات کے اصل معانی اس کے الفاظ سے نہیں مل سکتے۔ ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ایک اور طریقہ ہے جو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ عبرانی زبان کے حروفِ ابجد میں عجیب و غریب تاثیر ہے اور انہیں خاص خاص طریقوں سے اکٹھے کرنے اور دہرانے سے تورات کے الفاظ کے باطنی معانی معلوم ہو جاتے ہیں۔ نیز ایک سے دس تک کے عدد بھی یہی خواص و تاثیرات رکھتے ہیں۔ ان حروف اور اعداد کے متعلق کتابِ زہار میں ہے کہ :۔

> خدا نے ان کے نقوش تیار کئے۔ پھر ان کے سانچے بنائے۔ ان کا وزن کیا۔ ان میں ادل بدل کیا۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملایا۔ اور ان کے پُراسرار مجموعوں سے کائنات کی ہر شے کی رُوح پیدا کی۔ چنانچہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ بھی انہی کی قوت کے سہارے قائم ہے ——————— اور جو کچھ پیدا ہوگا وہ بھی انہی کے ذریعے پیدا ہوگا۔

ان حروف اور اعداد کا باطنی علم، علمِ حقیقی ہے اور اس سے انسان پر اسرار و رموزِ کائنات اور تورات کے حقیقی مفہوم کی راہیں کھلتی ہیں۔ اس سے عجیب و غریب کرامات صادر ہونے لگ جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں ان کے "ربانی صوفیوں" RABBINIC MYSTICS کی شعبدہ بازیوں کے عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ سبت کی شام کو رموزِ کائنات کے حل کرنے میں مصروف ہوتے، بھوک لگتی تو ایک تین سالہ بچھڑا نمودار ہو جاتا جسے وہ کھا جاتے۔ وقس علیٰ ہذا۔ ان کے یہ اربابِ تصوف اپنے ہاں کی الہامی کتابوں کی تاویلات اپنے ذاتی مکاشفات سے کرتے اور خوابوں کی تعبیر سے زندگی کے مسائل کا حل بتاتے اور آنے والے واقعات کی خبریں دیتے۔ جب عیسائیت کا ظہور ہوا تو یہ تصوف یہودیوں میں عام تھا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ) کی تعلیم (خدا کے ہر سچے نبی کی تعلیم کی طرح) ان خرافات کے خلاف صدائے احتجاج تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہودی پیشوائیت ان کی جان تک کی دشمن ہو گئی۔ لیکن ان کی تشریف براری کے بعد خود عیسائیت یہی کچھ بن کر رہ گئی۔ ایک تو اس لئے کہ جو لوگ عیسائی ہوئے تھے وہ پہلے یہودی ہی تھے۔ اور دوسرے اس لئے کہ عیسائیت اپنے ابتدائی دَور ہی میں سخت نامساعد حالات کا شکار ہو گئی۔ اس لئے اسے

بہت جلد، مجاہدانہ سعی و عمل کو چھوڑ کر تصوّف کی فرار گاہ میں پناہ لینی پڑی۔ بہرحال اب ہم عیسائیت کے تصوّف کی طرف آتے ہیں۔

سلیم! غور سے سُن رہے ہو یا موضوع کو خشک سمجھ کر جمائیاں لینے لگ گئے ہو؟ لیکن موضوع خشک ہے یا تر۔ اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست! اس لئے خود کردہ را علاجے نیست۔ اب تو آخر تک بات سننی ہی پڑے گی۔

عیسائیت میں پہنچ کر تصوّف نے ایک منظم مسلک ORGANISED SYSTEM کی شکل اختیار کر لی۔ اب باقاعدہ خانقاہیں قائم ہوگئیں۔ ان کے قواعد و ضوابط وضع ہوئے۔ ان میں داخلہ کی شرائط مقرّر ہوئیں۔ ان کے اندر زندگی بسر کرنے کے طور طریق متعیّن ہوئے جن پر نہایت سختی سے پابندی لازمی ٹھہرائی گئی۔ اس "روحانی ترقی" کے لئے مختلف قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کے زینے تجویز ہوئے۔ جگہ جگہ مختلف اولیاء SAINTS نے اپنے حلقے اور مرکز قائم کئے اور اس طرح پورا مذہب تصوّف کی آماجگاہ بن گیا۔ اب ہر مقام پر اس قسم کے الفاظ دہرائے جانے لگے کہ:۔

> اگر تم حواس کے دروازے بند کر کے دل کی آنکھیں کھولو۔ اگر تم جسمانی لذائذ سے مُنہ موڑ کر روحانی کیفیات کا پیچھا کرو تو تم خدا کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لو گے۔ جب آدم اور حوا کی جسمانی آنکھیں کھلی ہیں تو ان کی روحانی آنکھیں بند ہوگئی تھیں لیکن اس کے بعد یسوع مسیح آیا کہ جن کی آنکھیں بند ہیں وہ دیکھنے لگ جائیں اور جو دیکھ رہے ہیں ان کی آنکھیں بند ہو جائیں۔ پس یاد رکھو! حواس کی آنکھیں بند اور دل کی آنکھیں کھولنے ہی سے خدا اور اس کا اکلوتا بیٹا بے نقاب ہو کر سامنے آسکے گا۔
>
> ST. ORIGEN

اس مقصد کے لئے ترکِ دنیا، ترکِ علائق، ترکِ خیالات، ترکِ آرزو، غرضیکہ "روحانیت" کے سوا ہر شے کا ترک ضروری قرار پایا اور حقیقی زندگی اسے سمجھا گیا جس میں انسان ہر وقت ــــــ گوش بند و چشم بند و لب بہ بند ــــــ کی حالت میں مراقبہ میں بیٹھا، رموز و اسرار کائنات کے جلوے دیکھتا رہے۔

وہ عالمِ غیب، وہ دنیائے نور، وہ بلند سے بلند تر مقام جہاں سادہ، غیر تبدل اور

مطلق حقیقتیں باطنیت کی سمر خامشیوں کی نورانی قباؤں میں لپٹی ہوئی ہیں۔ ان کے جلوے دیدۂ ظاہر بیں سے نہیں دیکھے جاسکتے۔ انہیں دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے حواس کو بھی پیچھے چھوڑو اور عقل و خرد اور شعور و ادراک کو بھی۔ یعنی ہر اس چیز کو جو عقل و حواس کے ذریعے سمجھ میں آسکتی ہے خواہ وہ موجود ہے یا غیر موجود۔ سب کو چھوڑ دو اور اپنے آپ کو اس میں جذب کرنے کی کوشش کرو جو ان تمام حدود و قیود سے ماورا ہے۔ یاد رکھو! اگر تم میں ان نسبتوں میں سے کوئی نسبت بھی باقی رہی جن سے وہ ماورا ہے تو تم اس تک نہیں پہنچ سکو گے۔ اس کے نور کی شعاع کامل تاریکی میں نظر آیا کرتی ہے۔ کامل تاریکی میں۔ DONVISUS

اس کے لئے:۔

ترکِ دنیا۔ مرشد کی اطاعت، خاموشی اور انکساری اوّلین شرائط ہیں۔

ST. BENEDICT

ان طریقوں سے ایک تارک الدنیا زاہد کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ:۔

اسے ایک نور کی چادر اڑھا دی جاتی ہے۔ اس کے دل سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے جو اور زیادہ گہری اور تیز روشنی کی طرف اس کی راہنمائی کرتی ہے۔ تاآنکہ وہ دریائے نور میں غرق ہو جاتا ہے۔ اب اسے اپنے آپ پر بھی کوئی اختیار نہیں رہتا۔ وہ دنیاداروں کی نگاہوں میں پاگل اور وحشی سا نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ تکمیلِ نفس کی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے اور تمام اسرار و رموز کے پردے اس کی آنکھوں سے اٹھتے جاتے ہیں۔ اور آخر الامر وہ خود حقیقتِ مطلق میں جذب ہو جاتا ہے۔

ST. MACARIUS

خدا اور انسانی روح کے اس تعلق کو ORIGEN "عروسی تعلق" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے دوسرے ولی SAINTS بھی اسے "آسمانی دلہن" HEAVENLY SPOUSE کہہ کر پکارتے ہیں۔ (اس اصطلاح کو ذرا اچھی طرح ذہن نشین کرلینا۔ اس لئے کہ یہی وہ تصور ہے جو آپ کے ہاں "عرس" کے رنگ میں رائج اور فقیری "دلہنوں" کی صورت میں جلوہ بار ہے!) چونکہ اس

طرح زہد و انزوا کی زندگی بسر کرنے والے لوگوں کی نگاہوں میں بیحد مقبول اور واجب التعظیم قرار پاتے تھے۔ اس لئے رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ لوگ فوج در فوج اس مسلک کی طرف بڑھنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ چوتھی صدی عیسوی میں حالت یہ ہوگئی تھی کہ بستیاں خالی ہو رہی تھیں اور خانقاہیں آباد۔ شام اور فلسطین کے علاقے خاص طور پر اس مشربِ خانقاہیت کے مراکز تھے۔

یہ تھے اس وقت کے حالات جب اسلام کا ظہور ہوا۔ میں نے سلیم! قصداً ایران اور ہندوستان کے تصوّف کا تذکرہ اس مقام پر نہیں چھیڑا۔ اس لئے کہ اس وقت عرب اور اس کے گرد و پیش یہودی اور نصرانی ہی پھیلے ہوئے تھے۔ ہند و ایران کے ساتھ ان کے روابط و علائق براہِ راست نہیں تھے۔ یوں بھی یہودی اور نصرانی تصوّف، ایران کے مجوسی (مانوی) تصوّف اور ہندوستان کے بودھی تصوّرِ فنا اور وحدتِ وجود کو اپنے آغوش میں لے چکے تھے۔ ہندی تصوّف (ویدانت) کا سب سے بڑا پرچارک (مبلّغ) شنکراچاریہ ہے۔ اس کے نزدیک اصل علم آتما تم ودِ ہی یا معرفتِ نفس ہے۔ وہ رُوح کو ازلی اور غیر فانی مانتا ہے اور خارجی کائنات کو فانی۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ برہما ادراک سے بالاتر ہے اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کا ذریعہ وجدان ہے۔ کائنات اور اس کی تمام اشیاء سراب (مایا) ہیں۔ "میں" بھی مایا ہے۔ ترکِ خواہشات کے ذریعے انسان مایا کے فریب سے نکل سکتا ہے۔

شنکراچاریہ کے بعد اس مذہب (ویدانت) کا مبلّغ پتنجلی ہے جو وحدتِ وجود کا قائل ہے۔ اہم برہم اسمی (میں ہی برہما ہوں) اس کا مشہور مقولہ ہے۔

○

اب ہم اسلام کی طرف آتے ہیں۔ اس لئے اب جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھو تاکہ تمہاری یہ الجھن ہمیشہ کے لئے دُور ہو جائے اور اس کانٹے کی چبھن تمہیں پھر نہ ستائے۔ یہودیت یا نصرانیت کے مقابلے میں اسلام کے متعلق صحیح بات تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہے۔ اس لئے کہ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ حضرت موسیٰ (علیہ) اور حضرت عیسیٰ (علیہ) نے اپنے پیغام کو لوگوں کے سامنے کن الفاظ میں پیش کیا تھا۔ لیکن رسول اللہؐ نے خدا کے پیغام کو جن الفاظ میں دنیا تک پہنچایا تھا اس کا ایک ایک حرف قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ لہٰذا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ زیرِ نظر موضوع کے متعلق قرآن کی تعلیم کیا ہے۔

قرآن نے سلیم! یہ کہا ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل و فکر دی ہے، اور اسے بار بار تاکید کی ہے کہ وہ کائنات کے نظام پر غور کرے۔ ان قوانین کا علم حاصل کرے جن کی رُو سے یہ اتنا عظیم الشان اور محیّر العقول کارخانہ اس حسن و نظم سے چل رہا ہے۔ اس طرح وہ کائناتی قوتوں کا راز پالے گا جو اس کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہیں۔ اور جب ان کا راز پالے گا (یعنی یہ معلوم کرلے گا کہ وہ کس طرح کام کرتی ہیں اور کیا کیا کام کرتی ہیں) تو ان سے بے شمار فوائد حاصل کرسکے گا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ اشیائے کائنات سے جو مفاد حاصل ہوتے ہیں انہیں کس طرح صحیح مصرف میں لایا جائے۔ یہ وہ سوال ہے جسے تنہا انسانی عقل حل نہیں کرسکتی۔ ان کا استعمال ان مستقل اقدار کے مطابق کرنا ہوگا جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لئے متعین کیا ہے۔ ان کا علم اسے وحی کے ذریعے مل سکے گا۔ وحی کو انسان اپنی محنت اور کسب و ہنر سے حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے۔ یعنی انسان از خود انکشافِ حقیقت نہیں کرسکتا۔ حقیقت اپنے آپ کو خود انسان پر منکشف REVEAL کرتی ہے۔

لیکن یہ انکشافِ حقیقت (وحی) ہر انسان پر نہیں ہوتا۔ یہ انکشاف خاص خاص انسانوں پر ہوتا ہے جنہیں نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ وہ انسان، اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ آخری انسان تھے جنہیں خدا کی طرف سے وحی ملی۔ یہ وحی قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ بات یہ ہوئی کہ رسول اللہ کے بعد، انسانوں کے پاس علم کے ذرائع صرف دو ہی رہ گئے۔

۱۔ خدا کی وہ راہنمائی جو قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اور

۲۔ انسانی عقل۔

ان کے علاوہ کوئی تیسرا ذریعۂ علم نہیں جس کا ذکر قرآن میں ہو۔ اس میں کشف، الہام، باطنیت "اندرونی روشنی" وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔ اس میں صوفی یا تصوّف کا لفظ تک نہیں آیا۔ اس میں اولیاء کے کسی گروہ کا الگ تذکرہ نہیں۔ وہ جماعت مومنین ہی کو اولیاء اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔ اس میں انسانی روح کے خدا کے اندر جذب ہوجانے کا کوئی ذکر نہیں۔ اس میں فانی فی اللہ اور باقی باللہ کی اصطلاحات کا کوئی گذر نہیں۔ باقی رہا قرآن سو

اس کے متعلق اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ عربی زبان کی ایک کتاب ہے. اس کی زبان بڑی صاف، واضح اور روشن ہے. اس میں کسی قسم کا کوئی الجھاؤ نہیں. کوئی پیچ نہیں، خم نہیں، ابہام نہیں، کوئی تہ دار بات نہیں. اس پر غور و فکر کرنے سے اس کے معانی آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں. اس میں زیادہ تر محسوس امور ہی سے بحث کی گئی ہے لیکن جہاں کہیں مجرّد حقائق ABSTRACT TRUTHS کا ذکر آیا ہے تو (جیسا کہ ایک بلند پایہ کتاب کا انداز ہوتا ہے) انہیں محسوس تشبیہات میں بیان کر دیا گیا ہے. (انہی کو متشابہات کہتے ہیں). ان میں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان تشبیہات سے کیا بات سمجھانی مقصود ہے. اور یہ چیز علم کی پختگی سے حاصل ہو سکتی ہے. قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس کے الفاظ کا کوئی باطنی مفہوم ہے جسے صرف خاص خاص لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں. وہ تمام نوعِ انسانی کے لئے راہ نمائی کا ضابطہ ہے اس لئے اس کے مطالب تمام نوعِ انسانی کے سامنے یکساں طور پر کھلے ہیں. اس میں نہ زمان کی قید ہے، نہ مکان کی. وہ خود روشن (نور) ہے اور جو بھی اس سے راہنمائی حاصل کرنا چاہے اسے روشنی عطا کر دیتا ہے. یہ ہے قرآن کی پوزیشن.

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے، اسے سلیم! سامنے رکھو اور پھر غور کرو کہ قرآن نے کس طرح تصوّف کی اصل و بنیاد کو ختم کر دیا. تم نے شروع میں دیکھا ہے کہ تصوّف کی عمارت ان اقنومِ ثلاثہ پر قائم ہوتی ہے:-

(۱) ہر انسان خدا کے ساتھ براہِ راست ہم کلام ہو سکتا ہے. (قرآن نے ختمِ نبوّت کا اعلان کر کے، خدا سے براہِ راست ہم کلام ہونے کا دروازہ بند کر دیا).

(۲) انسانی رُوح، خدا کی ذات کا ایک حصّہ ہے جو اس سے الگ ہو کر مادی دنیا میں چکر کاٹ رہی ہے. آخر الامر یہ خدا کی ذات میں جا کر جذب ہو جاتی ہے. یہ انسانی زندگی کا منتہٰی اور کمال ہے (قرآن نے خدا کو ایک مکمّل ذات بتا کر اس باطل تصوّر کی جڑیں کاٹ ڈالیں. اس نے کہا کہ انسان کی ذات، خدا کی ذات کا حصّہ نہیں جو اس سے الگ ہو کر مصروفِ آہ و بکا ہے اور اس کا پھر اپنی اصل سے مل جانا مقصودِ حیات. کوئی ذات نہ کسی دوسری ذات کا حصّہ ہوتی ہے، نہ اس میں جذب ہو سکتی ہے. انسان کی ذات خدا کی عطا کردہ ہے اور اس کی نشو و نما انسانی زندگی کا فریضہ. یہ ذات مناسب نشو و نما سے حیاتِ جاوید حاصل کر سکتی ہے لیکن خدا کی ذات میں جا کر جذب نہیں ہو جاتی). اس کی حیاتِ جاوید بھی خدا کی ابدیت جیسی نہیں. (۱۰۸-۱۰۷/۱۱)

(۳) آسمانی کتابوں کے حقیقی معانی ان کے الفاظ میں نہیں ہوتے۔ ان کے باطنی معنی ہوتے ہیں جو کشف و الہام سے سمجھ میں آسکتے ہیں (قرآن نے کشف و الہام کے امکان کو ختم کر کے اور اپنے آپ کو عربی زبان کی واضح کتاب کہہ کر اس تصوّر کو سرے سے مٹا دیا)۔

(۴) صاحبانِ کشف و الہام سے کرامات سرزد ہوتی ہیں (قرآن نے کہا کہ صاحبانِ کشف و الہام تو کجا رسولِ اکرمؐ کو بھی قرآن کے سوا کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔ حقیقت کو دلائل و براہین کی رو سے منوایا جاتا ہے نہ کہ خارق عادات کرشمے دکھا کر)۔

ان حقائق کی روشنی میں سلیم! (میرا خیال ہے کہ) تم بے ساختہ کہہ اٹھو گے کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ قرآن اور تصوّف بالکل متضاد بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارتیں ہیں۔ اور قرآن فی الواقع تصوّف کی باطل عمارت کو منہدم کرنے کے لئے آیا تھا۔

اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر کچھ اور لکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن چونکہ تم نے یہ بھی پوچھا ہے کہ پھر اسلام میں تصوّف آ کہاں سے گیا؟ اس لئے اس کے متعلق بھی مختصر الفاظ میں لکھنا ضروری ہو گیا۔

اس ضمن میں سب سے پہلے تو یہ سمجھ لو کہ' اور تو اور' خود صوفی بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ لفظ تصوّف کے بنیادی معنی کیا ہیں؟ اس کا مادہ کیا ہے اور صوفی کو صوفی کیوں کہتے ہیں؟ بعض اس لقب کو اصحابِ صفّہ کے نام سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ صحابہؓ جو مدنی زندگی کے ابتدائی ایام میں پناہ گزینوں REFUGEES کی طرح بے سرو سامانی کی حالت میں مسجد نبویؐ کے چبوترے پر رہا کرتے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ صفا سے مشتق ہے۔ بعض اسے یونانی لفظ صوفیا SOPHIE سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ جس کے معنی عقل و دانش کے ہیں اور جو لفظ فلسفہ PHILOSOPHY کی ترکیب میں شامل ہے۔ لیکن اکثر کا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ صوف (اون) کی نسبت سے وضع کیا گیا ہے، کیونکہ یہ لوگ اون کے موٹے موٹے کپڑے پہنتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں میں پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا ابو ہاشم عثمان بن شریک تھا۔ اور صوفیوں کی پہلی خانقاہ ۱۴۰ھ میں رملہ کے قریب (جو فلسطین میں واقع ہے) قائم ہوئی۔

ابوہاشم کوفہ کا رہنے والا تھا اور اُٹھ کر رملہ کی خانقاہ میں آگیا تھا۔ یہاں ۱۶۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اگرچہ صوفیوں کی پہلی خانقاہ فلسطین میں قائم ہوئی جو عیسائیوں کے مسلکِ خانقاہیت کا مرکز تھا۔ لیکن تصوّف کے بنیادی تصوّر کو اسلام میں ایرانیوں نے داخل کیا۔ مسلمانوں نے ایرانیوں کو جتنی بڑی شکست دی تھی وہ اس کا بدلہ جنگ کے میدان میں نہیں لے سکتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے دوسرے میدان تجویز کئے۔ وہ مسلمان ہو کر اسلامی مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں آگئے اور یہاں پہنچ کر اپنے آبائی تصوّرات کو عام کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی قوّت کا راز قرآن کی تعلیم میں ہے۔ اس لئے وہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کو قرآن سے بے گانہ نہ بنایا جائے اس کی قوّت میں ضعف نہیں آسکتا۔ وہ قرآن کے الفاظ کو چھیڑ نہیں سکتے تھے اس لئے کہ اس کی حفاظت کا انتظام بڑا پختہ تھا۔ اور اس کا ذمّہ خود خدا نے لے رکھا تھا۔ لہٰذا انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کے الفاظ تو وہی رہیں لیکن ان الفاظ کا مفہوم یکسر بدل جائے۔ اس کے لئے ایک طریقہ تو وہ تھا جسے (مثلاً) طبریؒ[1] نے اختیار کیا۔ یعنی ہر آیت کی تفسیر کے لئے کوئی نہ کوئی روایت وضع کر لی اور اس آیت کے معنی اس روایت کی رُو سے یہ کہہ کر کر دیئے کہ یہ معنی خود رسول اللہؐ نے بیان فرمائے ہیں۔ لہٰذا قرآن کے الفاظ تو وہی رہے لیکن ان الفاظ کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یہی مفہوم جو ہمارے ہاں اس وقت سے آج تک متوارث چلا آرہا ہے۔ دوسری طرف انہوں نے (ایرانی مسلمانوں نے) یہ خیال پھیلانا شروع کر دیا کہ قرآن کے اصلی معنی اس کے الفاظ سے متعیّن نہیں ہو سکتے۔ اس کے الفاظ کے نیچے ایک باطنی مفہوم ہے جو قرآن کا مغز اور اس کی رُوح ہے۔ وضعی روایات کی رُو سے قرآن کی تفسیر کا سلسلہ آگے نہیں چل سکتا تھا کیونکہ روایات، جس قدر بنائی ممکن تھیں، اس زمانہ میں بن گئیں۔ لیکن اس باطنی طریق سے تفسیر کا طریق ہمیشہ کے لئے جاری رہ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ سلسلہ جاری رہا اور آج تک جاری ہے۔ اس طریق سے اسلام کو جو نقصان پہنچا اس کے متعلق علّامہ اقبال اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:-

> حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک

---

[1] ابنِ جریر طبری، طبرستان کے رہنے والے ایرانی تھے۔

نہایت SUBTLE طریق تنسیخ کا ہے. اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو. شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے. اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا. اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا. تاہم وقت پاکر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بناء وحدت الوجود تھی. ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے. (اقبال نامہ' ج ا' صفحہ ۳۵)

علامہ اقبالؒ نے اپنے اس خط میں قرآن کے باطنی مفہوم کے علاوہ وحدت الوجود کے فلسفہ کا بھی ذکر کیا ہے. اس کے متعلق تفصیل سے کسی اور وقت لکھا جائے گا. سردست تم اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو کہ' جیسا کہ حضرت علامہ نے لکھا ہے' قرآن میں باطنی مفہوم پیدا کرنا اسے منسوخ کر دینے کا ایک نہایت لطیف اور پُرفریب طریقہ تھا جسے مسلمانوں میں اس طرح رائج کر دیا گیا. جیسا کہ تم پہلے دیکھ چکے ہو' یہ وہی چیز تھی جو یہودی' عیسائی اور ایرانی تصوّف میں ہر جگہ موجود تھی. لہٰذا یہی نظریہ مسلمانوں میں جہاں ایک طرف اسماعیلی شیعیت کا موجب بنا' دوسری طرف اس نے تصوّف کی بنیاد ڈال دی.

جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو' باطنی معنی کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ ہر انسان کوشش کرنے سے' کشف والہام کے ذریعے' ان معانی کو براہِ راست خدا سے حاصل کرتا ہے' یعنی خدا اور بندہ کی براہِ راست ہم کلامی کا تصوّر. اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ جہاں باطنی مفہوم کے تصوّر نے قرآن کو عملاً منسوخ کر دیا. وہاں رسول اللہ کے بعد' کشف والہام کے عقیدہ نے ختمِ نبوّت کی مہر کو بھی توڑ دیا. وحی اور الہام میں صرف لفظی فرق ہے ورنہ اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں. دونوں کی عمارت اس بنیاد پر اٹھتی ہے کہ انسان کے پاس عقل کے علاوہ ایک اور ذریعۂ علم بھی ہے جس سے وہ خدا سے براہِ راست معلومات حاصل کر سکتا ہے. اس طریق سے حاصل کردہ معلومات کو قرآن کی رُو سے وحی کہا جاتا ہے اور تصوّف کی زبان میں الہام. لہٰذا ظاہر ہے کہ اگر رسول اللہ کے بعد' الہام کا امکان جاری رہے تو ختمِ نبوّت کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی. چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد جن لوگوں نے نبوّت کا دعویٰ کیا

ہے، کشف و الہام ہی کی رُو سے کیا ہے۔

اس مقام پر شاید تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جب الہام کے امکان سے ختمِ نبوّت جیسے بنیادی عقیدہ کی تردید ہو جاتی ہے تو مسلمانوں میں اس عقیدہ کو رائج کیسے کر دیا گیا؟ اس کے لئے ایک بڑا خوبصورت طریقہ اختیار کیا گیا۔ پہلے یہ کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر وحی کے علاوہ الہام بھی ہوتا تھا۔ اسے وحیٔ خفی، یا وحیٔ غیر متلو کا نام دیا گیا (واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں مسلمان ان اصطلاحات سے آشنا تک نہ تھے)۔ اس عقیدہ نے دو کام کئے۔ ایک طرف ان روایات کو وحی کا درجہ حاصل ہو گیا جو قرآن کی تفسیر یا "اسلام کی تکمیل" کے لئے وضع کی جا رہی تھیں اور دوسری طرف قرآن کے باطنی مفہوم کے لئے سند ہاتھ آگئی۔ اس کے علاوہ اس سے انہیں ایک اور بڑا فائدہ ہو گیا۔ ان لوگوں کو یہ خدشہ تھا کہ اربابِ شریعت کی طرف سے باطنی مفہوم کی مخالفت ہو گی۔ لیکن جب اربابِ شریعت نے اس اصول کو مان لیا کہ رسولؐ اللہ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ہوتا تھا اور ختمِ نبوّت کے معنی سلسلۂ وحی کا ختم ہو جانا ہے، نہ کہ سلسلۂ الہام کا۔ تو وہ اصولاً اہلِ باطن کی مخالفت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ اس قسم کی روایات خود ہماری کتبِ احادیث میں موجود ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے دو برتن عطا فرمائے تھے۔ ایک کو تو میں نے کھول کر عام کر دیا ہے (یہ شریعت کا علم ہوا) لیکن اگر دوسرے کو کھول دوں تو میری شہ رگ کاٹ دی جائے۔ (یہ ہوا باطن کا علم جو سینہ بہ سینہ آگے چلتا ہے)۔ باقی رہیں خانقاہوں کی ریاضتیں۔ سو ان کے لئے اس قسم کی روایات موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نبوّت سے پہلے، پانی اور ستّو لے کر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں کئی کئی روز مصروفِ مراقبہ رہتے تھے۔ انہی ریاضتوں کا نتیجہ خدا کی طرف سے وحی کا ملنا تھا۔ یہ تھے مختصر حربے جن سے، قرآن کے علی الرغم، باطنیت جیسا قرآن کا دشمن عقیدہ عام ہوتا چلا گیا۔

دوسری طرف یہودیت اور نصرانیت کے تصوّف نے پہلے ہی سے فضا کو ان خیالات سے معمور کر رکھا تھا۔ جو یہودی یا نصرانی مسلمان ہوئے انہوں نے اسے اپنے قدیمی رجحان کے عین مطابق پایا۔ اس لئے انہوں نے اسے لپک کر گلے سے لگا لیا۔ نتیجہ یہ کہ تیسری صدی ہجری ہی میں خود مسلمانوں میں اسی زور و شور سے خانقاہیں کھلنی شروع ہو گئیں جس طرح اس سے پہلے عیسائیوں کے ہاں ہوا تھا۔

اگر تصوّف کے سلسلہ کی ابتدا، ان لوگوں کے نام سے کی جاتی جنہوں نے فی الحقیقت اس کی ابتدا، کی تھی تو ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ خیال گزرتا کہ یہ ان کی اپنی اختراع ہے۔ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ ان حضرات نے باطنی طور پر سلسلہ بہ سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے فیض حاصل کیا تھا۔ اور چونکہ یہ تصوّر ایرانیوں کا پیدا کردہ تھا اس لئے اس میں حضرت علیؓ کا اسمِ گرامی نمایاں طور پر درمیان میں لایا گیا اور انہیں شاہِ ولایت کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اب مختلف شجروں کا منتہٰی حضرت علیؓ ہی قرار پاتے ہیں۔ مثلاً حضرت جنیدؒ مرید تھے حضرت سری سقطیؒ کے۔ سری سقطیؒ مرید تھے حضرت معروف کرخیؒ کے۔ معروف کرخیؒ مرید تھے داؤد طائیؒ کے، داؤد طائیؒ مرید تھے حبیب عجمیؒ کے حبیب عجمیؒ مرید تھے خواجہ حسن بصریؒ کے اور خواجہ حسن بصریؒ مرید تھے حضرت علیؓ کے، جنہوں نے یہ باطنی علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے حاصل کیا تھا۔ حالانکہ تاریخ میں اتنی شہادت بھی نہیں ملتی جس سے یہ معلوم کیا جاسکے کہ خواجہ حسن بصریؒ کی ملاقات کبھی حضرت علیؓ سے ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی جنگ میں خواجہ حسن بصریؒ لوگوں کو غیر جانبدار رہنے کی تلقین اور حکامِ وقت کی اطاعت کی تاکید کرتے تھے۔ اگرچہ مجھے تو اس میں بھی شبہ ہی نظر آتا ہے۔ ان کی پیدائش ۲۱ھ میں بتائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی جنگ کے زمانہ میں یہ بمشکل سولہ سترہ برس کے ہوسکتے ہیں۔ اتنی سی عمر میں ان کی ایسی بڑی پوزیشن بمشکل باور کی جاسکتی ہے کہ یہ اتنے بڑے اہم معاملہ میں لوگوں پر کوئی اثر رکھتے ہوں۔ لیکن یہ باتیں تو اہلِ ظواہر کی ہیں۔ صوفیا کے نزدیک زمان و مکان کا بُعد کچھ حیثیت نہیں رکھتا اور سب کچھ بیٹھے بٹھائے، ایک لمحہ میں ہوجاتا ہے۔ مثلاً چوتھی صدی ہجری میں حضرت جنیدؒ کے ایک مرید نے یہ دعوےٰ کیا تھا کہ ان کے پیر و مرشد کو خرقۂ تصوّف حضرت انس بن مالکؓ سے ملا تھا جو رسولُ اللہ کے صحابی تھے۔

میرا خیال ہے سلیم! تم اس مختصر سی سرگزشت سے یہ سمجھ گئے ہوگے کہ تصوّف کے جراثیم اسلام میں کہاں سے اور کیسے آئے۔ اس خط میں تصوّف کی پوری تاریخ بیان نہیں کی جاسکتی، لیکن چلتے چلتے ایک ایسی شخصیت کے متعلق دوچار باتیں ضرور سن لو جس نے تصوّف کو ایک مستقل مذہب کی حیثیت دے دی اور جس کے بھرپور وار سے ملّتِ اسلامیہ اس وقت تک سنبھل نہیں سکی۔ یہ تھے ہسپانیہ کے مشہور صوفی محی الدّین ابنِ عربی، جنہیں شیخِ اکبر کہا جاتا ہے اور جن کی فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم

تصوّف کا عروۃ الوثقیٰ سمجھی جاتی ہیں۔ وہی فصوص الحکم جس کے متعلق علّامہ اقبالؒ نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ:-

جہاں تک مجھے علم ہے فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زندقہ کے کچھ نہیں۔

(اقبال نامہ، ج ا صفحہ ۴۴)

یہ چھٹی صدی ہجری میں اُندلس میں پیدا ہوئے اور ۶۳۸ھ میں دمشق میں وفات پائی، جہاں ان کے مزار پر ایک بہت بڑا گنبد ہے۔ اس زمانہ میں ہسپانیہ میں متصوّفین فلاسفرز کا ایک گروہ تھا جو وحدتِ وجود کے قائل تھے۔ وہ اپنی کیفیات اور احوال کو تشبیہ اور استعارہ کے رنگ میں بیان کیا کرتے اور اپنے عشقِ حقیقی کو عشقِ مجازی کے جاذبِ نگاہ لباس میں پیش کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ عربی انہی سے متاثر ہوئے۔ انہی کا فلسفہ، انہی کا اندازِ بیان حتّٰی کہ انہی کا سا عشقِ مجازی بھی۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ جب وہ مکّہ میں مقیم تھے تو ایک دوشیزہ کی طرف ان کا میلان ہو گیا تھا اور ان کے اکثر مکاشفات کا روحانی جذبہ اسی کے عشق کا رہینِ منت ہے۔ ان کے ملفوظات اور یہودی تصوّف کی بنیادی کتاب "زہار" میں بڑی مطابقت پائی جاتی ہے۔ دونوں الہامی کتابوں کی تاویل اپنے ذاتی مکاشفات کی بنا پر کرتے ہیں۔ حروف اور اعداد سے پُراسرار معانی اخذ کرتے ہیں۔ خوابوں کی تعبیر پر حقائق کی عمارتیں تعمیر کرتے اور انسانی مقدّر کو ستاروں کے اثرات کے تابع مانتے ہیں۔ علّامہ اقبالؒ نے لکھا ہے کہ مسلمانوں میں وحدتِ وجود کا عقیدہ بدھ مت سے آیا ہے۔ لیکن یہ کہیں سے بھی آیا ہو اسے ایک منظّم مذہب کی حیثیت ابنِ عربی نے ہی دی ہے اور ستم ظریفی یہ کہ وہ اس کی سند بھی قرآن سے پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ لیکن وہ سندیں کس قسم کی ہیں، اور اس کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ قرآن کریم میں زمین کے متعلق ہے کہ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ؁(۲۰/۵۵) اس کا صاف ترجمہ یہ ہے کہ ہم نے تمہیں اسی زمین سے پیدا کیا، اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں بارِ دیگر نکالیں گے۔ ابنِ عربی صاحب اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

ہم سب احدیت سے نکلے تھے۔ فنا ہو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے پھر بقا ملے گی اور دوبارہ پھر نمودار ہوں گے۔ (فصوص الحکم)

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ جس بنیادی عقیدہ کی رُو سے تصوّف، اسلام کے مدِّمقابل کھڑا ہوتا ہے وہ یہ

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خدا کے ساتھ براہِ راست ہم کلامی کا سلسلہ جاری ہے۔[1]

ابن عربی کا عقیدہ ہے کہ اربابِ باطن، دین کے متعلق اپنے علم کو خدا اور رسول دونوں سے براہِ راست حاصل کرتے ہیں۔ خدا کے متعلق ان کا ارشاد ہے کہ:

جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسان کامل صاحب الزمان، غوث، قطب لیتے ہیں۔

اور احادیث کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ احادیث

روایت بالمعنی اور ذاتی فہم کی غلطی سے معصوم نہیں۔ لہٰذا اولیا[2] ان کے متعلق رسول خدا سے براہِ راست دریافت کر لیتے ہیں۔ اگرچہ اولیاء انبیاء کے تابع ہوتے ہیں لیکن صاحبِ وحی دونوں ہوتے ہیں...... اگرچہ رسول اللہ کے خلفاء (یعنی اولیاء) دائرۂ شرع سے باہر نہیں نکل سکتے لیکن یہاں ایک دقیقہ ہے جسے ہمارے ہی جیسے شخص جان سکتے ہیں۔ اور وہ دقیقہ یہ ہے کہ جب یہ شرعِ رسول پر حکم کرتے ہیں تو ان کا ماخذ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہاں سے حکم دیتے ہیں؟ اربابِ شریعت تو وہ ہیں جو قرآن و حدیث سے حکم دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں مصرح حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ہیں، اجتہاد کرتے ہیں مگر اس اجتہاد کی اصل وہی منقول قرآن و حدیث ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف و الہام کے ذریعہ خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں۔ لہٰذا خود اس حکمِ شرعی میں خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں۔ پس ایک طور پر مادۂ

---

[1] قرآنِ کریم اسے کفار کا مطالبہ بتاتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ ...... (۲/۱۱۸)

"جو لوگ حقیقت کا علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے براہِ راست ہمکلام کیوں نہیں ہوتا؟"

اس کے بعد قرآن نے اس کی تردید کی ہے۔ اور تصوف کا سارا دار و مدار اسی دعویٰ ہمکلامی پر ہے! یا ویلنا!!

[2] قرآن کی رُو سے اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں۔ وہ تمام مومنین کو اولیاء اللہ کہہ کر پکارتا ہے (۱۰/۶۲-۶۳)۔

کشف و الہام اور مادۂ وحیٔ رسول ایک ہے[1]...... صاحبِ کشف اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیینؐ کے موافق ہے........
ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسولؐ اللہ کا لینا ہے...... یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اللہ کا انتقال ہو گیا اور آپ نے منصوص و معین طور پر کسی کو خلیفہ نہ بنایا کیونکہ آپؐ کو معلوم تھا کہ ان کی اُمّت میں ایسے لوگ ہوں گے جو خلافت کو اللہ تعالیٰ سے لیں گے اور خلیفۃ اللہ ہوں گے...... پس خلقِ خدا میں خلیفۃ اللہ ہیں. وہ معدنِ خاتم النبیینؐ و مادہ انبیاء سابقین سے وہ احکام لیتے ہیں جو خود انہوں نے لئے تھے..........
خدا تعالیٰ ایسے خلیفہ کو وہی احکامِ شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر کے انبیاء کو دیئے گئے تھے. اگرچہ خلیفہ ولی ظاہر میں متبع نبی اور اس کا غیر مخالف رہتا ہے.

دوسری جگہ یہ صاحب لکھتے ہیں:۔

کبھی خلیفہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حکم حدیث کے خلاف ہے. لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اس کا اجتہاد ہے. حالانکہ واقعہ ایسا نہیں. اصل یہ ہے کہ اس کے کشف کی رُو سے یہ حدیث ثابت نہیں. اگرچہ وہ حدیث عن عدل عن عدل سے ثابت ہو.

میں سلیم! اس ضمن میں اور بھی بہت کچھ نقل کر دیتا، لیکن ایک تو خط میں اتنا کچھ آ نہیں سکتا اور دوسرے میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی اصطلاحی چیزوں سے تمہاری طبیعت بہت جلد اکتا جایا کرتی ہے. لیکن جتنا کچھ میں نے لکھا ہے اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ ایک نبی کی وحی اور ان لوگوں کے الہام میں صرف اصطلاحی فرق ہے. معنوی طور پر کچھ فرق نہیں. دونوں کا مفہوم خدا سے براہِ راست علم حاصل کرنا ہے. یہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اگرچہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہوتا ہے لیکن وحی یقینی علم ہوتا ہے اور الہام ویسا یقینی نہیں ہوتا. لیکن یہ فرق صرف کمیت QUANTITY یا درجہ DEGREE کا فرق ہے. کیفیت QUALITY یا نوعیت کا فرق نہیں. سرچشمہ ان دونوں کا ایک ہے. یعنی خدا سے براہِ راست حاصل کردہ علم. اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہو گا سلیم! کہ جب الہام کے امکان

[1] تم نے دیکھا کہ مرزا غلام احمد کو ان کی وحی اور الہام کی سند کہاں سے مل رہی ہے؟

کو مان لو تو پھر نبوّت کا دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے، مسلمانوں میں تمام مدعیانِ نبوّت اسی راستہ سے آئے ہیں۔ اس کشف و الہام کی رُو سے قرآن کو جو باطنی معنی پہنائے جاتے ہیں، ایک آدھ نمونہ اس کا بھی دیکھ لو تا کہ بات نکھر کر تمہارے سامنے آجائے۔ ابنِ عربی، فصوص الحکم کلمہ موسویہ میں لکھتے ہیں کہ:-

> فرعون کے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے میں کیا حکمت تھی اور کیا راز تھا؟ اس کا راز یہ تھا کہ جو جو لڑکے موسیٰؑ کے واسطے مارے گئے تھے ان کی زندگی سے موسیٰؑ کو امداد ملے۔ کیونکہ وہ لڑکے موسیٰؑ سمجھ کر مارے گئے تھے تو ضرور ان سب بچّوں کی حیات جو موسیٰؑ سمجھ کر مارے گئے تھے حیاتِ موسوی کی طرف عود کرے گی۔ ان معصوم بچّوں کی حیات ظاہر تھی، فطرت پر تھی بلکہ وہ قالوا بلیٰ کے عہد پر قائم تھے۔ لہٰذا موسیٰ ان سب مقتولین کی حیات کا مجموعہ تھا۔ وہ بہت سی روحوں کا مجموعہ تھا اور بلند مقام پر تھا کیونکہ بچّہ کو اللہ کے پاس سے آئے ہوئے تھوڑی مدّت ہوتی ہے۔

آگے چل کر یہ صاحب یہ کہنے کی بھی جرأت کرتے ہیں کہ فرعون ایمان پر مرا تھا اور اس کی بخشش ہو چکی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ تو یہاں تک بھی لکھ گئے ہیں (جس کے نقل کرنے سے میرا قلم تھر تھراتا اور روح کانپتی ہے) کہ

> پس فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے **انا ربکم الاعلیٰ** کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جُدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔

اور ایک ابنِ عربی پر ہی کیا موقوف ہے۔ دیگر بڑے بڑے صوفیا کے ہاں بھی اسی قسم کی شطحیات ملتی ہیں۔ رومی کہتا ہے۔

می گفت در بیاباں رند دہن دریدہ
صوفی خدا ندارد او نیست آفریدہ

حدیقہ سنائی میں ایک شعر ہے جسے لکھتے وقت ہزار بار رُوح تھر تھراتی اور دل کانپتا ہے لیکن چونکہ اس قسم کی مثالوں کے بغیر بات صاف نہیں ہوتی اس لئے دل پر پتھر رکھ کر اور صد بار نقل کفر کفر نباشد کہتے ہوئے لکھتا ہوں۔ وہ کہتا ہوں۔

در مذہب عاشقاں یک رنگ
ابلیس و [1]...... است یک سنگ

ان لوگوں کے نزدیک کفر اور اسلام میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ

کفر و دیں است در رہت پویاں
وحدہٗ لا شریک لہٗ گویاں

میرا خیال ہے کہ تم ان مثالوں سے سمجھ گئے ہو گے کہ وہ جو اقبالؒ نے کہا تھا کہ فصوص الحکم میں الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نہیں، تصوّف کا تمام لٹریچر اسی قسم کے الحاد و زندقہ سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ صوفیا میں بعض ایک دوسرے کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ مثلاً وحدتِ شہود کے مدعی وحدتِ وجود کی مخالفت کرتے ہیں لیکن تصوّف کی اصل و بنیاد کو سب محفوظ رکھتے ہیں۔ اور جو شخص اس کی طرف انگلی اٹھائے اس کی مخالفت میں سب متفق ہو جاتے ہیں۔ اسی قسم کی مخالفت نے آج کل ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے۔ یعنی عجمی تصوّف اور اسلامی تصوّف۔ اس امتیاز کی وجہ بڑی دلچسپ ہے۔

ایک چیز ہے تصوّف اور ایک چیز ہے تصوّف کا ضابطۂ اخلاق ETHICS OF MYSTICISM تصوّف کا ضابطۂ اخلاق یہ ہے کہ دنیا کو چھوڑو، آرزوؤں کو ترک کرو، محکومی اور سر بزیری کی زندگی بسر کرو، افلاس اور محتاجی کو خدا کی رحمت سمجھو، قوت اور شوکت کو خوئے درندگی جانو اور مسلک گوسفندی اختیار کرو۔ ہمارے زمانہ میں علّامہ اقبالؒ نے تصوّف کے اس ضابطۂ اخلاق کی سخت مخالفت کی اور قرآن کے پرشکوہ اور باعظمت، زندہ اور زندگی بخش مسلکِ حیات کی عام تبلیغ کی، چونکہ اہلِ تصوّف اس دَور میں یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ ضابطۂ اخلاق فی الواقعہ اسلام کی تعلیم کا مظہر ہے اس لئے انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ عجمی تصوّف ہے اسلامی نہیں یعنی یہ لوگ جس تصوّف کے وارث ہیں وہ اسلامی ہے اور جس تصوّف کی مخالفت ہو رہی ہے وہ عجمی ہے۔ حالانکہ تصوّف نہ عجمی ہے نہ اسلامی۔ یہ ایک غیر اسلامی تصوّر ہے جو غیر مسلموں میں بھی پایا جاتا ہے اور مسلمانوں میں بھی۔ جس طرح جھوٹ، مسلمانوں کے ہاں آکر سچ نہیں بن سکتا اسی طرح کوئی غیر اسلامی نظریہ مسلمانوں کے ہاں رواج پا کر اسلامی نہیں بن سکتا۔ یہ کہنا کہ حافظ کا تصوّف عجمی ہے اور رومی کا تصوّف اسلامی، تصوّف کی اصل و بنیاد سے ناواقفی نہیں تو تسامح ضرور ہے۔ ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ضابطۂ اخلاق

[1] یہاں نبی اکرمؐ کا اسم گرامی لکھا ہے۔ استغفر اللہ۔ ثم استغفر اللہ۔

کا ہے۔ نہ کہ تصوّف کا۔ مثلاً حافظ کے ہاں سکوت و سکون ہے اور رومی کے ہاں اکثر مقامات پر حرارت اور گرم جوشی۔ لیکن اس کے باوجود دونوں صوفی ہیں۔ بلکہ رومی اس باب میں حافظ سے بھی زیادہ شدید صوفی ہے۔ وہ باطنی ذریعہ علم کو حافظ سے بھی زیادہ قابلِ اعتماد قرار دیتا ہے۔ جہاں تک قرآن کے باطنی مفہوم کا تعلق ہے رومی کا یہ دعویٰ ہے کہ:۔

ما ز قرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

یہ "مغز" وہی ہے جسے باطنی مفہوم کہا جاتا ہے اور "استخواں" (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) وہ قرآن ہے جو عربی الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔ جب مثنوی کو "قرآن در زبانِ پہلوی" کہنے والوں کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا جائے تو وہ کھسیانے سے ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ مولانا کا اس سے مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کے معانی لے لئے ہیں۔ الفاظ سے ہمارا سروکار نہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ کیا دنیا میں بغیر لفظ کے بھی کوئی معنی ہوتا ہے؟ تم سمجھے سلیم! کہ یہ کیا بات ہوئی۔ بات وہی ہوئی جو میں نے اوپر لکھی ہے کہ یہ حضرات اس مفہوم کو اصل مفہوم سمجھتے ہی نہیں جو قرآن کے الفاظ سے متعیّن ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن کا صحیح مفہوم وہ ہے جو انہیں کشف و الہام کے ذریعہ براہِ راست خدا سے ملتا ہے۔ اور یہی ہے تصوّف کی وہ بنیاد جو قرآن کے یکسر خلاف ہے۔ لہٰذا اس بنیاد کی رُو سے نہ رومی کا تصوّف اسلامی ہو سکتا ہے نہ حافظ کا۔ تصوّف فی ذاتہٖ ایک غیر اسلامی نظریہ ہے اور اقبالؒ کے الفاظ میں "سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا۔"

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ تصوّف سے مراد صرف "اخلاص فی العمل" ہے یعنی نیک کام دکھاوے کی خاطر نہ کئے جائیں بلکہ مخلصانہ طور پر خدا کی رضا جوئی کی خاطر کئے جائیں۔ ذرا سوچو سلیم! کہ کیا اسلام یہ سکھاتا ہے کہ نیک کام ریا کاری سے کئے جائیں، جو اخلاص فی العمل کے لئے اسلام کو چھوڑ کر تصوّف کی الگ اصطلاح کی ضرورت پڑ گئی؟ قرآن ریا کاری اور منافقت کو بدترین جرم قرار دیتا ہے اور ایسا کرنے والوں کو جہنّم کے سب سے نچلے طبقہ میں پھینکتا ہے۔ اس نے ریا کاروں کے لئے منافق اور مخلصین کے لئے مومن کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ان قرآنی اصطلاحات کو چھوڑ کر ہمیں اور اصطلاحات تلاش کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ بالخصوص جب کہ وہ اصطلاحات (تصوّف اور صوفی) اس قدر غیر قرآنی تصوّرات

کی حامل ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ تصوّف کی مدافعت کی کوشش کرتے ہیں ان کی اس کوشش کا جذبۂ محرکہ وہی ہوتا ہے جو دیگر غیر قرآنی معتقدات و تصوّرات کی مدافعت میں کارفرما ہوتا ہے یعنی اسلاف پرستی کا جذبہ۔ تصوّف میں پہنچ کر یہ جذبہ اور بھی شدید ہو جاتا ہے اس لئے کہ صوفیا (اولیاء اللہ) کا جو مرتبہ ان کے معتقدین کے دل میں ہوتا ہے وہ خدا کا بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ اس بات کا خیال تک بھی دل میں لانا کفر سمجھتے ہیں اور اس سے لرز جاتے ہیں کہ ان حضرات کے مسلک کو تنقید کی نگاہ سے دیکھیں خواہ وہ تنقید خالص قرآن کی کسوٹی ہی سے کیوں نہ کی جاتی ہو۔ لیکن سلیم! یاد رکھو، جب تک ہم یہ مسلک ATTITUDE اختیار نہیں کریں گے کہ اپنے مروّجہ عقائد اور تصوّرات کو قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھیں اور ایسا کرنے میں کسی اور خیال کو اثر انداز نہ ہونے دیں، اس وقت تک ہم اس ضابطۂ زندگی (الدین القیّم) کے قریب تک بھی نہیں آسکیں گے جسے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا۔

باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ ان لوگوں سے بعض اوقات ایسی باتیں (کرامات) سرزد ہوتی ہیں جن کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔ تو اس کے متعلق اس خط میں اس سے زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں کہ ان باتوں کو دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر انسان کے اندر ایک قوت ہے (جسے قوّتِ خیال کہہ لو یا WILL POWER جسے اگر خاص طریقوں سے DEVELOP کر لیا جائے تو اس سے ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں جنہوں نے ایسا نہ کیا ہو۔ یہ کچھ ہر انسان کر سکتا ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی تمیز نہیں۔ ہندو سادھوؤں اور سنیاسیوں سے (جو علانیہ بُت پرستی کرتے ہیں) ایسی ایسی "خارق عادات" باتیں سرزد ہوتی ہیں جو مسلمان پیروں سے بھی نہیں ہوتیں۔ اس باب میں تمہیں یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ میری عمر کا ایک بڑا حصّہ انہی وادیوں میں گزرا ہے۔ اور میں نے یہ سب کچھ خود کر کے دیکھا ہے۔ اس کے لئے میں اپنے ہاں کی خانقاہوں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ سادھوؤں کی سمادھیوں تک سے بھی ہو آیا ہوں۔ وہاں یہی دیکھنے گیا تھا کہ اگر یہ "کرامات" دین اسلام کا مغز ہیں تو پھر مشرکین سے یہی کچھ کیسے سرزد ہو جاتا ہے! لہٰذا اس باب میں، میں کہہ سکتا ہوں کہ، قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔

لیکن میں اس ضمن میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس لئے کہ (تم تو شاید ضبط کر لو لیکن) اگر طاہرہ نے سُن پایا تو وہ سر ہو جائے گی کہ چچّا ابّا کچھ ہمیں بھی دکھایئے۔ زیادہ نہیں تو مائی جیبو کی بیٹی کا جن ہی نکال دیجئے! اسے کیا معلوم کہ یہ جن نکالنے تو بہت آسان ہیں لیکن وہ جن جو پوری کی پوری ملت

اسلامیہ کو صدیوں سے چمٹے چلے آرہے ہیں ان کا نکالنا کس قدر مشکل ہے۔ اور ان جنات میں سے یہ جن تو بہت ہی بڑا اور خطرناک ہے کہ ختمِ نبوّت کے بعد الہام کا دروازہ کھلا ہے اور انسان خدا سے براہ راست ہمکلام ہو سکتا ہے۔ یاد رکھو سلیم! رسول اللہ کے بعد، خدا سے "ہم کلام" ہونے کا ذریعہ صرف قرآن ہے اور قرآن کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ سے متعیّن ہوتا ہے۔ اس کا کوئی باطنی مفہوم نہیں۔

اب سمجھے تم کہ تصوّف کا عقیدہ کس طرح ختمِ نبوّت اور قرآن کی اکملیّت کی عمارت کو بنیادوں تک سے گرا دیتا ہے۔ اور یہ کہ جو لوگ اسلام کے ہاتھوں میدانِ جنگ میں پٹے تھے انہوں نے اسے کس طرح مدرسوں اور خانقاہوں میں پہنچ کر پچھاڑا ہے[1]۔

دسمبر ۱۹۵۴ء

والسّلام

پرویز

[1] اس کے بعد پرویز صاحب کی کتاب "تصوّف کی حقیقت" شائع ہوئی جس میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔　(ناشر)

بتیسواں خط

صُوفیائے کرام

تم نے عزیزم! وقت تو بہت لیا لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی کہ تصوّف اپنی اصل کے اعتبار سے غیر قرآنی تصوّر ہے۔ اب رہا تمہارا یہ سوال کہ ہمارے صوفیائے کرام کی (بالخصوص وہ جن کا ہندوستان میں بہت چرچا ہے) علمی اور فکری سطح کیا تھی، اور قرآن پر ان کی نگاہ کہاں تک تھی؛ تو اس کے لئے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے جو بزرگ دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں، ان کے متعلق جب بھی گفتگو کی جائے گی تو انہی کتابوں کی رُو سے کی جائے گی جنہیں ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔
ان کتابوں کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ یا وہ ان حضرات کی نہیں ہیں اور انہیں ان کی طرف غلط منسوب کیا جاتا ہے، تو اس صورت میں ان کے متعلق ہم بھی وہی کہیں گے جو حضرت موسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ (۲۰/۵۲) اور اگر یہ کتابیں فی الواقعہ انہی کی ہیں تو ان سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان حضرات کی علمی اور ذہنی سطح کیا تھی۔ تم نے بالخصوص حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ، خواجہ قطب عالمؒ، بابا فرید گنج شکرؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے متعلق دریافت کیا ہے۔ ان حضرات کی مستقل تصانیف کوئی نہیں، البتہ ان کے ملفوظات کے مجموعے ہیں۔ ان ملفوظات کی صورت یوں ہے کہ ایک پیر کے ملفوظات ان کے خلیفہ قلمبند کرتے ہیں۔ وہ ان کی مجلس میں جاتے ہیں، اور ان کے ارشادات کو محفوظ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک مجموعہ مرتب ہو جاتا ہے۔ مثلاً خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے پیر و مرشد تھے خواجہ عثمان ہارونیؒ۔ انہوں نے خواجہ ہارونیؒ کے ملفوظات قلمبند فرمائے ہیں۔ اس مجموعہ کا نام ہے

انیس الارواح. خواجہ اجمیریؒ کے ملفوظات کو ان کے خلیفہ خواجہ قطب الدین اوشی کاکیؒ (خواجہ قطب عالمؒ) نے جمع کیا ہے، اس کا نام ہے دلیل العارفین. خواجہ قطب عالمؒ کے ملفوظات کو بابا فرید گنج شکرؒ نے مرتب فرمایا تھا. اس مجموعہ کا نام ہے فوائد السالکین. حضرت بابا فریدؒ کے ملفوظات کو خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے جمع کیا تھا، اس کا نام ہے راحت القلوب. خواجہ نظام الدین اولیاءؒ[1] کے ملفوظات کو امیر خسرو نے مرتب کیا تھا. مجموعہ کا نام ہے راحت المحبین. تم نے دیکھا کہ اس طرح ان ملفوظات کے ہر مجموعہ کو دوہری سند حاصل ہو جاتی ہے، ایک تو ان کی جن کے یہ فرمودات ہیں اور ایک ان کی جنہوں نے ان ارشادات کو جمع اور مدون فرمایا. مثلاً انیس الارواح میں خواجہ عثمان ہارونیؒ کے فرمودات ہیں. اس اعتبار سے انہیں ان کی سند حاصل ہے، اور ان فرمودات کو جمع کیا، خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے. اس اعتبار سے اس مجموعہ کو ان کی سند حاصل ہے. یہ مجموعے طبع شدہ ہیں. اس لئے انہیں از خود دیکھا جا سکتا ہے، اور چشتیہ خاندان کے متوسلین تو ان مجموعوں کو ورد و وظائف کی طرح یاد کرتے اور دہراتے رہتے ہیں. چاہیئے تو یہ تھا کہ تم خود ان مجموعوں کو دیکھتے تاکہ تمہیں ان کے علمی پایہ کا براہِ راست اندازہ ہو جاتا، لیکن تمہاری تو حالت یہ ہو چکی ہے کہ لا دے لدا دے، لادنے والا ساتھ دے. تم انہیں از خود کہاں پڑھو گے! اس لئے یہ ڈیوٹی بھی مجھے ہی سرانجام دینی پڑے گی. لیکن میں ان مجموعوں کو بہ تمام و کمال تو خط میں منتقل کر نہیں سکتا. یہی ہو سکتا ہے کہ ان کے بعض اقتباسات نقل کر دوں. ان سے باقی مجموعہ کے متعلق خود اندازہ لگا سکو گے. یہ مجموعے فارسی زبان میں ہیں. لیکن چونکہ تمہیں فارسی پہ اتنا عبور نہیں، اس لئے ان کا اردو ترجمہ ہی لکھنا پڑے گا. یہ ترجمہ مسلم پریس دہلی کا چھپا ہوا ہے. اقتباسات لفظ بہ لفظ نقل کئے جائیں گے تاکہ ان کی صحت میں کوئی شبہ نہ رہے. تمہیں معلوم ہے کہ میں ایسے معاملات میں کتنی احتیاط برتا کرتا ہوں. اچھا تو سنو.

انیس الارواح

پہلا مجموعہ ہے انیس الارواح یعنی خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ارشادات کا مجموعہ جسے خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے مرتب فرمایا. خواجہ اپنے پیر و مرشد کے متعلق فرماتے ہیں کہ

---

[1] اولیاءؔ دلی کی جمع ہے، لیکن چونکہ ان کا یہی نام مشہور ہے اس لئے میں نے بھی اسی طرح لکھ دیا ہے.

"میرے ہمسایہ میں میرا ایک پیر بھائی تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا، لوگ تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر دفن کر کے واپس چلے آئے۔ میں اس کی قبر پر بیٹھا رہا۔ عالمِ مشغولی میں کیا دیکھتا ہوں کہ دو فرشتے عذاب کے اس کے پاس آئے اور چاہتے تھے کہ عذاب کریں۔ اتنے میں حضرت پیر و مرشد تشریف لائے اور ان دونوں فرشتوں کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا کہ اسے عذاب مت کرو۔ یہ میرا مرید ہے۔ وہ حسب الارشاد واپس چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے اور عرض کی، باری تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ اگرچہ یہ شخص آپ کا مرید تھا لیکن آپ کے طریقہ سے برگشتہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ حال ایسا ہی ہے مگر اس نے اپنی ذات کو میرے پلے میں باندھ دیا تھا۔ اس کی حمایت میرے ذمہ ضروری ہے۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ان فرشتوں کو حکم ہوا کہ واپس چلے آؤ۔ اس شخص کو عذاب نہ کرو۔ ہم نے اسے حضرت کی خاطر عزیز ہونے کے سبب بخش دیا۔"

اس کے بعد خواجہ صاحب نے اپنے پیر و مرشد کی معیت میں ایک سفر کا حال لکھا ہے جس میں (بدخشاں میں) ایک بزرگ کو دیکھا جن کی عمر ایک سو چالیس برس کی تھی۔ ان کا ایک پاؤں جڑ سے کٹا ہوا تھا، اس کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ:۔

"میں ایک مدت سے اس صومعہ میں معتکف ہوں۔ اس سے کبھی ایک قدم بھی خواہش نفس سے باہر نہیں نکالا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ہوائے نفسانی سے یہ بریدہ پاؤں باہر نکالا، دوسرا نکال کر ارادہ روانگی کا تھا کہ ہاتف نے آواز دی:۔

اے مدعی! ہمیں عہد یاد کہ فراموش کر دی۔ یہ آواز سُن کر متنبہ ہوا اور اپنی وعدہ خلافی سے پشیمان۔ چھری میرے پاس موجود تھی۔ فی الفور میان سے نکالی اور اس پاؤں کو جو باہر نکالا تھا کاٹ کر پھینک دیا۔"

اب مجالس کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ ایک دن گفتگو دربارۂ چاند و سورج گرہن ہوئی، آپ نے فرمایا:
"حضرت ابنِ عباسؓ نے رسول اللہ سے روایت کی ہے کہ جب آدمیوں سے گناہ زیادہ سرزد ہوتے ہیں فرشتوں کو اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ چاند اور سورج کو پکڑ و اور اس کے کسی جزو یا کل کو کسی قدر عرصہ کے لئے بے نور کر دو کہ اس سے خلق کو عبرت ہو۔"

ایک مجلس میں فرمایا کہ :-

"اگر خاوند کے جسم سے پیپ اور خون رواں ہو اور عورت اسے صاف کرنے کے لئے اپنے مُنہ سے چاٹے، تو بھی خاوند کا حق کما حقہٗ ادا نہ ہوگا۔"

ایک مجلس میں فرمایا کہ :-

"حضرت عیسٰیؑ کا دسترخوان سرخ رنگ کا تھا۔ وہ آسمان سے نازل ہوا تھا۔ جو شخص سرخ دسترخوان پر روٹی کھاتا ہے۔ روز حشر حضرت جبریل اس کے لئے براق معہ حلہ بہشتی لائیں گے۔"

ایک مجلس میں اہلِ جنّت کے متعلق گفتگو ہوئی تو فرمایا کہ :-

"رسول اللہؐ سے پوچھا گیا کہ آپ ہمیں اہلِ جنّت کے خورد و نوش سے خبر دیجئے۔ حضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے مجھ کو اس ذوالجلال والاکرام کی جس نے مجھے پیغمبری دی ہے کہ مرد بہشت میں سو مرتبہ کھانا کھائے گا اور سو ہی مرتبہ اپنی عیالداری سے محبّت کرے گا۔ کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ جب اس قدر کھانا پینا ہوگا تو انہیں قضائے حاجت بھی ہوگی یا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں۔ وقتِ قضائے حاجت شکم سے ایک ریح خارج ہوگی جس کی خوشبو مشک کو ماند کرتی جائے گی۔"

دلیل العارفین اب اس مجموعہ کو لو جو خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے اور جنہیں خواجہ قطب عالمؒ نے مرتّب فرمایا تھا۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ خواجہ عثمان ہارونیؒ، قصبہ ہارون کے رہنے والے تھے جو نیشاپور کے قریب واقعہ ہے۔ اور خواجہ اجمیریؒ قصبہ سنجر میں پیدا ہوئے تھے جو سیستان میں واقعہ ہے۔ آپ کی وفات ۶۳۲ھ میں اجمیر میں ہوئی تھی۔ آپ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ :-

"فقہ اکبر میں بروایت امام اعظم ابو حنیفہؒ لکھا ہے کہ ایک کفن چور جس نے چالیس سال تک کفن چرائے تھے، قضائے الٰہی سے مر گیا۔ اس کے بعد لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ بہشت بریں میں خراماں ہے۔ پوچھا کہ یہ درجہ اس نے کہاں سے حاصل کیا۔ جواب دیا کہ نماز پڑھنے اور صبح کی نماز سے اشراق تک مصلّے پر قرار پکڑنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ

نے میرے سارے گناہ بخش دیئے۔"

ایک مجلس میں فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ[1] کی تفسیر میں فرمایا کہ ویل ایک کنواں یا میدان، دوزخ میں ہے۔ اس سے زیادہ کسی دوزخ میں عذاب نہیں۔

ایک مجلس میں عذابِ قبر کے متعلق گفتگو کے دوران میں فرمایا کہ

"ایک بزرگ بصرہ کے ایک قبرستان میں بیٹھے تھے۔ ہمارے متصل ایک مردے کو عذابِ قبر ہو رہا تھا۔ اس بزرگ نے جب یہ حال دیکھا تو زور سے نعرہ مار کر زمین پر گر پڑے۔ ہم نے اٹھانا چاہا تو معلوم ہوا کہ جان قالب سے پرواز کر گئی ہے۔ پھر تھوڑی دیر میں بدن ان کا پانی ہو کر ناپید ہو گیا۔ اسی طرح فرمایا کہ دو درویش قوالی سنتے سنتے زمین پر گر پڑے۔ خرقہ ان کا زمین پر پڑا رہا اور جسم اس کے اندر سے غائب ہو گیا۔"

ایک مجلس میں خواجہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ

"بروزِ قیامت انبیاء، اولیاء سب قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ ان کے کندھوں پر کمبل پڑے ہوں گے۔ ہر ایک کمبل میں کم و بیش ایک لاکھ تانے کے دھاگے اور ایک لاکھ بانے کے ہوں گے۔ ان کے مرید اور بچے ان کے ان تاگوں کو پکڑیں گے اور اس وقت تک پکڑے رہیں گے جب تک خلق ہنگامۂ محشر سے فارغ نہ ہو۔ پھر حق تعالیٰ انہیں پُلِ صراط پر پہنچائے گا اور وہ مع اپنے پیروں کے اس بتیس ہزار برس کے راستے کو ایک دم زدن میں بہ برکت پکڑے رہنے اس گلیم کے طے کریں گے۔ اور دروازۂ بہشت پر پہنچ کر دارالنعیم میں داخل ہوں گے۔"

ایک اور مجلس میں فرمایا کہ

"جب رسولؐ اللہ کا وصال ہوا تو آپ نے اصحابِ کہف کا غار دیکھا۔ انہیں سلام کیا۔ حق تعالیٰ نے سب کو زندہ کیا اور جواب سلام دلوایا۔ آپ نے مذہب اسلام کی دعوت دی اور انہوں نے اسے بصدقِ دل منظور کیا۔"

---

[1] تباہی (ویل) ہے ان نمازیوں کے لئے جن کی نمازیں تیر بے ہدف کی طرح بے نتیجہ رہ جائیں۔

ایک مجلس میں فرشتوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ

"اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ ہابیل نام پیدا کیا۔ اس کا ایک ہاتھ مشرق میں ہے اور دوسرا مغرب میں، تسبیح اس فرشتہ کی ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ وہ روز و شب پر مؤکل ہے۔ اس کے سامنے ایک تختی پر بہت سے خطوط سیاہ و سفید ہیں، وہ ان خطوط کی درازی اور کوتاہی سے رات دن چھوٹا بڑا کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو دن رات گھٹ بڑھ جاتے ہیں۔ یہ فرما کر آپ زار و قطار رونے لگے اور عالمِ بے ہوشی آپ پر طاری ہوا۔ پھر فرمایا کہ حق تعالیٰ نے کوہ قاف کو پیدا کیا ہے۔ اور تمام عالم اس کے احاطہ کے اندر آباد ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں بھی اس کا ذکر ہے۔ فرمایا: ق۔ والقرآن المجید...... پھر فرمایا کہ وہ پہاڑ زمین سے چالیس گنا زیادہ وسیع ہے۔ اسے ایک گائے اپنے سر پر رکھے ہے۔ درازی اس گائے کی تیس ہزار سال کی راہ ہے۔ سر اس کا مشرق میں اور دم مغرب میں ہے۔ پھر فرمایا کہ خواجہ مودود چشتیؒ نے جس مجلس میں یہ بات بیان کی تھی اس میں ایک درویش حاضر تھے۔ انہیں اس سے اپنے دل میں کچھ شک گزرا۔ حضرت خواجہ سر بمراقبہ ہوئے۔ اور وہ درویش اپنے اپنے خرقوں سے گم ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے تو اس درویش نے قسم کھا کر کہا کہ مجھے حضرت خواجہ نے کوہ قاف دکھا دیا ہے۔ اب مجھ کو کوئی شبہ نہیں رہا۔"

ایک مجلس میں فرمایا کہ

"جس روز اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو پیدا کیا ہے۔ اس روز اللہ تعالیٰ نے ایک سانپ کو بھی پیدا کیا اور اس سانپ سے ارشاد فرمایا کہ اے سانپ! ہم تجھے امانت سپرد کرتے ہیں، منظور ہے یا نہیں۔ سانپ نے جواب دیا کہ مجھے بسر و چشم منظور ہے۔ حکم ہوا منہ کھول دے۔ اس نے منہ کھولا۔ فرشتوں کو حکم ہوا کہ دوزخ کو لاؤ اور اس سانپ کے منہ میں رکھ دو۔ فرشتوں نے دوزخ لا کر اس کے منہ میں رکھ دی اور منہ باندھ دیا۔ اب دوزخ اس سانپ کے منہ میں ہے۔ ساتویں زمین کے نیچے۔ اگر دوزخ سانپ کے

مُنہ میں زیرِ زمین نہ ہوتی تو تمام عالم جل جاتا۔"

ایک مجلس میں الحمد شریف کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

"میں اور خواجہ عثمان ہارونیؒ سفر میں تھے۔ دجلہ کے کنارے پہنچے۔ دریا طغیانی پر تھا۔ میں فکر میں ہوا کہ کس طرح پار اتریں' اور جلد عبور کرنے کی ضرورت تھی۔ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ آنکھیں بند کرو۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ تھوڑی دیر میں کھولیں خود اور حضرت خواجہ کو دجلہ کے پار پایا۔ میں نے دریافت کیا کہ کس طور عبور فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ الحمد شریف کو پانچ مرتبہ پڑھ کر قدم پانی میں رکھا اور پار اُتر گئے۔"

ایک دفعہ فرمایا کہ

"جب حضرت آدم سے لغزش ہوئی تو تمام چیزیں حضرت کو دیکھ کر رونے لگیں لیکن چاندی اور سونا نے آنسو نہ نکالے اور خدا سے عرض کی کہ ہم اس کے حال پر نہ روئیں گے جو تیرا گناہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ عرض سُن کر قسم کھائی اور کہا کہ میں تمہاری قیمت مقرر کر دوں گا اور بنی آدم کو تمہارا خادم بنا دوں گا۔"

اس کے بعد فرمایا کہ جنگل میں ایک درویش رحلت کردہ کی لاش کو دیکھا کہ ہنس رہی تھی۔ پوچھا تم تو مر چکے ہو اب کیونکر ہنستے ہو۔ جواب دیا کہ محبّتِ حق تعالیٰ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

سلیم میاں! باتیں تو بہت سی لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن خط میں اتنی گنجائش کہاں ہے۔ اس لئے مختصر اقتباسات پر ہی کفایت کر رہا ہوں۔

فوائد السائلین

اب تم فوائد السائلین کو دیکھو جو خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکیؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے اور جنہیں ان کے خلیفہ خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ نے مرتب فرمایا تھا۔ خواجہ صاحب قصبہ اوش کے رہنے والے تھے جو ماوراءالنہر کا ایک قصبہ ہے۔ آپ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ کی والدہ پندرہ پارہ کی حافظہ تھیں' اور ایامِ حمل میں قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف رہتی تھیں۔ اس لئے آپ پیدائش ہی سے پندرہ پارہ کے حافظ تھے۔

آپ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ

"بدخشاں میں ایک بزرگ تھے۔ انہوں نے حاکمِ وقت کو حکم دیا کہ ایک خانقاہ تیار

کرو۔ اس نے خانقاہ تیار کرائی، تو آپ نے حکم دیا کہ ہر روز بازار سے ایک کُتّا خرید کر لائیں۔ حسب الحکم روز کتّے خرید کر لاتے، آپ ان کا ہاتھ پکڑ کر سجادہ پر بٹھاتے اور فرماتے خدا کے سپرد کیا۔ آخر الامر وہ کتّے ایسے ہو گئے کہ ہر ایک ان میں پانی پر چلتا تھا اور جس کسی کو وہ نقش دے دیتا اچھا ہو جاتا۔"

ایک مجلس میں فرمایا کہ

"میں اور قاضی حمید الدین ایک سفر میں تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا بچھو ہے، جو دریا کی جانب روانہ ہو رہا ہے۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو لئے۔ دریا پر پہنچے تو دریا زور شور سے رواں تھا، اور کوئی کشتی وغیرہ موجود نہ تھی۔ ہم نے اللہ سے دُعا کی کہ اگر ہم نے اپنا کام کمال کو پہنچالیا ہو تو دریا ہمیں راہ دے دے۔ ناگاہ دریا شق ہو گیا اور درمیان دریا راہ ہویدا ہوئی۔ ہم اس راہ میں رواں ہو کر پار اُتر گئے۔ وہ بچھو ہمارے آگے آگے تھا۔ بچھو ایک درخت کے تلے پہنچا جس کے سائے میں ایک مرد سو رہا تھا، اور ایک اژدھا اس شخص کو کاٹنے کے لئے آ رہا تھا۔ بچھو نے سانپ کے ڈنگ مارا، سانپ مر گیا۔ اور بچھو غائب ہو گیا۔ وزن اس سانپ کا ہزار من کا ہو گا۔ ہم اس شخص کے قریب گئے تو معلوم ہوا کہ وہ شرابی ہے۔ شراب پی کر ستے کی ہے اور بدمست پڑا ہے۔ ہم متعجّب ہوئے کہ ایسے نافرمان شخص پر اللہ نے ایسی نوازش فرمائی ہے۔ جونہی یہ اندیشہ ہمارے دل میں گزرا، ہاتفِ غیبی نے آواز دی کہ اگر ہم پارساؤں پر ہی اپنی توجہ مبذول رکھیں تو غریبوں کا حامی کون ہو گا؟"

ایک مجلس میں فرمایا کہ خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ایک مرید نے آپ سے کہا کہ میرے ہمسایہ نے میرے مکان سے متصل ایک چوبارہ بنوایا ہے جس سے میرا مکان بے پردہ ہو گیا ہے۔ آپ نے دریافت کیا کہ وہ شخص یہ جانتا ہے یا نہیں کہ تم میرے مرید ہو۔ اس نے کہا کہ وہ اس سے واقف ہے۔

آپ نے یکایک زبان مبارک سے فرمایا کہ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ کوٹھے پر سے گر نہیں پڑتا اور اس کا مہرۂ گردن ٹوٹ نہیں پڑتا۔ اس اثنا میں وہ مرید اپنے گھر کو گیا۔ راستے میں سنا کہ وہ شخص کوٹھے سے گر پڑا ہے اور اس کی گردن کا مہرہ ٹوٹ گیا ہے۔

پھر فرمایا کہ بغداد شریف میں ایک شخص کو جرم قتل کی سزا میں قتل کرنے لگے اور قاعدے کے موافق اس کا مُنہ قبلہ رُخ کرنے لگے تو اس نے اپنا مُنہ قبلہ سے پھیر کر اپنے پیر کے مزار کی طرف کر لیا ـــــ جلاّد نے کہا کہ مرتے وقت اپنا رُخ قبلہ کی طرف کرنا چاہیئے۔ اس شخص نے کہا کہ تو اپنا کام کر۔ میں نے اپنا مُنہ اپنے قبلہ کی طرف کر لیا ہے۔ وہ دونوں اسی حیص بیص میں تھے کہ خلیفہ کا قاصد آیا اور اس نے کہا کہ اس شخص کا جرم خلیفہ نے معاف کر دیا ہے۔ اس پر خواجہ قطب عالمؒ نے فرمایا کہ دیکھو۔ اس شخص کی خوش عقیدگی نے اسے قتل سے صاف بچا لیا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ

"حضرت خواجہ مودود چشتیؒ کو جب اشتیاق خانہ کعبہ کا غالب ہوتا تو اسے فرشتے سرزمینِ چشت میں لے آتے کہ خواجہ صاحب زیارت سے مشرف ہوں"۔

راحت القلوب

اب سلیم اس مجموعہ کی طرف آؤ جو ان سب میں بڑا ہے یعنی 'راحت القلوب'۔ اس میں خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے وہ ملفوظات ہیں جنہیں خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے مرتب فرمایا تھا۔ خواجہ گنج شکرؒ اجودھن کے رہنے والے تھے۔ محرم ۶۶۸ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار پاکپتن (ضلع منٹگمری[1]) میں ہے۔ آپ کے لقب (گنج شکر) کی وجہ تسمیہ میں بہت سے اقوال ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ کہیں جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک بنجارہ گزرا جس کے بوروں میں شکر لدی ہوئی تھی۔ آپ نے پوچھا کہ بوروں میں کیا ہے۔ اس نے از راہِ ظرافت کہا کہ نمک ہے۔ گھر جا کر بورے اُلٹے تو ان سب میں نمک ہی نمک تھا۔ وہ روتا ہوا حاضرِ خدمت ہوا تو آپ نے فرمایا کہ بہت اچھا' وہ شکر تھی تو شکر ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ شکر بن گئی۔

ایک مجلس میں گفتگو دربارۂ خرقۂ درویش ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ

"جب رسولؐ اللہ معراج سے واپس آئے تو آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ مجھے فرمانِ الٰہی ہوا ہے کہ خرقۂ درویش اس شخص کو دوں جو میرے سوال کا جواب شافی دے۔ اس کے بعد آپ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ سے

[1] اب ساہیوال۔ (۱۹۸۳ء)۔

یہ سوال کیا کہ اگر یہ خرقہ تمہیں دے دیا جائے تو تم کیا کرو گے۔

حضرت صدیقؓ نے کہا کہ میں سب کچھ خدا کی راہ میں نثار کر دوں گا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں عدل و انصاف کروں گا۔ مظلوموں کی داد کو پہنچوں گا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میں حیا اور سخاوت اختیار کروں گا۔ لیکن ان میں سے کسی کا جواب اطمینان بخش نہ تھا۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرت علیؓ سے سوال کیا کہ اگر یہ خرقہ تمہیں دے دیا جائے تو تم کیا کرو گے۔ آپؓ نے جواب دیا کہ اگر مجھے خرقہ عطا کر دیا جائے تو میں بندگانِ خدا کی پردہ پوشی کروں گا۔ چنانچہ آپؐ نے وہ خرقہ حضرت علیؓ کو دے دیا۔"

ایک دفعہ فرمایا کہ

"خواجہ ابوسعید ابوالخیر ایک دفعہ ذکرِ خدا میں مشغول تھے کہ بال کی جڑ سے خون روانہ ہونے لگا۔ اہلِ خانہ نے ایک کاسہ چوبیں نشست کے نیچے رکھ دیا کہ جو خون بہے وہ کاسہ میں جمع ہو جائے۔ آپ کے جسم مبارک سے اس قدر خون رواں تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ کاسہ بھر گیا اور اہلِ خانہ نے وہ خون پی لیا۔"

ایک مجلس میں فرمایا کہ

"نواحِ غزنی میں میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ نہایت ضعیف اور لاغر تھے۔ ان کی عادت تھی کہ ہر شب ایک سو بیس رکعات نماز نفل ادا فرماتے تھے۔ لیکن عارضۂ شکم کی وجہ سے ہر دو رکعت کے بعد انہیں قضائے حاجت کی ضرورت ہوتی تھی۔ آپ قضائے حاجت کے واسطے تشریف لے جاتے۔ واپس آ کر غسل فرماتے اور دوگانہ ادا کرتے۔ پھر قضائے حاجت ہوتی اور غسل کرتے اور دوگانہ ادا کرتے۔ مختصراً یہ کہ اس شب وہ ساٹھ مرتبہ نہائے اور اپنا وظیفہ ادا کیا۔ آخر بار جب نہانے تشریف لے گئے تو میانِ آب انتقال فرمایا۔ سبحان اللہ! کیا مضبوط اور راسخ العقیدہ تھے۔"

ایک دفعہ فرمایا کہ

"جب مغلوں نے یمن کا محاصرہ کیا تو والیٔ یمن حضرت خواجہ ابواللیث کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی تھی۔ آپ نے وہ خلیفہ کو عطا فرمائی اور

اور ارشاد فرمایا کہ غروبِ آفتاب کے وقت مغلوں پر شبخوں مارنا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور جونہی وہ لکڑی لشکرِ مغل پر پھینکی انہیں ہزیمت واقع ہوئی اور وہ لڑتے لڑتے بھاگ گئے۔"

اسی طرح ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ ایک سیّاح نے مجھ سے یہ حکایت بیان کی تھی کہ میں نے شہر دمشق کو اجاڑ پایا، اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کے بعض باشندوں نے وظیفہ ترک کر دیا تھا۔ ناگاہ مغلوں کا لشکر ان کے شہر میں آیا اور شہر کو ویران کر دیا۔"

چونکہ سلیم! یہ ایک تاریخی بات ہے جو درمیان میں آ گئی ہے، اس لئے تمہاری اطلاع کے لئے اتنا بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یمن پر مغلوں کا حملہ بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ باقی رہا دمشق پر مغلوں کا حملہ۔ سو دمشق پر پہلی بار تیمور کے مغلوں نے حملہ کیا تھا جو خواجہ نظام الدین اولیاء سے قریب سو سال بعد کا واقعہ ہے۔

ایک مجلس میں فرمایا۔

"ایک نوجوان واصلانِ حق میں سے تھا۔ جب عمر اس کی تمام ہوئی ملک الموت نے اس کو شرق سے غرب تک ڈھونڈا لیکن نہیں پتہ پایا۔ مجبور اپنے مقام پر آ کر سجدہ میں سر رکھا، اور خدا سے درخواست کی وہ اس نوجوان کا پتہ بتا دیں۔ حکمِ خدا ہوا کہ اس نوجوان کو فلاں خرابہ میں تلاش کرو۔ لیکن ملک الموت کو اس کا وہاں بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے کہا اے ملک الموت! تم ہمارے دوستوں کی روح قبض نہیں کر سکتے اور نہ ان کو دیکھ سکتے ہو۔ وہ لوگ میرے پاس ہیں۔"

ایک مرتبہ فرمایا کہ

"شیخ جلال الدین رومی کبھی روم میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔ جب نماز کا وقت آتا آپ غائب ہو جاتے۔ آخر معلوم ہوا کہ آپ شرعاً و تعظیماً خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں۔" ایک جگہ لکھا ہے کہ "ایک جوگی حضرت (بابا فرید) کی خدمت میں آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ کوئی کرامت دکھاؤ۔ یہ سُن کر وہ ہوا میں اڑنے لگا۔ آپ نے اپنی جوتیاں ہوا میں چھوڑ دیں۔ وہ اس جوگی کے سر سے اونچی چلی گئیں۔ چنانچہ جوگی معترف ہوا کہ جس شخص کی جوتیوں کا یہ مرتبہ ہوگا وہ کس مرتبے کا ہوگا۔"

ایک مرتبہ آپ نے اپنی ریاضت کے متعلق بتایا کہ

"میں بیس سال عالمِ تفکر میں کھڑا رہا۔ بالکل نہیں بیٹھا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس بیس سال میں
میں نے کچھ کھایا ہو۔"

اس مجلس میں حضرت عمرؓ کے مناقب بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک دہی بیچنے والا راستے میں کھڑا رو رہا ہے۔ اس نے کہا کہ میرا دہی زمین پر گر گیا تھا۔ زمین اسے پی گئی ہے۔ کیا آپ اسے روا رکھ سکتے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے درہ اٹھا کر نعرہ مارا کہ زمین! تو دہی واپس دیتی ہے یا نہیں۔ یہ سنتے ہی زمین پھٹ گئی اور دہی اوپر نکل آیا۔ اس دہی والے نے اپنے سبوچہ کو دہی سے بھر لیا اور چل دیا۔"

اسی طرح فرمایا کہ "ایک دفعہ حضرت عمرؓ اپنا خرقہ سی رہے تھے اور پشت آپ کی جانب آفتاب تھی، پشت مبارک آپ کی تمازتِ آفتاب سے گرم ہوگئی تو آپ نے نگاہِ غضب سے آفتاب کی طرف دیکھا، معاً فرشتوں کو حکم ہوا کہ نورِ آفتاب کا محو کریں کہ حضرت عمرؓ کے ساتھ گستاخی سے پیش آیا ہے۔ فرشتوں نے فی الفور تعمیل کی اور نورِ آفتاب سے لے لیا۔ جملہ جہان تاریک ہوگیا۔ رسول اللہ اس زمانہ میں حیات تھے۔ از حد غمناک ہوئے۔ فرمانے لگے کہ شاید قیامت قائم ہوگئی جو نورِ آفتاب سے لے لیا گیا۔ یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت جبرئیلؑ نازل ہوئے اور بیان کیا کہ یارسول اللہ! قیامت قائم نہیں ہوئی بلکہ آفتاب کا نور حضرت عمرؓ کی گستاخی کی وجہ سے چھین لیا گیا ہے۔ رسول اللہ نے حضرت عمرؓ کو طلب فرمایا اور شفاعت کی۔ حضرت عمرؓ نے سورج کو معاف کر دیا۔ فی الفور جہان روشن ہوگیا۔"

ایک مجلس میں فرمایا کہ

> "عہدِ رسول اللہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص کے ہاں دو بچے توام پیدا ہوئے۔ یہ خبر آنحضرتؐ کو پہنچائی گئی اور عرض کیا گیا کہ ان کے جدا کرنے کی ترکیب فرمایئے۔ آپ متفکر تھے کہ حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے اور کہا کہ یارسول اللہ! ان کے سروں میں ایک ہی کنگھا کرنا چاہیئے، علیحدہ ہو جائیں گے۔ ایسا ہی کیا گیا اور وہ الگ الگ ہو گئے۔"

ایک مرتبہ فرمایا کہ سورہ ملک کا نام توریت میں ماثورہ ہے، اور ماثورہ کا ترجمہ (فارسی میں) عذابِ گور سے باز رکھنے والا ہے۔

اس مجلس میں فرمایا کہ "جب خواجہ عبداللہ سہیل تستری کا انتقال ہوا تو شہر میں یہودیوں کی ایک

جماعت سخت منکر تھی۔ ان میں سے ایک یہودی نے جنازہ سے قریب آکر کہا کہ اگر آپ مجھے اس وقت تلقین کریں تو میں مسلمان ہوتا ہوں اور میرے ساتھ ہزار آدمی اور مسلمان ہوں گے۔ وہ یہ بات پوری نہ کر چکا تھا کہ آپ نے کفن سے ہاتھ باہر نکالا اور دونوں آنکھیں کھول کر کہا: أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ چنانچہ اس پر وہ سب مسلمان ہو گئے۔"

اسی طرح جب خواجہ قطب الدین مودود چشتی کا انتقال ہوا ہے اور لوگوں نے چاہا کہ جنازہ اٹھائیں تو جنازہ خود بخود ہوا میں معلق ہو کر چلنے لگا۔ دفن کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ جنازہ کو فرشتے اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ بیان کر کے آپ نعرہ مار کر بے ہوش ہو گئے اور دیر تک بے ہوش رہے۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ

> "ایک روز حضرت رسولؐ مع اصحابؓ ایک جا متمکن تھے۔ معاویہؓ، یزید کو اپنے کندھے پر سوار کئے ہوئے گزرے۔ رسول اللہؐ نے تبسم کیا کہ سبحان اللہ! دوزخی بہشتی کے کندھے پر سوار ہے۔ یہ ارشاد والا حضرت علیؓ نے سنا۔ دریافت کیا، رسول اللہؐ! فرمائیے کہ پسر معاویہؓ کیونکر دوزخی ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ اے علیؓ! یزید بدبخت وہ ہے جو میرے حسنؓ و حسینؓ اور ان کی تمام اولاد کو شہید کرا دے گا۔ امیر المومنین حضرت علیؓ اٹھے اور تلوار میان سے کھینچی اور چاہا کہ یزید پلید کو مار ڈالیں۔ آنحضرتؐ مانع ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ حکم باری تعالیٰ کا ایسا ہی ہے۔ مخالفت تقدیر کی نہ کرنی چاہیئے۔"

سلیم! تمہاری اطلاع کے لئے اتنا بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یزید کی پیدائش ۲۶ھ میں ہوئی تھی۔ یعنی رسول اللہؐ کی وفات کے بھی سولہ برس بعد۔

راحتُ المحبّین

اب چند ایک مثالیں راحت المحبّین سے بھی سُن لو۔ یہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ہیں جنہیں امیر خسرو نے مرتّب کیا تھا۔ خواجہ صاحب بدایوں کے رہنے والے تھے۔ ۷۲۵ھ میں دہلی میں وفات پائی۔ وہیں آپ کا مزار ہے جہاں تم بیسوں مرتبہ گئے ہو۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ "آدم علیہ السلام بہشت سے کوہ سراندیپ میں (جو اب لنکا یا جزیرہ سیلون کے نام سے مشہور ہے) اُترے تین (سو) برس تک اپنی لغزش کی بنا پر روتے رہے۔ چنانچہ

گوشت پوست ان کے رخساروں کا بہہ گیا تھا۔ اور چڑیوں نے ان کے رخساروں پر گھونسلے بنا لئے تھے اور ان کو اس کی خبر تک نہ تھی آپ کے آنسوؤں سے زمین اس قدر تر ہو گئی کہ اس پر گھاس اگ آئی اور اتنی بلند ہو گئی کہ آپ کا وجود مبارک اس میں پوشیدہ ہو گیا۔"

ایک دفعہ فرمایا کہ "جس روز حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا ہے اور ایک بھیڑئیے کو پکڑ کر حضرت یعقوبؑ کی خدمت میں لے گئے کہ اس نے یوسفؑ کو ہلاک کیا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے اس بھیڑئیے سے پوچھا کہ تو نے یوسفؑ کو ہلاک کیا ہے؟ اس نے کہا کہ خیر (یعنی نہیں)۔ آپ نے دوبارہ اس سے دریافت کیا کہ تو جانتا ہے کہ یوسفؑ کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا۔ حضرت مجھے معلوم نہیں۔ اگرچہ میں جانور ہوں لیکن عیب جوئی اور عیب گوئی نہیں کرتا۔"

پھر فرمایا کہ "حضرت ایوبؑ نے خدا سے دُعا کی کہ مجھے بارہ ہزار زبانیں دے تاکہ ہر زبان سے تیرا ذکر کروں۔ اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور انہیں کیڑوں میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ ان کے جسم میں بارہ ہزار کیڑے تھے۔ حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا کہ وہ ہر رات میں ایک ہزار رکعت نماز نفل ادا کرتے تھے۔ اور قریب صبح سر سجدہ میں رکھ کر عاجزی کیا کرتے تھے۔ اس وقت آپ کے ہر بُن مُو سے خون جاری ہو جاتا اور ہر قطرہ سے جو زمین پر گرتا نقش تسبیح پیدا ہو جاتا۔ آپ کی کشتی کے متعلق فرمایا کہ اس کے لئے جبرئیلؑ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار تختے مہیا کئے، اور اس طرح ایک لاکھ چوبیس ہزار کیلیں آسمان سے نازل کیں۔ ہر تختے پر ایک نبی کا نام لکھا تھا۔ حضرت محمدؐ کے نام کے بعد چار تختے خالی رہ گئے۔ آپ نے کہا کہ اب ان پر کس کا نام لکھا جائے گا۔ وحی ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار یار ہوں گے۔ ان کے اسماء کے بغیر کشتی تیار نہیں ہو سکے گی۔ پھر فرمایا کہ آپؑ نے حضرت آدم کی نعش (جو صفا اور مروہ کے درمیان تھی) نکال کر اس کشتی میں رکھی۔ آپ کی کشتی میں ابلیس بھی سوار ہو گیا۔ آپ نے اسے نکالنا چاہا تو ارشادِ خداوندی ہوا کہ اسے نہ نکالو ہم نے اسے انقراضِ عالم تک مہلت دے رکھی ہے۔"

ایک مرتبہ فرمایا کہ

"حضرت عیسیٰؑ آخری زمانہ میں دنیا میں اتریں گے اور اپنے معجزہ سے ایک مردہ کو زندہ کریں گے۔ وہ ابوطالب ہوں گے۔" (ابوطالب حضرت علیؓ کے والد تھے)۔

ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کیا بات ہے کہ جب آدمی نماز میں مصروف ہوتا ہے اسے اگلی پچھلی

بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں. فرمایا کہ میں نے حدیث شریف کی کتب میں دیکھا ہے کہ اَلصَّلٰوۃ نُور. یعنی نماز روشنائی ہے. وقتِ نماز کوئی شے پنہاں نہیں رہ سکتی. پس آدمی جب نماز پڑھنے لگتا ہے تو اسے سب بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں.

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا کہ "آپ کے والد نے نمرود کے ڈر سے انہیں ایک غار میں پھینک دیا تھا چنانچہ آپ اس غار میں چودہ برس تک رہے. جس آگ میں آپ کو ڈالا گیا تھا اس کے متعلق فرمایا کہ اس کی تپش ساٹھ کوس تک جاتی تھی. نمرود کے متعلق فرمایا کہ جس مچھر نے اسے ہلاک کیا تھا وہ لنگڑا تھا."

حضرت یوسفؑ کے متعلق فرمایا "ایک مرتبہ انہوں نے حضرت یعقوبؑ کو دیکھ کر تعظیم کے لئے گھوڑے سے اترنا چاہا لیکن اس میں ذرا دیر لگ گئی. اس پر جبریلؑ تشریف لائے اور حضرت یوسفؑ سے کہا کہ تم نے گھوڑے سے اُترنے میں دیر لگادی ہے اس لئے تمہاری اولاد میں کوئی پیغمبر نہیں ہوگا."

حضرت سلیمانؑ کے متعلق فرمایا کہ "ان کے باورچی خانہ میں ستر ہزار اونٹ روزانہ نمک لاتے تھے. اور وہ روزانہ خرچ ہوجاتا تھا." حضرت موسیٰؑ کے متعلق فرمایا کہ جب وہ پیدا ہوئے تو فرعون نے ایک تنور گرم کرکے انہیں اس تنور میں ڈلوادیا."

ایک مرتبہ مجلس میں درود شریف کی فضیلت کا ذکر آگیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک روز حضرت عثمانؓ بازار سے مچھلی لائے اور اسے بریاں کرنا چاہا. مگر وہ بریاں نہ ہوتی تھی. جس قدر لکڑیاں انبار خانے میں جمع تھیں سب جل گئیں. لیکن وہ مچھلی اپنی اصلی حالت پر ہی رہی. وہ مچھلی رسول اللہؐ کے سامنے پیش کی گئی تو آپ کے دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ یا رسول اللہؐ! میں نے دریا میں ایک طائفہ دیکھا تھا جو آپ پر درود بھیجتا تھا. میں نے بھی ان کی موافقت میں ایک مرتبہ آپؐ پر درود بھیجا تھا. اللہ نے اس کی برکت سے مجھ پر آگ حرام کردی ہے. اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ مہتر جبرئیل نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ حضورؐ میں آپ کی اور آپ کی اولاد کی خدمت کرتا ہوں. امید ہے کہ آپ فردائے قیامت میں میرے حق میں سفارش فرمائیں گے اور اس روز مجھے فراموش نہ کریں گے.

ایک دفعہ حضرت صدیقِ اکبرؓ کے متعلق فرمایا کہ "ایک چیونٹی ان کے پاؤں تلے آکر مرگئی اور اس نے شدّتِ درد سے سخت آہ کھینچی. آپ نے چیونٹی کو اُٹھا کر خدا سے دُعا کی کہ اگر تیری بارگاہ میں میری کچھ بھی عزت ہے تو اس چیونٹی کو زندہ کردے. چنانچہ وہ چیونٹی اس وقت زندہ ہوگئی."

اسی طرح ایک مرتبہ آپؒ کنگھی کر رہے تھے کہ آپؒ کی داڑھی میں سے ایک بال ٹوٹا جسے ہوا اڑا کر یہودیوں کے قبرستان میں لے گئی۔ اس کی برکت سے تین دن تک عذاب ان کافروں پر نہ ہوا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ "ایک بڑھیا روتی ہوئی حضرت مودود چشتی کے پاس آئی اور عرض کیا کہ حضور میرے اکلوتے بیٹے کو بادشاہ نے ناحق مروا دیا ہے۔ آپ یہ سن کر سر دار تشریف لے گئے اور اس لڑکے کی لاش سے کہا کہ اگر تو ناحق مارا گیا ہے تو اُٹھ کھڑا ہو۔ لڑکا اسی وقت زندہ ہو گیا"۔

کہاں تک لکھتا جاؤں سلیم! اب تو میرا ہاتھ بھی تھک گیا ہے۔ یہ ہے نمونہ ان ملفوظات کا۔ زیادہ تفصیل سے دیکھنا چاہو تو انہیں خود دیکھ لو۔ اُمید ہے انہی اقتباسات سے تمہیں ان حضرات کی قرآنی معلومات اور علمی اور ذہنی سطح کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔

اپریل ۱۹۵۵ء

والسّلام

پرویز

تینتیسواں خط

تصوّف قرآن کی روشنی میں

اس سے پہلے دو خطوں میں سلیم! میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تصوّف کی ابتدائی تاریخ کیا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت دنیا کے مختلف گوشوں میں اس کی کیا حالت تھی۔ اسلام نے اس کے خلاف کس طرح صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن اس کے بعد یہ کس طرح مسلمانوں کے معاشرہ میں داخل ہو کر عین دین بلکہ "مغزِ دین" بن گیا۔ نیز یہ کہ ہمارے جلیل القدر صوفیائے کرام کے معتقدات کیا ہیں اور جو ملفوظات ان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں ان کی رُو سے ان کے علم کے متعلق کیا اندازہ ہوتا ہے۔ اب تمہارے آخری سوال کا جواب سامنے آتا ہے کہ جن اجزا سے تصوّف مرکّب ہے قرآن کی روشنی میں ان کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ اس کی رُو سے ان کی حقیقت کیا ہے۔ یہ مرحلہ ذرا دشوار گزار اور غور طلب ہے اس لئے اس خط کو زیادہ توجہ سے پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔

علم کے ذرائع

اصل سوال تک پہنچنے سے پہلے تمہیداً ایک بات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی اور علم حاصل کرنے کا طریقہ بتایا۔ یہ طریقہ کیا ہے؟ مسائل زیرِ نظر پر غور و خوض کرنا دوسروں کے افکار و خیالات کا مطالعہ کرنا۔ کتابوں کے ذریعے یا زبانی ______ فطرت کا مشاہدہ۔ تجربات کے ذریعہ حقائق تک پہنچنا۔ اس میں اقوامِ سابقہ کے تجربات بھی شامل ہیں جسے تاریخ کہا جاتا ہے۔ یہی وہ ذرائع ہیں جن کی رُو سے فراہم شدہ معلومات پر انسان (عقل و فکر سے) غور و تدبر کرے تو اسے علم حاصل ہوتا (یا اس کے علم میں اضافہ ہوتا) ہے۔ یہ طریقِ علم ہر انسان کے لئے کھلا ہے۔ اس میں جس قدر کوئی محنت کرے گا اتنا ہی اس کا علم زیادہ ہوتا جائے گا۔

وحی لیکن علم کا ایک اور ذریعہ بھی ہے جو ان تمام ذرائع سے یکسر الگ اور منفرد ہے۔ وہ یہ کہ خدا کسی انسان کو براہِ راست حقائق کا علم عطا کر دے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں "وحی" کہا جاتا ہے اور یہ حضرات انبیاء کرامؑ سے مخصوص و مختص ہے[1]۔ یعنی خدا کی طرف سے اس طرح علم عطا ہونے کو وحی کہا جاتا ہے اور جسے یہ علم عطا ہو اسے نبی کہتے ہیں۔ بلا ذریعہ اور بلا واسطہ علم حاصل ہونے کی یہ استثناء صرف نبی کے لئے ہے۔ غیر از نبی اس میں قطعاً شریک نہیں ہو سکتا۔

جس انسان (نبی) کو خدا کی طرف سے یہ علم ملتا ہے اس میں اس کے کسب و ہنر کو کوئی دخل نہیں۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ (دیگر علوم کی طرح) اس علم کو (بھی) محنت اور ریاضت سے حاصل کر لے یا اس میں اضافہ کر سکے۔ محنت اور ریاضت سے حاصل کرنا تو ایک طرف، اسے وحی ملنے سے پہلے اس کا علم و احساس بھی نہیں ہوتا کہ اسے وحی ملنے والی ہے۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن میں ہے کہ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ اس طرح ہم نے تیری طرف (اے رسولؐ!) اپنے امر کو بذریعہ وحی نازل کیا۔ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (۴۲/۵۲) تو جانتا نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے؟ دوسرے مقام پر ہے۔ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (۲۸/۸۶) تو اس کی اُمید ہی نہیں کر سکتا تھا کہ تیری طرف کتاب آئے گی۔ یہ صرف تیرے پروردگار کی رحمت ہے (کہ تجھے وحی عطا ہوئی ہے)۔

وحی کا یہ سلسلہ حضرات انبیاء کرامؑ کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ تا آنکہ قرآن میں پیغامِ خداوندی کی تکمیل ہو گئی۔ اس نے وحی کے ذریعے جو ہدایت انسانوں تک پہنچانی تھی وہ مکمل ہو گئی۔ اس میں نہ تغیر و تبدل کی ضرورت باقی رہی اور نہ حک و اضافہ کی۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ تیرے ربّ کی باتیں صدق اور عدل کے ساتھ اتمام تک پہنچ گئیں۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (۶/۱۱۶) اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ وحی کا لفظ قرآن میں اور معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن ہماری مراد اس علم سے ہے جو خدا کی طرف سے انسانوں کی راہنمائی کے لئے براہِ راست ملتا تھا۔

ختمِ نبوّت

سلسلۂ ہدایت تکمیل تک پہنچ گیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا.
اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (۱۵/۹) یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں. اس کے بعد خدا نے اعلان کر دیا کہ حضور نبیٔ اکرمؐ خاتم النّبیّین ہیں (۳۳/۴۰) آپؐ کی ذات پر سلسلۂ نبوّت ختم ہو گیا.

سلسلۂ نبوّت کے ختم ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو خاص ذریعۂ علم تھا (جس میں کسی انسان کو خدا کی طرف سے عام ذرائع علم کے بغیر براہِ راست علم حاصل ہوتا تھا) اس کا دروازہ بند ہو گیا. ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اگر (نبیٔ اکرمؐ کے بعد) کوئی شخص اس کا دعوےٰ کرے کہ اسے خدا کی طرف سے براہِ راست علم عطا ہوتا ہے، تو وہ شخص نبوّت کے بند دروازے کو کھولنے کا مدعی ہے. یہ بات بالکل واضح ہے جس میں کسی التباس یا ابہام کی کوئی گنجائش نہیں. قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ اس کے بعد کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم مل سکے گا. اس میں (نبیٔ اکرمؐ کے بعد) کسی شخص کی طرف وحی یا الہام کئے جانے کے امکان کا کوئی ذکر نہیں.

لیکن تصوّف کی ساری عمارت اس بنیاد پر اٹھتی ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد بھی، انسانوں کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہو سکتا ہے (اور ہوتا ہے). اس علم کو (وحی کی بجائے) الہام یا کشف کہا جاتا ہے اور جسے یہ علم ملتا ہے اسے (نبی کے بجائے) ولی یا صوفی کہتے ہیں. اس مختصر سی تشریح ہی سے تم نے دیکھ لیا ہو گا سلیم! کہ تصوّف کا دعویٰ بالفاظِ دیگر نبوّت کا دعوےٰ ہے. اس کا نام وحی کے بجائے الہام یا کشف، اور اس کے مدعی کا نام نبی کے بجائے ولی، رکھ لینے سے کچھ فرق نہیں پڑتا. شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی کے یہ دعاوی تمہاری نظروں سے گذر چکے ہیں کہ

> "جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسانِ کامل، غوث، قطب لیتے ہیں.....
> .....اگرچہ اولیاء انبیاء کے تابع ہوتے ہیں لیکن صاحبِ وحی دونوں ہوتے ہیں.......
> ایک طور پر مادۂ کشف و الہام اور مادۂ وحیٔ رسول ایک ہے...... صاحبِ کشف، اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النّبیّین کے موافق ہے
> .....ان کا اللہ تعالیٰ سے عین رسول اللہؐ کا لینا ہے..... خدا تعالیٰ ایسے خلیفہ کو وہی احکامِ شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر انبیاء کو دیئے گئے تھے." (فصوص الحکم)

میں نہیں سمجھتا کہ ان تصریحات کے بعد اس ضمن میں کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ دعویٰ الہام اور دعویٰ نبوت اصل کے اعتبار سے ایک ہی ہے (یہی وہ دروازہ ہے جس سے مرزا غلام احمد قادیانی نبوت کی کرسی پر بیٹھنے کے لئے داخل ہوئے تھے)۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وحی اور الہام میں فرق یہ ہے کہ وحی کے ذریعے حاصل شدہ علم یقینی ہوتا ہے اور الہام کی رُو سے حاصل شدہ علم میں شک کی گنجائش ہو سکتی ہے. لیکن یہ محض اعتراض سے بچنے کے لئے ایک آڑ وضع کر لی گئی ہے. اس میں وزن کچھ نہیں. اگر الہام خدا کی طرف سے عطا شدہ علم ہے تو اس میں شک و شبہ کا کیا سوال؟ اور اگر اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہے تو وہ علم خدا کی طرف سے عطا شدہ ہو نہیں سکتا. بعض کہہ دیتے ہیں کہ اس علم میں تو شک و شبہ نہیں ہوتا لیکن صاحبِ الہام کو اس کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگ جاتی ہے. ظاہر ہے کہ یہ چیز صاحبِ الہام کی ناپختگی کی دلیل ہے. جب وہ پختگی کے مقام پر پہنچ جائے (جسے ابن عربی نے انسان کامل یا غوث اور قطب سے تعبیر کیا ہے) تو وہ اپنے الہام کے سمجھنے میں بھی غلطی نہیں کرے گا. جب صورت یہ ہے کہ خدا اسے "وحی احکامِ شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر انبیاء کو دیئے گئے تھے" تو اس قسم کا صاحبِ الہام یقیناً پختگی کے مقام تک پہنچا ہوا ہوگا. ورنہ ایسے شخص کو اس قسم کا علم رکھنے سے کیا حاصل جو اسے صحیح طور پر سمجھ ہی نہ سکے؟

اب تم پوچھو گے کہ ہمارے ہاں "کشف و الہام" کا تصور آ کہاں سے گیا؟

تصوّر کہاں سے آیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں سے تصوف کا تصور آیا وہیں سے کشف و الہام کا تصور آگیا. قرآن میں نہ وہ ہے، نہ یہ. قرآن میں کشف کا لفظ ان معانی میں کہیں نہیں آیا. باقی رہا الہام، تو (ل. ہ. م) کے مادہ سے ایک جگہ لفظ اَلْهَمَهَا آیا ہے. سورہ الشمس میں ہے. وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (۸-۹۱/۷) "لھم" کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے اندر کسی چیز کو رکھ دینا. آیت کے معنی یہ ہیں کہ نفسِ انسانی اور وہ موثرات جو اسے سنوارتے اور اس کی تکمیل کرتے ہیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اس کے اندر اس کا

لے یہ تمام باتیں تفصیلاً اس سے پہلے ایک خط میں لکھی جا چکی ہیں جو طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا. (یعنی خط ۳۱)۔

فجور اور اس کا تقویٰ رکھ دیئے گئے ہیں. یعنی اس کے اندر بگڑنے اور بننے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے. سارے قرآن میں یہی ایک مقام ہے جہاں اَلْھَمَ کا لفظ آیا ہے. اسے اُس "الہام" سے کیا تعلق ہے جس پر تصوّف کی عمارت استوار ہوتی ہے؟

یاد رکھو سلیم! ختمِ نبوّت کے بعد، علمِ انسانی کا ذریعہ عقل و فکر ہے. باقی رہا خدا کی طرف سے براہِ راست انکشافِ حقیقت. سو وہ قرآن کے اندر محفوظ ہے. اور قرآن غور و تدبّر سے سمجھ میں آتا ہے. بالفاظِ دیگر ختمِ نبوّت کے بعد علم کے ذرائع ہیں. قرآنِ کریم اور فہم و تدبّر.

میں نے اوپر کہا ہے کہ کسی شخص کا یہ دعوےٰ کہ اسے خدا کی طرف سے براہِ راست حقائق کا علم ہوتا ہے، دعویٰ نبوّت ہے. لیکن ایک نہج سے دیکھئے تو اس قسم کا مدّعی اپنے آپ کو انبیاء سے بھی اونچا لے جاتا ہے. انبیاء کی یہ کیفیت ہے کہ جب اللہ انہیں کسی حقیقت کا علم دے دیتا ہے تو وہ اس علم کو پا لیتے ہیں. جب وہ وحی نازل نہیں کرتا تو یہ بے بس ہوتے ہیں. وحی کا لے آنا (یعنی خدا سے براہِ راست علم حاصل کر لینا) ان کے اپنے بس کی بات نہیں ہوتی. اس کے برعکس تصوّف کا دعویٰ یہ ہے کہ ایک شخص اپنے کسب و ہنر سے اپنے اندر یہ قوّت پیدا کر لیتا ہے کہ وہ خدا سے براہِ راست علم حاصل کر لے. اب ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی محنت سے اپنے اندر اتنی قوّت پیدا کر لیتا ہے کہ وہ مستور حقائق کو بے نقاب دیکھ لے وہ اس شخص سے (معاذ اللہ) یقیناً بلند درجے پر ہوتا ہے جو اس انتظار میں رہے کہ خدا اس کی طرف وحی بھیجے تو اسے حقیقت کا علم ہو.

تم نے دیکھا سلیم! تصوّف کا دعویٰ بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے!

اب آگے بڑھو. تصوّف کا دوسرا دعوےٰ (یا یوں سمجھو کہ پہلے دعوےٰ کا فطری نتیجہ) یہ ہے کہ اس سے غیب کی باتوں کا علم حاصل ہو جاتا ہے.

غیب کا علم غیب کے علم کے متعلق قرآنِ کریم میں (بزبان نبیٔ اکرمؐ) کہا گیا ہے کہ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ (۱۰/۲۰) ان سے کہہ دے کہ غیب کا علم صرف خدا کے لئے ہے." دوسری جگہ ہے. قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (۲۷/۶۵) "ان سے کہہ دو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو." اور اور تو اور، خود نبیٔ اکرمؐ نے اس کا اعلان فرمایا کہ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ

وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ (۱۱/۳۱) "میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ ہی یہ کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں"۔

قرآن کی ان تصریحات سے واضح ہے سلیم! کہ غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔ البتہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو وحی کے ذریعے بعض امورِ غیب کا علم دے دیتا تھا۔ سورہ الجن میں ہے عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا۔ خدا عالم الغیب ہے۔ وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دیتا کہ کوئی شخص اس کے علمِ غیب پر قدرت (یا غلبہ) حاصل کرلے۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (۲۷-۷۲/۲۶) ہاں! جسے وہ رسول بنانا پسند کرے تو اس کی طرف علومِ غیب کی وحی کر دیتا ہے۔ مثلاً قرآن میں حضرت مریمؑ کے کوائف حیات بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ (۳/۴۴) یہ غیب کی باتیں ہیں جو تیری طرف وحی کی گئی ہیں۔ (نیز ۱۱/۴۹؛ ۱۲/۱۰۲)۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص غیب جاننے کا دعوےٰ کرتا ہے (پیشگوئیاں بھی اسی میں داخل ہیں) تو یا تو وہ دعوئے نبوت کرتا ہے (کیونکہ قرآن کی رُو سے غیب کا علم اللہ کی طرف سے صرف حضرات انبیائے کرامؑ کو دیا جاتا تھا) اور یا جھوٹ بولتا ہے (کیونکہ انبیاء کے علاوہ کسی اور کو غیب کا علم دیا نہیں جاتا)۔ اگر وہ دعوےٰ نبوت کرتا ہے تب بھی وہ جھوٹا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باب نبوت بند ہو چکا ہے۔

خدا کو دیکھنا

اب اور آگے بڑھو۔ تصوف کا دعوےٰ یہ ہے کہ صاحبِ کمال صوفی، خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ وہ ہر شب اللہ کے دربار میں حاضر ہوتا ہے اور وہاں سے اپنے فیصلوں پر صاد کرا کر لاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں۔ وہ خدا سے جھگڑتا ہے اور اپنی بات منوا کر رہتا ہے۔ قرآن کی رُو سے یہ تمام دعاوی باطل ہیں۔ جہاں تک خدا کو دیکھنے کا تعلق ہے قرآن کا ارشاد ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ز وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ج وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۝ (۶/۱۰۴) "نگاہیں اسے نہیں پاسکتیں۔ اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ وہ نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ بڑا باریک بین، باخبر ہے"۔ اور تو اور، اگر کسی نبی کے دل میں بھی اس کی آرزو پیدا ہوئی کہ وہ خدا کو دیکھ سکے تو اسے بھی کہہ دیا گیا کہ لَنْ تَرٰىنِیْ (۷/۱۴۳) "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا"۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق بھی قرآن میں کہیں نہیں کہ حضورؐ نے خدا کو

دیکھا تھا۔ قومِ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے اس قسم کا مطالبہ کیا تھا جب کہا تھا کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (۲/۵۵) "ہم تیری بات نہیں مانیں گے جب تک خدا کو کھلے بندوں نہیں دیکھ لیں گے"۔ اس تقاضے کے جواب میں جو کچھ ہوا قرآن اس پر شاہد ہے۔ ان حالات میں کسی کا یہ کہنا کہ وہ ذاتِ خداوندی کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھتا ہے قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔

معرفت خدا کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھنے کی رُو سے تصوّف کا مطالبہ ایمان کا نہیں، عرفان (معرفت) کا ہے۔ یعنی خدا کو ماننا نہیں بلکہ خدا کو پہچاننا۔ خدا کو پہچاننے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم کائنات (اور قرآن کریم) پر غور و تدبّر سے خدا کی خلّاقیت اور دیگر صفات کا علیٰ وجہ البصیرت اندازہ کریں اور اس طرح خدا کو پہچانیں۔ اس فکری طریق سے خدا کے متعلق اندازہ کرنے میں بھی انسان غلطی کر سکتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے ایسے لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (۶/۹۲) "انہوں نے خدا کے متعلق ویسا اندازہ نہیں لگایا جیسا اندازہ لگانے کا حق تھا"۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے متعلق جو کچھ بتانا تھا اسے وحی کے ذریعے (قرآنِ کریم میں) بتا دیا۔ اس میں بھی اس نے صرف اپنی صفات کے متعلق بتایا ہے۔ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ اس لئے کہ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت اور ماہیّت و کیفیّت کا سمجھنا ذہنِ انسانی کے لئے ناممکن ہے۔ محدود ادراک، لامحدود کی کنہ و حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ قرآن نے ذاتِ خداوندی پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کے عرفان کا مطالبہ کہیں نہیں کیا۔ اور تو اور، خود نبیٔ اکرمؐ کے متعلق بھی قرآن میں کہیں نہیں آیا کہ حضورؐ نے خدا کی "معرفت" حاصل کر لی تھی۔ اس کی ذات کا ادراک تو ایک طرف، اسے کسی مثال سے بھی نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اس لئے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲/۱۱)۔ خود خدا کا ارشاد ہے۔ علاوہ بریں اس نے اپنی جو صفات بیان کی ہیں ان کے علاوہ اگر انسان اپنے ذہن سے اس کی کوئی اور صفت بیان کرنا چاہے تو قرآن اسے بھی صحیح قرار نہیں دیتا اور کہہ دیتا ہے کہ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (۲/۱۰۱) (دیگر مقامات)۔ "لوگ جو کچھ اس کے متعلق کہتے ہیں وہ اس سے بلند اور پاک ہے"۔ لہٰذا جس خدا کی یہ کیفیّت ہو اس کے متعلق یہ دعوےٰ کہ ہم ذاتِ خداوندی کو دیکھتے اور پہچانتے ہیں، قرآن کی تعلیم کے

منافی ہے۔ انسان نہ تو خدا کی ذات کا مشاہدہ کر سکتا ہے نہ (ان معنوں میں) اس کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

مُرادیں پُوری کرنا

تم نے کبھی اس پر غور کیا سلیم! کہ پیروں فقیروں کے گرد اس قدر ہجوم کیوں رہتا ہے؟ اس لئے کہ یہ "لوگوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں" یہ جس سے بگڑ جاتے ہیں اسے تباہ کر دیتے ہیں۔ جس سے خوش ہو جاتے ہیں اس کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ یہ لوگوں کو اولاد دیتے ہیں۔ شفا عطا کرتے ہیں۔ دولت بخشتے ہیں۔ منصب و مراتب دلاتے ہیں مقدمات ان کے حق میں فیصل کراتے ہیں۔ ان کے دشمنوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ غرضیکہ ان کی سب مرادیں پوری کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ کوئی شخص کسی کو نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ نفع اور نقصان کے لئے اللہ نے محکم اور اٹل قوانین اور اسباب مقرر کر رکھے ہیں۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو نفع یا نقصان ان اسباب کے ذریعے ہی پہنچا سکتا ہے۔ ان سے الگ ہٹ کر کسی کو نفع یا نقصان پہنچانا کسی کے اختیار میں نہیں۔ اور تو اور خود نبیٔ اکرمؐ سے کہلوا دیا گیا کہ قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا (۷۲/۲۱) "ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے لئے کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا" دوسروں کے لئے تو ایک طرف، خود اپنی ذات کے لئے بھی نہیں۔ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ ان سے کہہ دو کہ میں اپنے آپ کے لئے کسی بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا' یہ سب اللہ کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَا سْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۛۚ وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛۚ (۷/۱۸۸) "میں اگر غیب جانتا تو اپنے لئے دنیا بھر کے مفاد جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف چھو بھی نہ سکتی" لیکن مجھے اس پر کوئی اختیار نہیں۔ یہ سب کچھ خدا کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے جن میں کوئی شخص تغیّر و تبدّل نہیں کر سکتا۔ نہ ہی ان کے نتائج کو روک سکتا ہے۔

میں نے تمہیں بتایا تھا سلیم! کہ علمائے عمرانیات کی تحقیق کی رُو سے' انسان پر پہلا دَور یہ آیا تھا کہ جب وہ کسی بڑی قوت سے ڈرتا تو اس کے سامنے گڑگڑانے لگ جاتا۔ ہاتھ جوڑتا' پاؤں پڑتا' منت و خوشامد کرتا۔ اور اس طرح اسے راضی کرنے کی کوشش کرتا۔ اسے عہدِ پرستش AGE OF WORSHIP کہتے ہیں۔ (یاد رکھو! سلیم یہ گفتگو اس انسان کے متعلق ہو رہی ہے جس تک وحی کی

روشنی نہیں پہنچی تھی یا پہنچی تھی تو اس نے اسے گم کر دیا تھا)۔ اس کے بعد ان میں کچھ سیانے پیدا ہو گئے

عصرِ سحر

جنہوں نے ان سے کہا کہ ان بڑی قوتوں سے ڈرنے اور خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہیں ایسے طریقے بتاتے ہیں جن سے یہ قوتیں مجبور ہو کر تمہاری مرضی کے مطابق کام کرنے لگ جائیں۔ اس کے لئے انہوں نے جنتر منتر، گنڈے تعویذ، ٹونے ٹوٹکے، چلّے، مراقبے وغیرہ ایجاد کئے۔ اسے عصرِ سحر AGE OF MAGIC کہتے ہیں۔ تصوّف اس "عصرِ سحر" کی یادگار ہے۔ اس میں سمجھایا جاتا ہے کہ "ولی اللہ" میں ایسی قوّت ہوتی ہے کہ وہ خدا کے قانون کے خلاف، جو کچھ چاہے کر دے۔ یہی عقیدہ لوگوں کو ان کے گرد جمع کرتا اور ان سے سجدے کراتا ہے۔

مُردوں کی پرستش

پیروں فقیروں کی اس قوّت اور اختیار کے متعلق اتنا ہی نہیں سمجھا جاتا کہ وہ ان کی زندگی تک محدود ہے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے اختیارات کی وسعتیں اور بھی بڑھ جاتی ہیں اور ان کی قبریں مرجع انام بن جاتی ہیں۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ قائم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے تمام حالات سے باخبر ہیں۔ ہماری سب باتیں سنتے ہیں اور دلوں کے حالات تک سے واقف ہیں۔ ہماری فریاد سنتے ہیں اور مدد بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سُن نہیں سکتے۔ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ اور اگر وہ تمہاری پکار سُن بھی لیتے تو وہ اس کا جواب نہ دے سکتے۔ (۳۵/۱۴)۔ وہ تمہاری کیا سنیں گے۔ انہیں تو خود اپنے متعلق بھی اتنا علم و شعور نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ؁ (۱۶/۲۱)۔

یہ ہے سلیم! قرآن کی رُو سے (زندہ اور مُردہ) "پیروں فقیروں" کے اختیارات کا عالم جن کے متعلق تصوّف کی رُو سے عقیدہ یہ ہے کہ خدا کے محکمہ قضا و قدر پر انہی کا تصرّف ہوتا ہے اور زمین کے اوپر جس قدر (زندہ) مخلوق بستی ہے ان کے تمام معاملات کا فیصلہ زیرِ زمین بسنے والی (مردہ) دنیا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ تم نے "مُردہ بدست زندہ" کا محاورہ سُنا ہو گا۔ لیکن تصوّف میں اس کے اُلٹ ہوتا ہے۔ وہاں کا قانون یہ ہے کہ "زندہ بدست مُردہ"۔

اَوْلِيَاءَ اللهِ

تصوّف کی رُو سے اولیاء اللہ کا ایک الگ گروہ مانا جاتا ہے۔ ان کی خصوصیات عام جماعتِ مومنین سے مختلف ہوتی ہیں اور ان کی پہچان کے طریقے بھی الگ ہوتے ہیں. یہ تصوّر بھی قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے. قرآنِ کریم مومنین ہی کو "اولیاء اللہ" (اللہ کے فرمانبردار بندے یا اللہ کے دوست) کہہ کر پکارتا ہے. سورۂ یونس میں ہے. اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. اس حقیقت سے آگاہ رہو کہ اللہ کے فرمانبردار بندے، اس کے دوست، وہ ہیں جن پر نہ کسی قسم کا خوف ہوتا ہے نہ حزن. اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ (۶۳ - ۶۲/۱۰). (یہ کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا) یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں. اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی سلیم! کہ اولیاء اللہ مومنین اور متّقین ہی کا دوسرا نام ہے. ان لوگوں کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا. نیز (۶۹ - ۶۸/۴۳).

اولیاء اللہ کی زندگی

تصوّف کی رُو سے "اولیاء اللہ" کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں. یہ دنیا، دنیاداروں کے لئے ہوتی ہے ــــ "اللہ والوں" کی دنیا، روحانی دنیا ہوتی ہے. اللہ والے اس دنیا میں غریب و محتاج، بیکس و بےبس، مفلوک الحال، خستہ و خراب رہتے ہیں. شکستہ جھونپڑی، پھٹے پرانے کپڑے، ایک مٹکا، ایک پیالہ، ایک کشکول، یہ کل متاعِ حیات. لیکن اپنی روحانی دنیا کے بادشاہ. قرآن اس کے برعکس کہتا ہے کہ اولیاء اللہ کی نشانی یہ ہے کہ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ. ان کے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی خوشخبریاں اور خوشحالیاں ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی. اس کے بعد ہے لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ. اللہ کی ان باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی. یعنی اولیاء اللہ کی اس دنیا کی زندگی کو نہایت شگفتہ و شاداب ہونا چاہیئے. یہ خدا کا غیر متبدّل قانون ہے. ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۰/۶۴) یہ بہت بڑی کامیابی اور کامرانی ہے.

تم نے دیکھا سلیم! کہ قرآن کی رُو سے

(۱) اولیاء اللہ کی کوئی الگ جماعت نہیں ہوتی.

(۲) وہ مومنین ہی کو اولیاء اللہ کہتا ہے. اور

(۳) ان کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ ان کی اس دنیا کی زندگی بڑی شگفتہ و شاداب ہوتی ہے. (اس نکتہ

کی مزید وضاحت ذرا آگے چل کر بیان کی جائے گی)۔

تزکیۂ نفس

تصوّف کا دعویٰ یہ ہے کہ جو طریق اس نے تجویز کیا ہے اس سے انسان کا "تزکیۂ نفس" ہو جاتا ہے۔ پہلے تم اس اصطلاح کا مفہوم سمجھ لو۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی روح، خدا کی ذات کا ایک حصّہ ہے جو اپنے اصل سے الگ ہو کر مادہ کے دلدل میں پھنس چکی ہے۔ اسے ان آلائشوں سے پاک و صاف کرنا، تاکہ یہ اپنی اصل سے جا کر مل جائے مقصودِ حیات ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک "تزکیہ" کے معنی ہیں انسانی روح کا مادّی آلائشوں سے پاک کرنا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھو سلیم! کہ انسانی رُوح کے متعلق یہ تصوّر (کہ وہ ذاتِ خداوندی کا حصّہ ہے جو اپنی اصل سے الگ ہو کر مادی غلاظتوں سے ملوّث ہو چکی ہے) کس قدر قرآن کے خلاف ہے! ذات PERSONALITY انسان کی ہو یا خدا کی، ناقابلِ تقسیم وحدت INDIVISIBLE WHOLE ہوتی ہے جس کے حصّے بخرے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے یہ کہنا یکسر خلافِ حقیقت ہے (اور قرآن سے اس کی کوئی سند نہیں مل سکتی) کہ انسانی روح ذاتِ خداوندی کا حصّہ ہے۔

کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے

پھر مادہ MATTER کو اس قدر غلیظ اور قابلِ نفرت سمجھنا، قرآنی تعلیم سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ قرآن اس ذہنیت اور تصوّر کو کفر سے تعبیر کرتا ہے، وہ مادی کائنات کے متعلق کہتا ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں اور ان کے درمیان میں جو کچھ ہے ہم نے اسے باطل نہیں پیدا کیا"۔ یعنی اس کا قابلِ نفرت (غلیظ اور ناپاک) ہونا تو ایک طرف یہ بے کار اور رائیگاں بھی نہیں۔ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا "یہ ان لوگوں کا ظن ہے جو کفر کرتے ہیں۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (۳۸/۲۷) سو جو لوگ (اس طرح) کفر کرتے ہیں جہنّم کی آگ کی وجہ سے ان کی تباہی ہے"۔ تم نے غور کیا سلیم! قرآن نے کیا بات کہی؟ اس کا کہنا یہ ہے کہ جو لوگ اس مادی دنیا کو باطل سمجھتے ہیں وہ مومن نہیں، کافر ہیں۔ اور تصوّف کی بنیاد ہی اس تصوّر پر ہے کہ دنیا باطل ہے۔ اس سے دُور بھاگنا اور روح کو اس کی آلائشوں سے پاک و صاف کرنا مقصودِ زندگی ہے۔

"تزکیۂ نفس" کے معنی انسانی ذات کو مادی آلائشوں سے پاک اور صاف کرنا نہیں۔ اس کے

تزکیۂ نفس کا قرآنی مفہوم

معنی انسانی ذات کی نشوونما GROWTH OR DEVELOPMENT ہیں۔ قرآن کی رُو سے انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ، انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ یہ نشوونما، مال و دولت سے نفرت کر کے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے سے نہیں ہو سکتی۔ قرآن کی رُو سے اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان انتہائی محنت سے مال و دولت کمائے اور پھر اسے دوسرے انسانوں کی پرورش کے لئے عام کر دے۔ سورۃ والّیل میں ہے کہ جہنم کے عذاب سے محفوظ وہ رہے گا اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی (۹۲/۱۸) جو اپنے مال کو (بلکہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس میں سے اپنی ضروریات کے مطابق رکھ کر باقی سب کچھ) دوسروں کی پرورش کے لئے دے دے تاکہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما (تزکیہ) ہو جائے۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن کی رُو سے تزکیۂ نفس کا طریقہ کیا ہے؟ کما کر دوسروں کی پرورش کے لئے عام کرنا۔ نہ یہ کہ دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنا۔ جو شخص اپنے آپ کو فقیر (صوفی کہتا ہے، وہ خواہ چوبیس گھنٹے میں ایک بار جَو کی روٹی ہی کیوں نہ کھائے، وہ ہوتی تو دوسروں کی کمائی کی ہے۔ یہ چیز دنیا سے نفرت کرنے کا لازمی نتیجہ ہے کہ انسان مال و دولت نہ کمائے۔ بہرحال یہ ہے "تزکیۂ نفس" کا وہ مفہوم اور وہ طریقہ جو قرآن بتاتا ہے۔ اور وہ ہے وہ مفہوم اور وہ طریقہ جو تصوّف کے ہاں سے ملتا ہے۔ فرق ان دونوں کا تمہارے سامنے ہے۔ سب سے بڑی چیز یہ کہ تصوّف، رہبانیت کی زندگی سکھاتا ہے۔ یعنی انفرادی زندگی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تصوّرِ حیات عیسائی راہبوں کا وضع کردہ ہے، خدا کا متعین فرمودہ نہیں (۵۷/۲۷)۔

اجتماعی زندگی

خدا نے جماعتِ مومنین کو "اُمّت" بنایا ہے (۳/۱۰۹)۔ انہیں اجتماعی زندگی کے طور طریقے سکھائے ہیں۔ ان سے تاکید کی ہے کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (۸۹/۲۹) میری جنّت میں داخل ہونا چاہتے ہو تو انفرادی زندگی مت بسر کرو۔ میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو کر، اجتماعی زندگی بسر کرو۔ اس سے تم جنّت میں جانے کے قابل ہو سکو گے۔ اس دنیا میں بھی، اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی۔ لہٰذا تزکیۂ نفس انفرادی زندگی سے نہیں ہونا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا میں ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو قوانینِ خداوندی کو عملاً نافذ کرے اور اس طرح تمام افراد کی نشوونما ہوتی جائے۔

اب سلیم! تم تصوّف کے اس گوشے کی طرف آؤ، جو اس کی اصل و بنیاد ہے۔ اس گوشے کو

سمجھنے کے لئے اس کہانی کو یاد کرو جو میں نے پچھلی گرمیوں میں تمہیں سنائی تھی اور جو دبستانِ تصوف میں داخل ہونے والے "طالب علم" کو پہلے دن یاد کرائی جاتی ہے۔ کہانی یہ ہے کہ ایک بزرگ تھے صاحبِ کمال، اور ایک تھا ان کا مرید۔ یہ دونوں دریا کے اس پار رہتے تھے اور ان کی خانقاہ دریا کے اس پار تھی۔ یہ ہر روز صبح اٹھتے اور خانقاہ کا رُخ کر لیتے۔ آگے آگے پیر، پیچھے پیچھے ان کا مرید۔ جہاں سے انہوں نے دریا پار کرنا ہوتا تھا وہاں نہ پُل تھا نہ کشتی۔ لیکن پیر صاحب لبِ دریا آتے اور رواں دواں

وسیلہ

دریا پر چلتے چلے جاتے (جیسے سڑک پر چل رہے ہیں)۔ ان کے پیچھے ان کا مرید بھی دریا پر گامزن ہو جاتا۔ اس لئے کہ انہوں نے اسے بتا رکھا تھا کہ جب دریا آئے تو تم میرا نام لے کر پانی پر قدم رکھ دینا اور جب تک اس پار نہ پہنچ جاؤ میرا نام لیتے چلے جانا۔ برسوں اسی طرح گزر گئے۔ صبح دریا کو اِدھر سے اُدھر اور شام کو اُدھر سے اِدھر پار کر لیتے۔ آگے آگے پیر، پیچھے پیچھے پیر کا نام جپتے ہوئے مرید۔

ایک دن عین دریا کے بیچ میں پہنچ کر پیر صاحب نے دیکھا کہ ان کا مرید ان کے پیچھے پانی میں غوطے کھا رہا ہے اور چلا رہا ہے کہ یا حضرت! بچا ئیو۔ انہوں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑا اور دریا کے پار لے گئے۔ وہاں جا کر پوچھا کہ آج کیا ہوا تھا جو تم ڈوبنے لگے تھے؟ اس نے دست بستہ کہا کہ حضور! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ میں ہر روز دیکھتا تھا کہ آپ بھی میرے آگے آگے مُنہ میں کچھ کہتے رہتے ہیں۔ آج میں نے ذرا آگے بڑھ کر سنا تو آپ کہہ رہے تھے "یا اللہ یا اللہ"۔ میں نے سوچا کہ جب آپ اللہ کا نام لے کر پار اُترتے ہیں تو میں آپ کا نام کیوں لوں۔ میں بھی اللہ کا نام کیوں نہ لوں! چنانچہ میں نے آپ کے نام کی جگہ "یا اللہ! یا اللہ" کہا کہ گڑُم سے پانی کے اندر پہنچ گیا۔

پیر صاحب مُسکرائے اور کہا کہ تو نے کبھی اللہ میاں کو دیکھا ہے؟ اس سے کچھ جان پہچان ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں یا حضرت! میں نے اسے نہیں دیکھا۔ میری اس سے جان پہچان نہیں۔ پیر صاحب نے کہا کہ بھائی! جس سے جان پہچان نہ ہو وہ تمہارے بُلا دے پر تمہاری مدد کو کس طرح آ سکتا ہے؟ میری اس سے جان پہچان ہے، میں اسے بلاتا ہوں۔ تمہاری مجھ سے جان پہچان ہے، تم مجھے پکارو۔ کرتا تو سب کچھ وہی ہے لیکن اس تک مرشد کے وسیلے سے پہنچا جاتا ہے۔ تم دوپہر کے وقت

سورج کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو۔ کبھی سورج کو نہیں دیکھ سکو گے۔ آنکھیں چُندھیا جائیں گی۔ لیکن پانی کا پیالہ لے کر اس میں سورج کو دیکھو۔ وہ پورے کا پورا نظر آجائے گا[1]۔ تمہاری آنکھیں اللہ کے جلال کو بے نقاب برداشت نہیں کر سکتیں۔ تم اسے مُرشد کے آئینے میں سے ہی دیکھ سکتے ہو۔ براہِ راست کوئی خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ خود خدا نے حکم دیا ہے کہ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ۔ اس کی طرف (جانے کے لئے) وسیلہ تلاش کرو۔ تم بغیر وسیلے کے اس تک کیسے پہنچ سکتے ہو؟

تمثیلات سُنا تم نے سلیم! اس کہانی کو۔ اور پھر "سورج اور پانی کے پیالے" کی مثال کو؟ حقیقت یہ ہے کہ تصوّف کا سارا دارو مدار اسی قسم کی تمثیلات پر ہے۔ ان کی ساری تعلیم تمثیلات کے رنگ میں دی جاتی ہے۔ ایک مثال بیان کرتے ہیں اور پھر جھٹ سے اپنی تعلیم کا ایک ٹکڑا اس سے چسپاں کر کے مرید سادہ لوح کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ ان کی مثال یا تشبیہ ایسی برجستہ ہوتی ہے کہ وہ دماغ میں چپک جاتی ہے اور انسان سمجھنے لگتا ہے کہ انہوں نے بہت بڑی حقیقت بیان کر دی۔ مثلاً انہوں نے بتانا یہ ہے کہ جب تک تجلّیاتِ خداوندی، قلبِ مُرشد کے اندر سے نہ گزریں شعلۂ عشق بیدار نہیں ہو سکتا۔ اسے وہ اس طرح بیان کریں گے کہ سورج کے سامنے روئی کا ڈھیر دن بھر پڑا رہنے دو۔ وہ یونہی ذرا سا گرم تو ہو جائے گا، اس میں آگ نہیں لگے گی۔ لیکن سورج کی انہی کرنوں کو آتشیں شیشے میں گذارو۔ دو منٹ میں روئی میں آگ لگ جائے گی۔ کسی سے کہو کہ آتشیں شیشے کے بغیر ساری عمر میں روئی میں آگ لگا کر دکھائے۔ یہ ہے سلیم! ان کا طریقۂ تعلیم یہ طریقہ محض شاعری ہے۔ حقیقت نگاری نہیں۔ یہ لطائف ہیں۔ حقائق نہیں۔ تصوّف کا سارا دارو مدار شاعری پر ہے۔ خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں۔ اور قرآن، شاعری کو آسمانی انقلاب کے داعی کے شایانِ شان قرار نہیں دیتا۔

لیکن ان کے طریقۂ تعلیم میں سب سے خطرناک مقام وہ ہوتا ہے جہاں وہ اس قسم کی شاعری کی تائید میں قرآن کی آیات پیش کر دیتے ہیں۔ جیسے مندرجہ بالا مثال میں وسیلہ کے متعلق آیت پیش کی گئی ہے۔ تم مثالوں کو چھوڑ دو اور اس آیت کو لو۔ یہ سورۃ مائدہ کی آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

---

[1] حالانکہ اس طرح بھی آنکھوں میں اس کی چمک پڑتی ہی ہے اور انسان اسے پوری طرح نہیں دیکھ سکتا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِىْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۵/۳۵)

وسیلہ کی آیت

اس کا صاف اور سیدھے الفاظ میں ترجمہ ہے:۔ اے ایمان والو! قوانینِ خداوندی کی نگہداشت (تقویٰ اختیار) کرو۔ اور اس کا وسیلہ طلب کرو۔ اور اس کے راستے میں جہاد کرو۔ تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ۔

اس سے یہ حضرات "خدا تک پہنچنے کے لئے وسیلے" کی قرآنی سند لاتے ہیں۔ لیکن سلیم! تم یہ سُن کر حیران ہوگے کہ ہم جن معنوں میں (اُردو میں) وسیلہ کا لفظ بولتے ہیں، عربی زبان میں اس کے معنی اس سے مختلف ہیں۔ عربی زبان میں اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں۔ قدر و منزلت، عزّت و تکریم، مدارج و مراتب، قرب۔ اللہ تعالیٰ نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس طرح اس کے ہاں عزّت و مرتبت کی طلب کرو۔ اس کے لئے اس کے راستے میں جہاد کرو۔ یہ ہے وہ طریق جس سے تم اللہ کے نزدیک واجب التکریم ہوجاؤ گے۔ یہ وہی چیز ہے جسے دوسری جگہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۴۹/۱۳) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی تم میں سے۔ جو سب سے زیادہ تقوےٰ شعار ہوگا، وہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم ہوگا۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ بات کیا تھی اور یہ حضرات اُسے پیش کس طرح سے کرتے ہیں؟ قرآن دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ یہ بڑے بڑے "بزرگ" جنہیں لوگ خدا تک پہنچنے کا "وسیلہ" سمجھتے ہیں، خود ان کی یہ حالت ہے کہ وہ بھی خدا کے ہاں اپنی قدر و منزلت کے آرزومند رہتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝ (۱۷/۵۷) "جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں ان کی خود یہ حالت ہے کہ وہ اپنے رب کے ہاں عزّت اور مرتبہ ڈھونڈتے ہیں ــــــ وہ بھی جو ان میں سے سب سے زیادہ قریب ہے ــــــ وہ خدا کی رحمت کی امّید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ اس کا عذاب واقعی ایسا ہے جس سے ڈرا جائے"۔ تم غور کرو سلیم! کہ جب بڑے بڑوں کی قوانینِ خداوندی کے سامنے یہ حالت ہے تو اس تک پہنچنے کا "وسیلہ" کون بن سکتا ہے؟

قُربِ خُداوندی

قرآن کہتا ہے کہ مشرکین، جو خدا کے علاوہ اور معبودوں کی بھی پرستش کرتے ہیں. جب ان سے پوچھا جائے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ان معبودوں کی پرستش مقصود بالذّات نہیں. ہم ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا کے قریب کردیں. یعنی ہم قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں (مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى - ۳۹/۳). تم غور کرو سلیم! کیا بعینہٖ یہی جواب ان حضرات کی طرف سے ہمیں ملتا جو پیر کو خدا تک پہنچنے کا "وسیلہ" قرار دیتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے متعلق یہ عقیدہ کہ اس تک انسان براہِ راست نہیں پہنچ سکتا بلکہ کسی کی وساطت سے پہنچ سکتا ہے، ذہنِ انسانی کے اس دَور کا پیدا کردہ ہے جس میں خدا کو "بادشاہ" جیسا سمجھا جاتا تھا. جس طرح آپ کسی بادشاہ (یا حاکم) تک براہِ راست نہیں پہنچ سکتے بلکہ ان لوگوں کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں جو اس کے مقرّب ہوں. اسی طرح خدا کے متعلق بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ نہ اس تک براہِ راست پہنچا جا سکتا ہے. نہ اس تک اپنی فریاد پہنچائی جا سکتی ہے. اس لئے ضروری ہے کہ انسان ان لوگوں کا ذریعہ تلاش کرے جو "مقرّبینِ بارگاہِ خداوندی" ہیں.

قرآن کی رُو سے خدا کے متعلق ایسا عقیدہ اور تصوّر یکسر باطل ہے. اس کا ارشاد ہے کہ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ جب تجھ سے میرے بندے میری بابت پوچھیں تو ان سے

خُدا براہِ راست سُنتا ہے

کہہ دو کہ میں (ان سے) قریب ہوں. اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (اتنا قریب کہ) جب بھی کوئی بلانے والا مجھے بلاتا ہے تو میں اس کے بلاوے کا جواب دیتا ہوں (۲/۱۸۶). قرآن کے اس واضح اعلان سے ظاہر ہے کہ خدا ہر بندے کی پکار کو براہِ راست سنتا ہے. اس لئے یہ عقیدہ کہ خدا تک اپنی بات پہنچانے کے لئے کسی وسیلہ یا ذریعہ کی ضرورت ہے، قرآن کے اس اعلان کی تکذیب ہے. وہ اتنا قریب ہے کہ اس کا ارشاد ہے. نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰/۱۶) "ہم انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں." اب ظاہر ہے کہ جو ذات انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہو اور اس کا اعلان ہو کہ ہم ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتے ہیں اس کے متعلق یہ عقیدہ کہ اس تک آواز پہنچانے (یا اس تک پہنچنے) کے لئے کسی ذریعے اور وسیلے کی ضرورت

ہے، خدا کے ارشاد کے منافی ہے۔

اس مقام پر سلیم! یہ خیال دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ جب خدا ہر ایک کی سُنتا ہے تو پھر ہر ایک کی مانگ (طلب) پوری کیوں نہیں ہو جاتی ہے؟ اس سوال کا مفصّل جواب تو تمہیں میری کتاب "من و یزداں" کے عنوان "مشیّت، تقدیر، دُعا" میں ملے گا۔ (جس کا ملخّص میں اس سے پہلے ایک خط میں لکھ چکا ہوں[1]) لیکن مختصر جواب قرآن نے اسی آیت کے باقیماندہ حصّہ میں دے دیا ہے۔ وہاں کہا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں ان کی مانگ پوری کروں تو اس کا طریق یہ ہے کہ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ○ (۲/۱۸۶) انہیں چاہیئے کہ پہلے میری دعوت پر

خدا کیسے سُنتا ہے

لبّیک کہیں۔ میرے قوانین کی اطاعت کریں۔ انہیں اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں۔ اس سے ان کے سامنے وہ راستہ آجائے گا جو انہیں ان کی منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا۔ انہیں اس مقصد کے لئے کسی "مرشد" کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرے قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں۔ یعنی ایسا معاشرہ قائم کریں جو قوانینِ خداوندی کی بنیادوں پر استوار ہو۔ پھر ان کی ہر طلب (جو لامحالہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہی ہوگی) اس معاشرہ کی وساطت سے پوری ہوتی جائے گی۔ یہ ہے سلیم! وہ طریقہ جس سے ہر فرد اپنی آواز خدا تک پہنچا سکتا ہے اور خدا اس کی پکار کا جواب دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس معاشرے کے اندر ہوتا ہے جو قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکّل ہوتا ہے۔ نہ کہ خانقاہیت کی انفرادی زندگی سے جس کے متعلق قرآن نے کہہ دیا ہے کہ وہ انسانوں کا خود ساختہ مسلک ہے۔ خدا کا مقرر فرمودہ نہیں (۵۷/۲۷)۔

اس مقام پر سلیم! اتنا اور بتا دینا بھی ضروری ہے کہ جسے "قربِ خداوندی" کہتے ہیں اس سے مراد کیا ہے اور "مقرّبینِ بارگاہِ خداوندی" سے کون لوگ مراد ہیں؟ جب خدا کا تصوّر "بادشاہ" کا سا قائم کر لیا جائے تو اس "مقرّبین" سے مفہوم ایسے لوگ ہوں گے جو خدا کے قریب ہوں، جو خدا کے رازداں

قربِ خداوندی کا مفہوم

ہوں۔ خدا ان سے صلاح مشورہ کرتا ہو۔ وہ خدا سے لوگوں کی سفارش کرتے ہوں۔ لیکن خدا کے اس تصوّر کی رُو سے

---

[1] وہ خط جس کا عنوان ہے "خدا کا تصوّر"۔ اب "کتاب التقدیر" کے نام سے مستقل کتاب بھی شائع ہو چکی ہے (۱۹۸۳ء)

جسے قرآن پیش کرتا ہے، یہ تمام نظریات باطل قرار پاتے ہیں۔ اس تصور کی رُو سے قربِ خداوندی کا مفہوم کچھ اور ہے اسے غور سے سنو۔

جو انسان قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا ہے اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی جاتی ہے۔ "ذات کی نشو و نما" کے متعلق میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس سے انسان کے اندر حدودِ بشریت کے مطابق خدائی صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے۔ اسی کو قربِ خداوندی کہتے ہیں۔ یعنی جس انسان میں جس قدر صفاتِ خداوندی کی نمود ہوگی وہ اسی قدر خدا کا مقرب ہوگا۔ اس سے صرف اس کی ذات کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ "خدا کا مقرّب" بن کر کاروبارِ خداوندی میں دخیل ہو جاتا ہے اور "خدا اور بندوں" کے درمیان واسطہ بن جاتا ہے۔ کوئی "مقرب" نہ خدا کا مشیر ہوتا ہے اور نہ ہی خدا تک بندوں کی سفارشیں پہنچاتا ہے۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے ایسے مقرّب ہوں۔

خدا سے محبّت کا مفہوم

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اولیاء اللہ" (یعنی جنہیں تصوّف کی اصطلاح میں اولیاء کہا جاتا ہے) خدا سے محبّت کرتے ہیں۔ ان کی محبّت عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو عشقِ خداوندی کی آگ میں اس شدّت سے جلاتے ہیں کہ وہ خود آگ بن جاتے ہیں۔ جس طرح لوہا آگ میں تپانے سے آگ بن جاتا ہے۔ یہ سب شاعری ہے سلیم! اور اسی تمثیلی اندازِ بیان کا نتیجہ جس پر تصوّف کی بنیاد ہے۔ خدا نے کہیں نہیں کہا کہ انسان کا مقصدِ زندگی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو عشقِ خداوندی کی آگ میں جلا کر خود آگ بن جائے۔

اس سلسلہ میں اہلِ تصوّف کی طرف سے قرآن کی ایک آیت بھی پیش کی جاتی ہے۔ یعنی وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (۲/۱۶۵) اس کا عام الفاظ میں ترجمہ یہ ہے کہ "ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اور قوّتوں کو اس کا ہمسر قرار دیتے ہیں اور ان قوّتوں سے اس طرح محبّت کرتے ہیں جس طرح اللہ سے محبّت کی جاتی ہے۔ حالانکہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ اللہ کی محبّت میں بہت بڑھ کر ہیں۔" اسی طرح سورۃ آلِ عمران کی اس آیت سے بھی "خدا سے محبّت" کی دلیل لائی جاتی ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

اَلْکَافِرِیْنَ ○ (۳۱-۳۲/۳) اس کا ترجمہ عام الفاظ میں یہ ہے" ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو. اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے قصوروں کو معاف کر دے گا اور اللہ حفاظت کرنے والا، رحم کرنے والا ہے. ان سے کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو. پھر اگر یہ لوگ اس سے پھر جائیں تو اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا."

قبل اس کے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ عربی زبان میں لفظ "محبت" کے معنی کیا ہیں. تم یہ بات نہایت آسانی سے سمجھ لوگے کہ خدا کی ذات انسانی حیطۂ ادراک سے بالا ہے اس لئے جس قسم کی محبت

غیر مرئی سے محبت ناممکن ہے

انسانی محبوب سے کی جاتی ہے (خواہ وہ اولاد سے محبت ہی کیوں نہ ہو) اس قسم کی محبت خدا سے کی ہی نہیں جا سکتی. تم کسی ان دیکھی چیز سے محبت کر نہیں سکتے. یہی وہ نفسیاتی دشواری تھی جس کی وجہ سے (محسوسات کے خوگر انسان کو) خدا کو انسانی شکل (اوتاروں کے روپ) میں ڈھالنا پڑا. اس کی مورتیاں بنانی پڑیں. اور یہی وہ مشکل تھی جس کے پیشِ نظر خود ہمارے تصوف میں "مجاز سے حقیقت" کی طرف جانے کا راستہ اختیار کیا گیا اور مضطرب و بے قرار عاشق کی جبینِ نیاز میں تڑپنے والے سجدوں کو کہنا پڑا کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

مجاز و حقیقت

محسوسات کا خوگر انسان، کسی غیر مرئی و غیر محسوس حقیقت سے محبت نہیں کر سکتا. جو اس کے مدعی ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی مجازی پیکر کو حقیقت بنا لیتے ہیں یا حقیقت سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں. تصوف کی ساری شاعری اسی حسین و کیف آور فریب کا مرقع ہے. یہی فریب ہے جو رومی کی "شاخِ نبات" کو "معشوقِ ازلی" اور حافظ کی شرابِ ناب کو "بادۂ الست" کے پیرہن پہنا کر سامنے لاتا ہے. غالب نے جب کہا تھا کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تو یہ امرِ واقعہ کی ضد تھا. بات یہ نہیں کہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کو بادہ و ساغر کہے بغیر بن نہیں پڑتی. امر واقعہ یہ ہے کہ بادہ و ساغر کو "مشاہدۂ حق کی گفتگو" کہے بغیر کام نہیں چلتا. بہر حال، میں کہہ یہ رہا

تھا کہ جس قسم کی محبت انسانوں میں ہوتی ہے، خدا کے ساتھ اس قسم کی محبت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اب یہ دیکھو کہ آیاتِ مندرجہ بالا میں خدا سے بندوں کی محبت اور خدا کی بندوں سے محبت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

عربی زبان میں لفظ محبت کے معنی ہیں (۱) کسی چیز پر ثابت قدمی سے جم جانا۔ اور (۲) کسی کی حفاظت کرنا۔ اسے بلند کرنا۔ ظاہر کرنا۔ اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کرنا۔ لہٰذا قرآنی آیات میں "خدا سے بندوں کی محبت" کے معنی ہیں قوانینِ خداوندی کی ثابت قدمی سے جم کر اطاعت کرنا۔ خود سورۃ آلِ عمران کی آیت (۳/۳۱) میں اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ کے الفاظ نے "محبت" کی یہ تشریح کردی ہے۔ دوسری طرف خدا کی بندوں سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ خدا ان کی حفاظت کرتا ہے۔ انہیں بلندیاں اور سرفرازیاں عطا کرتا ہے۔ ان کی مضمر صلاحیتوں کی نمود اور نشوونما کرتا ہے۔ یہ چیزیں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا فطری نتیجہ ہیں۔

یہ ہے سلیم! خدا کی محبت اور خدا سے محبت کا قرآنی مفہوم۔

اب ہم اس "طوطے" کی طرف آتے ہیں جس میں تصوف کے اتنے بڑے "جن" کی جان ہے۔ یعنی

کرامات

اولیاء اللہ کی "کرامات"۔ یہی وہ چیز ہے جس نے اس میں اتنی بڑی کشش پیدا کر رکھی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسانی ذہن، تمام عقلی دلائل اور علمی براہین کو بالائے طاق رکھ کر ان حضرات کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ ذرا تصور میں لاؤ اس منظر کو کہ کسی مجمع میں قرآنِ کریم کے عظیم القدر حقائق و معارف بیان ہو رہے ہیں۔ بیان کرنے والا تاریخی شواہد، عصری انکشافات اور فلسفہ اور سائنس کی بلند ترین اسناد کی روشنی میں قرآنی دعاوی کی صداقت روزِ روشن کی طرح واضح کر رہا ہے کہ اتنے میں سڑک کے اُس پار کوئی مست ملنگ ہو حق کا نعرہ لگاتا ہے اور آنکھیں لال کر کے بالوں کو نچوڑتا ہے تو ان میں سے دُودھ کے قطرے ٹپکنے لگ جاتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ یہ سارا مجمع قرآنی حقائق و معارف کو یک قلم چھوڑ کر اس مست ملنگ کے گرداگرد جا کھڑا ہوگا۔ اس لئے کہ انسانی ذہن، بایں ہمہ ادعائے علم و تمدن، ہنوز اپنے عہدِ طفولیت میں ہے اسے (بچوں کی طرح) بسیط حقائق کے مقابلہ میں محیر العقول عجائبات زیادہ تیزی سے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ قرآن، انسانی ذہن کی اس خامی کو دُور کرنے کے لئے آیا تھا۔ لیکن تصوف اسے پھر اسی

کی طرف کھینچ کر لے گیا۔ اسی میں تصوّف کی کامیابی کا راز ہے۔ یعنی بزرگوں کی کرامات۔ یہی وہ وادیٔ حیرت ہے جہاں پہنچ کر بڑے بڑوں کی عقلیں گم اور ذہن مفلوج ہو جاتے ہیں۔ اسی سے یہ "مغزِ دین" قرار پا جاتا ہے۔ آؤ۔ دیکھو سلیم! قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔

قرآنِ کریم کا بغور مطالعہ کرو تم دیکھو گے کہ مخالفین بار بار نبیٔ اکرمؐ سے معجزات کا تقاضا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ہر بار ان کے مطالبہ کو یہ کہہ کر ردّ کر دیتا تھا کہ ہم نے رسولؐ کو کوئی حسّی معجزہ نہیں دیا۔ اس کے معجزات صرف دو ہیں۔

۱۔ یہ کتاب، جس کی مثل و نظیر کوئی پیش نہیں کر سکتا (۲۹/۵۱) اور

۲۔ خود اس (رسولؐ) کی اپنی زندگی جو سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز ہے (۱۰/۱۶)۔ ان کے علاوہ اگر تم معجزات دیکھنا چاہتے ہو تو قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۰/۱۰۱) ارض و سمٰوٰت پر غور کرو قدم قدم پر معجزات دکھائی دیں گے۔ (۱۲/۱۰۵)

غور کرو سلیم! حضور نبیٔ اکرمؐ کو تو کوئی حسّی معجزہ نہیں دیا جاتا لیکن یہ حضرات (جو حضورؐ کے تبع ہونے کے مدعی ہیں) ان سے قدم قدم پر کرامات ظہور میں آتی چلی جاتی ہیں۔ اگر اسلام کا ماحصل کرامات تھا تو سب سے پہلے ان کا ظہور نبیٔ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس سے ہونا چاہیئے تھا اور آپ کے بعد صحابہ کبارؓ سے۔ لیکن اس سارے عہد میں کسی کی کوئی اس قسم کی کرامت دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن جب ان (صوفیاء) کا زمانہ شروع ہوتا ہے تو ان کی ایک ایک سانس میں کرامات رقص کرتی نظر آتی ہیں۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے؟

میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ کرامات کو دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک فنی چیز ہے جسے جس کا جی چاہے حاصل کر لے۔ یہ قوّتِ خیال کی کرشمہ سازیاں ہیں جنہیں ہر شخص خاص انداز کی مشق و

کرامات کی حقیقت

ریاضت سے پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں نہ کفر و اسلام کی کوئی خصوصیت ہے نہ شرک و توحید کی کوئی تمیز۔ یہ کچھ سلیم! میں جگ بیتی نہیں کہہ رہا۔ آپ بیتی کہہ رہا ہوں۔ اس داستان کی تفصیل طویل ہے[1]۔ (اگر کبھی میں

---

[1] یہ داستان "تصوّف کی حقیقت" نامی کتاب میں بیان ہوئی ہے۔ (۱۹۸۳ء)

نے اپنی زندگی کے تجارب کو قلمبند کیا تو یہ تفاصیل وہاں آسکیں گی) اس وقت صرف اس قدر بتا دینا کافی ہوگا کہ جن دنوں میں سلوک کی منازل طے کر رہا تھا، ہمارے ہاں (اکثر رات کی تنہائیوں میں) ہندو سنیاسی بھی آیا کرتے تھے۔ ان سے اس قسم کے خارق عادات کرامات سرزد ہوتیں کہ بیں ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا۔ میرے دل میں اسی زمانے میں یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ اگر یہ چیزیں دین کا ماحصل (یا نتیجہ) ہیں تو ان مشرکین سے ان کا ظہور کیسے ہو جاتا ہے؟ یہ کھٹک میرے دل میں پرورش پاتی رہی۔ حتیٰ کہ میں تحقیقِ حق کے لئے سادھوؤں کی سمادھیوں میں پہنچا۔ خود ایک یوگی کو اپنے گھر پر رکھا۔ اور اس کے زیرِ تربیت یوگ کے مراحل طے کئے۔ اور تم یہ سُن کر حیران ہو گے کہ اس طریق سے بھی وہی کچھ ظہور میں آنے لگ گیا جس تک میں تصوّف کے راستے پہنچا تھا۔ یوں میں نے سلیم! اپنے ذاتی تجربہ سے اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیا کہ "ان کرامات" کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک فن ہے جس کے حاصل کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ تصوّف کی ریاضتیں بھی ہیں۔ (مغرب میں اس فن کو بھی ایک قسم کی سائنس بنا دیا گیا ہے اور اس سے کئی قسم کے کام لیے جاتے ہیں جن میں عصبی بیماریوں کا علاج نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اسے ہپناٹزم کہا جاتا ہے)۔

دین کی کرامات

دین کی کرامات اور ہوتی ہیں۔ اس سے انسانی دنیا میں وہ انقلابِ عظیم برپا ہوتا ہے جس سے باطل کا ہر نظام الٹ کر اس کی جگہ ایسا نظام متشکل ہو جاتا ہے جو قوانینِ خداوندی (قرآن کے غیر متبدّل اصولوں) پر قائم ہوتا ہے اور جس کا نصب العین دنیا سے ظلم و استبداد مٹا کر، عدل و احسان کو عام کرنا ہوتا ہے۔ قرآن نے "ایمان و اعمالِ صالح" کا یہی نتیجہ بتایا ہے جب کہا ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ، جو ایمان لاتے ہیں اور عملِ صالح کرتے ہیں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں دنیا میں حکومت عطا کرے گا۔ جیسی حکومت اس نے ان لوگوں کو عطا کی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ یہ حکومت ان کی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے نہیں ہوگی۔ مقصد اس سے یہ ہوگا کہ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ۔ وہ ان کے لئے اس نظامِ حیات کو جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے متمکن کر دے۔ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ

اَمْنًا اور وہ ان کی حالت خوف کو امن میں بدل دے۔ تاکہ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا وہ صرف میرے قوانین کی محکومیت اختیار کریں۔ اس میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ (۲۴/۵۵)۔ یہ تھا دین کا مقصود، سلیم! تصوّف اس مقصد کو نگاہوں سے اوجھل کر کے فرار کی راہیں سکھاتا ہے۔ اس سے قرآن نے یہ کہہ کر متنبہ کیا تھا کہ وَ مَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۴/۵۵) جو اس واضح راہنمائی کے بعد اس سے انکار و سرکشی اختیار کرے گا تو یہی لوگ ہوں گے جو غلط روش پر چلیں گے۔

اب سمجھ لیا سلیم! تم نے کہ قرآن کی روشنی میں تصوّف کی پوزیشن کیا ہے؟ وہی جو اقبالؒ نے کہا تھا کہ

> تصوّف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے۔ اور (اس کے امام ابنِ عربی کی) فصوص الحکم میں الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نہیں۔

اور جب نفسِ تصوّف، اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے تو پھر "اسلامی تصوّف" اور "غیر اسلامی تصوّف" کی تفریق و تقسیم کیا؟ جو نظریہ، تصور، عقیدہ، مسلک یا مشرب، اسلام کی سرزمین میں اجنبی ہو، اس کے "اسلامی" ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اب رہا یہ کہ تصوّف نے انسانیت کو نقصان کس قدر پہنچایا ہے، تو اس کی تفصیل کے لئے کئی مجلّدات درکار ہوں گی۔ لیکن میں تمہیں نہایت مختصر انداز میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ خود

انسانیت کو نقصانات

ان لوگوں نے جن کے ہاں سے ہم نے تصوّف کو مستعار لیا ہے (یعنی خود عیسائیوں نے) اس کے نقصانات کے متعلق کیا چیخ و پکار کی ہے۔

تم نے برفو BRIFFAULT کا تو اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے۔

> یہ تصوّف پسند حضرات چاہتے ہیں کہ اس پُر از مصائب اور بدنما انسانی دنیا سے بھاگ جائیں اور خلوت کی تجرد گاہوں میں جا کر پناہ لیں جہاں صرف فطرت ہی فطرت ہو (انسان کوئی نہ ہو) ــــــ ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر جنہیں انسان کے ناپاک قدموں نے چھوا نہ ہو ــــــ وہاں جا کر اپنی رُوح کو فطرت کے کیف انداز نظاروں

سے سرشار کریں، بایں نمط کہ ان سرور آفریں کیفیات میں کوئی دخل اندازی نہ کرنے پائے اور ان کے اس جہانِ کیف و مستی میں انسانی دنیا کی ذلت و پستی کا کوئی گذر نہ ہو۔ لیکن وہ نہیں جانتے، یا جاننا نہیں چاہتے کہ ان کی یہ تمام حسین آرزوئیں یہ بلند تخیلات، یہ علو جذبات، انسان کے قلب کی یہ کیف باریاں، انسانی فطرت کی لغزشوں کا یہ احساسِ لطیف اور فطرت کے متعلق یہ حسنِ خیال۔ یہ سب اسی دنیائے انسانیت کی تخلیق ہے جسے وہ اس قدر قابلِ نفرت سمجھ کر تیاگ دینے کی فکر کر رہے ہیں۔

(THE MAKING OF HUMANITY P-349)

میسن اپنی کتاب CREATIVE FREEDOM میں لکھتا ہے۔

اخلاق اس کا نام نہیں کہ آپ مادہ کے کثیف تاثرات سے بھاگ جائیں۔ اخلاقی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ آپ مادہ کا مقابلہ کریں۔ تخلیقی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے جو کچھ مادہ پیش کرتا ہے اس سے متمتع ہوں...... اگر مذہب، انسان کی توجہ مادیت سے ہٹا کر اس کے روحانی الاصل ہونے پر ہی مرکوز کر دے تو یہ اخلاق نہیں، مذہبی بداخلاقی ہے....... نوعِ انسانی اسی صورت میں ترقی کر سکتی ہے۔ جب مادی اور روحانی دونوں پہلو، اپنے تضادات کے باوجود ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھتے جائیں۔

(P.P. ۲۲۳ ; ۲۲۷ ; ۲۴۰)

برفو دوسرے مقام پر لکھتا ہے۔

اخلاقیات کے متعلق، یونان کے ابتدائی تصور کا، رواقی اور ابیقوریت کے فلسفہ میں تبدیل ہو جانا ایسی خرابی کا موجب ہوا جس کی نظیر انسان کے اخلاقی تصوریں کہیں نہیں مل سکتی۔ اخلاق، جس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان کے باہمی معاملات، حق و صداقت پر مبنی ہونے چاہئیں، اپنا حقیقی مفہوم کھو دیتا ہے اگر اس کا نتیجہ نوعِ انسانی کی بہبود نہیں۔ اس سے تو اخلاقیات کا مقصد ہی فنا ہو جاتا ہے۔ اخلاقیات کا مقصد ایک فرد کی ذاتی بہبود یا نجات نہیں (اگرچہ نوعِ انسانی کی بہبود میں فرد کی ذاتی بہبود

بدرجۂ اتم شامل ہے)۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس فرد کا اس نوعِ انسانی کے ساتھ جس کا یہ ایک جزو ہے کس قسم کا تعلق ہے؟ اس (باہمی تعلقات اور معاملات) کے ضابطۂ اخلاق کی بنیاد عدل ہے......... عدل کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر مستبدانہ اور قاہرانہ قوّت سے غالب نہ آسکے........ اگر دنیا میں باطل کے کوئی معنی ہیں تو یہی کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کو محض فرضی اقتدار کی بناء پر اپنا تابع فرمان بنالے......... اسی باطل کا استیصال، اخلاقیات کا کم از کم فریضہ ہے۔ آپ مثالی اخلاقیات، کی کیسی شاندار عمارت کیوں نہ تعمیر کر لیں اگر وہ باطل کا استیصال کر کے اس کی جگہ حق کو قائم نہیں کرتی تو وہ یکسر بے معنی ہے۔ یہ اوپر کی عمارت، اخلاقیات کی عمارت کہلا ہی نہیں سکتی .... رواقی فلسفہ کی رُو سے نصب العین حیات، شر کا مقابلہ نہیں بلکہ اس کے سامنے جُھک جانا رہ جاتا ہے۔ (P.P.331-332)

یہ رواقی فلسفہ وہی ہے جس پر ہمارے تصوّف کی عمارت استوار ہے۔ اور تصوّف کا فلسفۂ اخلاق ETHICS OF MYSTICISM عیسائیت کے فلسفۂ اخلاق کا چربہ ہے۔ اس فلسفۂ اخلاق کی رُو سے (جس کا منتہیٰ ایک فرد کی ذاتی نجات ہے) ظلم و استبداد کی قوّتوں کو بدلگام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو جی میں آئے کریں۔ "خدا کے نیک بندے" حجروں اور خانقاہوں میں جا چھپتے ہیں اور شریر لوگوں کو کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے کہ وہ غریبوں اور مظلوموں کے خون کی رنگینی سے اپنے عشرت کدوں کی تزئین و آرائش کا سامان بہم پہنچائیں۔ عیسائیت کے فلسفۂ اخلاق کی یہی تباہ کاریاں تھیں جن سے متاثر ہو کر، ہسپانیہ کا پروفیسر DR. FALTA DE GRACIA ان الفاظ میں چیخ و پکار کرتا ہے کہ:

عیسائیت میں عدل کا تصوّر بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصورِ اخلاق سے بالکل باہر کی چیز ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت و ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ جن پر ظلم و ستم ہوں لیکن خود ظلم و ستم سے تسامح برتا ہے۔ اس نے ان لوگوں سے جو ظلم و ستم کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوں،

جنہیں مصائب و شدائد نے گھیر رکھا ہو' دعوت دی ہے اور انہیں آئین محبت کی تعلیم دی ہے. عفو و رحم کا سبق سکھایا ہے. انہیں خدا کی ربوبیت یاد دلائی ہے لیکن مذہب و اخلاق کے اس طوفان میں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخلاقی ضوابط کی معراجِ کبریٰ ہے عام انصاف اور عام دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں. مسیح مقدس' جور و استبداد کے ستائے ہوئے مظلوم انسانوں کے درمیان' آسمان سے اترتا ہوا فرشتہ دکھائی دیتا ہے. جو ان کی طرف فارقلیط کا پیغام رحمت و شفقت پہنچاتا ہے. لیکن اس جور و استبداد کی علت معلوم کرنا اس کے دائرۂ شعور سے باہر ہے. خیر و شر کا صحیح تصور اس کے حیطۂ نگاہ سے خارج ہے. یہ ظلم و ستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہگاروں کے لئے ابتلاء و آزمائش ہے. نظامِ عالم کا خاصہ ہے. اس حکومت کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بناء پر قائم ہے. سینٹ ونسنٹ فرانس کے اس قید خانہ کا معائنہ کرتا ہے جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنم ہے. وہ وہاں محبت کا پیغام عام کرتا ہے اور گناہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے. لیکن وہ ظلم و استبداد جس پر اس جہنم کا قیام ہے اس کا اسے احساس تک بھی نہیں ہوتا. ظالموں کے پنجۂ ظلم و استبداد میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں. انسانوں کی زندگیاں اور قلوب و اذہان غلامی کی زنجیروں میں بندھے رہیں. ان کی ہڈیاں چٹختی رہیں. وہ مٹ جائیں. فنا ہو جائیں. عیسائیت کی روح انہیں جاکر تسلی دے گی. لیکن یہ اس کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آئے گا کہ اس ظلم و ستم کو کس طرح سے مٹایا جائے جس کی وجہ سے انسانیت ان مصائب کا شکار ہو رہی ہے. ان چیزوں کا اسے احساس ہی نہ ہوگا. ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمہ داری کی طرف سے یہ بالکل آنکھ بند کئے رہے گی. عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی رُوح یکسر بے حس ہے. یہ تصور اس کے نزدیک ایسا ہی اجنبی ہے جیسا صداقت کا تصور. وہ ہمیشہ عفو، برداشت، رحمدلی کا سبق پڑھاتی ہے. لیکن عدل و انصاف کی اسے کبھی یاد

نہ آئی. زندگی اور اس کی تمام خودداریوں کا ترک..... تدسیۂ آرزد.... عدم مدافعت،
خاموش اطاعت، ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا سامنے کر دینا. غرضیکہ اس قسم کے
متشدّد (غیر فطری) ضابطۂ اخلاق کا طوفان، عیسائیت کے شعور کو مشتعل کر سکتا تھا.
لیکن ظلم و استبداد اور جور و ستم کے کسی منظر سے وہ متاثر نہیں ہو سکتی تھی.

(THE MAKING OF HUMANITY P. 332-33)

جو کچھ اس پروفیسر نے عیسائیت کے متعلق کہا ہے وہ حرفاً حرفاً تصوّف پر منطبق ہوتا ہے. اس تصوّف نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا، اس کے متعلق بڑی سے بڑی تصنیف بھی وہ کچھ نہیں کہہ سکتی، جو کچھ علّامہ اقبالؒ ان چار لفظوں میں کہہ گئے ہیں کہ

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

ہماری تاریخ انہی ڈوبے ہوئے سفینوں کی حدیثِ الم ہے. خدا تمہیں توفیق دے تو ان سفینوں کے ٹوٹے ہوئے تختوں کو پھر سے جوڑنے کی کوشش کرنا.

والسّلام
پرویز

جولائی ۱۹۵۹ء

چونتیسواں خط

(۱) انسانی فطرت کیا ہے؟
(۲) اتفاقات کسے کہتے ہیں؟

سلیم! تم جس انداز سے اعتراضات کو استفسارات کے رنگ میں پیش کرتے ہو، یہ تمہاری سلامتیٔ قلب کی دلیل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ "قلبِ سلیم" بڑی گراں بہا متاع ہے۔ تم اس پر جس قدر بھی ناز کرو کم ہے۔ اس انقلابِ عظیم کے دور میں کہ جسے قرآن نے "قیامت" سے تعبیر کیا ہے اور جو انسانیت کے قیام کا دور ہے، کوئی اور متاع اس قدر گراں بہا نہیں ہو گی۔ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۝ (۲۶/۸۹) یہی وہ قلب (ذہنیت و نفسیاتی کیفیت) ہے جس کی طرف سے جنت کی آسودگیاں خود بخود کھینچی چلی آتی ہیں۔ وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۝ (۲۶/۹۰) تمہاری یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے میں ہزار کام چھوڑ کر بھی تمہارے استفسارات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ مجھے اس سے خوشی ہوتی ہے کہ تم اب رفتہ رفتہ نظامِ ربوبیت کے اصول و مبانی سمجھتے جا رہے ہو۔ اسی سے پورے کا پورا اسلامی نظام سمجھ میں آ جائے گا۔

تمہارے پہلے اعتراض (یا استفسار) کا صغریٰ کبریٰ قائم کیا جائے تو مسئلہ کی نوعیت یوں

---

[1] اس خط اور اس سے اگلے خط کا صحیح مقام جلد اوّل میں تھا لیکن یہ اس میں شامل ہونے سے سہواً رہ گئے اس لئے انہیں یہاں درج کیا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت کے پیشِ نظر انہیں چھوڑ دینا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

بنتی ہے کہ

(i) خود غرضی انسانی فطرت میں ہے۔

(ii) جو کچھ انسانی فطرت کے مطابق ہے وہ عین اسلام ہے۔

(iii) جو کچھ عین اسلام ہے اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔

(iv) لہٰذا کوئی ایسا نظام، جس میں انفرادی مفاد کی جگہ کلّی بہبود کو مقدّم رکھا جائے، اسلامی نہیں ہو سکتا۔

اس لئے

نتیجہ مستخرجہ یہ ہوا کہ نظامِ ربوبیت تقاضائے اسلام نہیں ہو سکتا۔ اس استفسار میں تم نے ایک بہت بڑی بات چھیڑ دی ہے جس کا خط و کتابت کے ذریعے سمجھ میں آنا بہت مشکل ہے۔ ایک طرف تو اس لئے کہ یہ مسئلہ بنیادی اور اساسی ہے اور دوسری طرف اس لئے کہ ہمارے ہر اہم مسئلہ کی طرح یہ بھی تہ در تہ غلط فہمیوں میں لپٹا ہوا ہے۔ اس کا صحیح مقام تو سلسلۂ معارف القرآن کی ایک الگ جلد ہے[1] لیکن چونکہ تمہاری بیتابیٔ تمنا حریفِ انتظار نہیں ہوا کرتی، اس لئے مجبوراً اسے اسی مقام پر مختصر الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اسے توجہ سے سمجھنا۔ بات مشکل ہے اور گنجائش بہت کم۔

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل!

میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے اعتراض کا محرکہ جذبہ (غیر شعوری طور پر) یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ امور بطور مسلّمات مانے جاتے ہیں کہ

(الف) اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا۔

(ب) لہٰذا انسان کی فطرت عین خدا کی فطرت ہے۔

(ج) اسلام دینِ فطرت ہے۔ یعنی انسانی فطرت کے عین مطابق۔

(د) لہٰذا کوئی کام جو انسانی فطرت کے خلاف ہو وہ اسلام کے خلاف ہے۔

---

[1] اس کے بعد 'ابلیس و آدم' نامی کتاب میں یہ بحث آ گئی ہے۔ (۱۹۸۳ء)

اسی بنا پر ہمارے ہاں سب سے بڑا زور اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کیا جاتا ہے کہ "اسلام دینِ فطرت" ہے۔ یہ الفاظ بڑے خوش آئند ہیں اور چونکہ انہیں بطور مسلّمات تسلیم کیا جاتا ہے اس لئے ان پر کسی غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن سلیم! تم میرے مسلک کو جانتے ہو۔ میں ہمیشہ یہ تاکید کیا کرتا ہوں کہ جو الفاظ استعمال کرو، سب سے پہلے ان کا مفہوم متعیّن کر لو۔ یوں ہی اندھی تقلید میں الفاظ استعمال نہ کرتے جاؤ۔ "انسانی فطرت" "انسانی فطرت" کے الفاظ صبح سے شام تک سینکڑوں مرتبہ دہرائے جاتے ہیں۔ لیکن تم نے کبھی سلیم! یہ بھی سوچا کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؟ انسانی فطرت کہتے کسے ہیں؟ ذرا سوچ کر بتاؤ تو سہی کہ انسانی فطرت سے مفہوم کیا ہے؟ تم جس قدر سوچتے جاؤ گے، خود بخود محسوس کرتے جاؤ گے کہ ان الفاظ کا کوئی واضح مفہوم تمہارے ذہن میں نہیں ہے۔ اور ایک تم پر ہی کیا موقوف ہے دوسرے لوگ بھی جو ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں، ذرا ان سے پوچھ کر دیکھو کہ "انسانی فطرت کیا ہوتی ہے؟ تم خود دیکھ لوگے کہ وہ بھی تمہاری طرح کو رہے ہوں گے۔ سلیم! ہمیں اسی چیز نے تباہ کر رکھا ہے۔ جب زندگی کے تصوّرات عمل سے بیگانہ ہو جائیں۔ جب الفاظ محض اصطلاحات اور اعمال محض رسوم بن کر رہ جائیں۔ جب کلمہ (نظریۂ حیات) کو استنتاجی میزان PRAGMATIC TEST میں نہ لایا جائے، تو الفاظ کا استعمال روزمرّہ کی عادت بن جاتا ہے۔ ان کا کوئی متعیّن مفہوم ذہن میں نہیں ہوتا۔ اسی کیفیت کو قرآن اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ اٰبَآؤُکُمْ سے تعبیر کرتا ہے (یعنی محض الفاظ جو قوم میں متوارث چلے آتے ہیں) اور اسی کو میں "شاعری" کہا کرتا ہوں۔

"انسانی فطرت" کیا ہے؟ یہ سوال ایسا اہم اور مشکل ہے کہ انسانی فکر ابھی تک اس کا جواب متعیّن نہیں کر پایا۔ مشرق میں تو خیر، ان امور کے متعلق غور و خوض اور تحقیق و تدقیق سے کام ہی نہیں لیا جاتا۔ (مشرق نے صدیوں سے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ تقلید اور بے عملی کی افیون کا یہی خاصہ ہوا کرتا ہے)۔ مغرب میں جہاں ائمۂ فکر و خبر نے انسانی نفسیات HUMAN PSYCHOLOGY کے متعلق اس قدر تحقیق و کاوش سے کام لیا ہے اور نفسِ انسانی کے امیال و عواطف اور مدرکات و احساسات کی بابت اس قدر ریسرچ کی ہے، وہ بھی اس بات میں کسی حتمی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے کہ "انسان کی فطرت" کیا ہے؟ ان کے ہاں ایک مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ اگر انسان کو خارجی تاثرات

سے متاثر نہ ہونے دیا جائے تو اس کے بعد وہ جن خصوصیات کا حامل ہو گا انہیں غیر ملوّث انسانی فطرت UN-ADULTERETED HUMAN NATURE کہا جائے گا. لیکن یہ نظریہ محض تصوّر ہی تصوّر میں پرورش پا سکتا ہے. عملی دنیا میں اس کا وجود نہیں مل سکتا. یعنی کسی تمدّنی دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں مل سکتا جس کے متعلق کہا جا سکے کہ وہ خارجی اثرات سے متاثر نہیں ہوا.

خارجی اثرات، جو انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں، دو طرح کے ہوتے ہیں.

(i) وہ اثرات جو انسانی بچہ وراثتاً اپنے ساتھ لاتا ہے اور

(ii) وہ اثرات جو اس پر تعلیم و تربیت (ماحول) سے مرتّب ہوتے ہیں.

یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی بچے کو کسی ایسے صحرا یا جنگل میں تنہا چھوڑ دیں جہاں کسی دوسرے انسان کے خیالات اس پر اثر انداز نہ ہوں اور اس کے بعد دیکھیں کہ وہ کن خصوصیات کا حامل بنتا ہے. تاکہ ان خصوصیات کو "انسانی فطرت" کے اجزاء کہا جا سکے. اوّل تو یہ بھی ناممکن ہے. لیکن بفرضِ محال اسے ممکن بھی تصوّر کر لیا جائے تو ہم ان اثرات کو کہاں لے جائیں گے جنہیں وہ بچہ وراثتاً اپنے ساتھ لاتا ہے. اس کی "فطرت" کو ان اثرات سے منزّہ و معرّیٰ کر دینا محال ہے. یہ اثرات تو اس کے خون کے ذرّات اور قلب و دماغ کے ریشہ ریشہ میں حلول کئے ہوئے ہیں. بلکہ اگر اس کے ساتھ ائمۂ علم الابدان کے اس نظریہ کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے کہ انسان کے عادات و اطوار اس کے غدود اور ان کے غدودوں سے رسنے والی رطوبات سے متشکّل ہوتے ہیں اور یہ غدود اس کی جسمانی ساخت کا لاینفک حصّہ ہوتے ہیں جو اسے وراثت میں ملتی ہے، تو انسانی بچّہ کو ان عوامل کے اثرات سے غیر متاثر رکھنا یکسر ناممکن ہو جاتا ہے. لہٰذا کسی ایسے بچّہ کا (عملاً) تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا جسے ان عوامل سے الگ تھلگ رکھا جا سکے جن سے اس کی عادات و خصائل اور امیال و عواطف ترتیب پاتے ہیں. اور جب یہی ناممکنات سے ہے تو پھر "غیر ملوّث انسانی فطرت" کا تعیّن بھی ناممکن ہے.

باقی رہا یہ کہ اگر کسی بچّے کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی ایسی جگہ رکھا جائے جہاں وہ دوسرے انسانوں کے خیالات سے متاثر نہ ہو، تو وہ حقیقی فطرت کا آئینہ دار ہو گا. تو اس کے لئے ہمارے سامنے کئی عملی مثالیں موجود ہیں. تم نے کئی مرتبہ اخبارات میں پڑھا ہو گا کہ فلاں جنگل میں ایک بچّہ

ملا جسے بچپن سے بھیڑیئے اٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ وہیں جنگل میں بڑھا۔ اس بچے کو اٹھا کر لائے تو دیکھا کہ وہ بالکل درندوں جیسا وحشی حیوان تھا۔ اس میں ان باتوں کی بھی تمیز نہ تھی جو وحشی قبائل کے بچوں کو ہوتی ہے۔ وہ جانوروں کی طرح کھاتا پیتا اور رہتا سہتا ہے۔ اب اگر اسی کا نام "صحیح انسانی فطرت" ہے تو اس میں اور حیوانی فطرت میں کیا فرق ہے؟

دوسرے مکتبِ تحقیق کا خیال ہے کہ "انسانی فطرت" کو متعین کرنے کا طریق یہ ہے کہ شروع سے آج تک مختلف ادوار و امصار کے تمام انسانوں کی تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا جائے اور اس طرح جو انسانی خصوصیات ہر زمانہ اور ہر مقام پر نوعِ انسانی میں مشترک پائی جائیں انہیں الگ کر لیا جائے ان کے مجموعے کا نام "فطرتِ انسانی" ہوگا۔ لیکن غور کیجئے کہ یہ طریقِ کار جہاں اس قدر ناممکن العمل ہے وہاں کس قدر ناقص بھی ہے۔ تاریخ کیا ہے؟ انسانی دل و دماغ کے معمولات ACTIVITIES کا ریکارڈ۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ انسانی میلانات و رجحانات کن کن عوامل سے ترتیب پاتے ہیں اور کن کن عناصر سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ لہذا یہ کہنا کہ مختلف ادوار کے انسانوں کے معمولات کے اقدارِ مشترک COMMAN FACTORS کا مجموعہ "انسان کی فطرتِ اصلیہ" کہلائے گا، خود فریبی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس طریقِ عمل سے آج تک کوئی حتمی نتیجہ مرتب ہی نہیں ہو سکا۔

ایک تیسرا مکتبِ فکر، علمائے علم الانسان ANTHROPOLOGY پر مشتمل ہے جن کا خیال ہے کہ جب انسان اپنے ابتدائی زمانہ میں سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور تہذیب و تمدن کی حضریاتی زندگی سے ہنوز ناآشنا تھا، اس وقت وہ اپنی اصلی فطرت پر تھا۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ افریقہ کے حبشیوں، امریکہ کے احمر ہندیوں یا آسٹریلیا کے جنگلی باشندوں کی زندگی "فطرتِ انسانی" کی مظہر ہے۔ لیکن اول تو خود ان ائمۂ تحقیق کے انکشافات کے مطابق مختلف ممالک کے قدیم (جنگلی) انسانوں کے عادات و خصائل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں جو شے مشترک رہ جاتی ہے وہ ان کی جہالت اور توہم پرستی ہے۔ لہذا اس نظریہ کی رُو سے "جہالت اور توہم پرستی" کے مجموعے کا نام "انسانی فطرت" قرار پا سکے گا۔

بعض علمائے نفسیات کا خیال ہے کہ انسانی بچہ اپنے ایامِ طفولیت میں "فطرتِ انسانی" سے

بہت قریب ہوتا ہے۔ لیکن سلیم! ذرا کسی بچّے کی ابتدائی زندگی کا مطالعہ کرو اور پھر دیکھو کہ اس میں کون کون سی خصوصیات اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔ یہی ناکہ اس کے ہاتھ میں جو کچھ آتا ہے اسے توڑ ڈالتا ہے۔ دوسرے کی چیز کو جھپٹ کر چھین لینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ نہیں ملتی تو چیختا چلّاتا ضد کرتا ہے۔ دوسرے بچّوں کو پیٹتا ہے۔ اگر کسی دوسرے بچّے سے پیار کیا جائے تو اس پر حسد کے مارے جل اُٹھتا ہے۔ کبھی آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے، کبھی مُنہ میں مرچ ڈال لیتا ہے، ہاتھ سے چاقو چھینئے تو چیخنے لگ جاتا ہے۔ لہٰذا اس طریقِ فکر کے مطابق "فطرتِ انسانی" کے لاینفک اجزاء یہی کچھ قرار پاسکتے ہیں۔

اب سلیم! ان چیزوں کو لو، جو عام طور پر تمام انسانوں میں بطور قدرِ مشترک پائی جاتی ہیں۔ یعنی تحفّظِ خویش PRESERVATION OF SELF اور بقائے نسل کا جذبہ۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان چیزوں کو "انسانی فطرت" قرار دیا جاسکتا ہے؟ انسان کیا ہے؟ حیوان کی ارتقا یافتہ شکل! جس طرح نباتات کی جڑیں زمین میں اور شاخیں فضا کی پہنائیوں میں ہوتی ہیں، اسی طرح انسان کی طبعی اصل، حیوانی ہے اور "انسانی اصل" اس سطح سے بلند۔ اس کی طبعی زندگی کا انحصار ان ہی عوامل پر ہے جن پر دوسرے حیوانوں کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ سانس لینا، کھانا پینا، سونا، سردی گرمی کے شدید اثرات سے محفوظ رہنا۔ اسی طرح تحفّظِ خویش اور بقائے نسل کا جذبہ بھی حیوانی سطح کی چیز ہے۔ یہ جذبہ ہر حیوان میں پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ جذبہ بھی "انسانی فطرت" نہ ہوا بلکہ "حیوانی فطرت" کا مظہر ٹھہرا۔ جس طرح حیوانات میں یہ چیزیں جبلّی طور پر INSTINCTIVELY موجود ہوتی ہیں، اسی طرح یہ چیزیں انسان میں بھی موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ چیزیں انسانی فطرت HUMAN NATURE بلکہ حیوانی جبلّت ANIMAL INSTINCT قرار پاسکتی ہیں۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ جو بات بظاہر اس قدر آسان دکھائی دیتی تھی، ذرا سے غور و فکر کے بعد وہ کس قدر مشکل نظر آنے لگی۔ یعنی "انسانی فطرت" اوّل تو متعیّن ہی نہیں ہوسکتی، اور اگر وہ متعیّن ہوتی ہے تو اس کے اجزائے ترکیبی کیا قرار پاتے ہیں؟ جانوروں کی سی زندگی جو ان بچوں میں پائی گئی جن کی پرورش جنگلوں میں ہوئی تھی۔ یا جہالت اور توہّم پرستی (قدیم زمانہ کے وحشی

انسانوں کے خصائص) یاشکست وریخت، ضد وحسد، غلبہ واستیلا، ناعاقبت اندیشی، اپنے نفع و نقصان سے بھی ناآگہی (بچے کی ابتدائی زندگی کی خصوصیات)۔ سلیم! غور کرو کہ اگر یہی "انسانی فطرت" ہے تو کیا یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے باعثِ عزّ و شرف قرار دیا جاسکے؟ کیا یہ اس قابل ہے کہ اس کے متعلق کہا جائے کہ

(۱) یہ عین خدا کی فطرت (فطرت اللہ) ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور

(۲) اسلام اسی فطرت کے تقاضے پورے کرنے کا دین ہے۔

سوچو سلیم! کہ یہ سوچنے کی بات ہے!! اور اگر یہ انسانی فطرت نہیں تو بتاؤ وہ کونسی فطرت ہے جو خود اللہ کی فطرت ہے اور جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس کے مطابق دین اسلام ہے؟ اور پھر یہ بھی سوچو کہ اس فطرتِ انسانیہ کا پتہ اور نشان کہاں سے لیا جائے اور اسے متعیّن کیا جائے؟

اب سلیم! ایک قدم آگے بڑھو۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم اکتا تو نہیں گئے؟ بات تم نے چھیڑ دی ہے بہت مشکل۔ اور جو نتائج تمہارے سامنے آرہے ہیں وہ ہیں یکسر غیر مانوس اور غیر متوقع۔ اس لئے اس بحث سے طبیعت کا اکتا جانا مستبعد نہیں۔ لیکن اب یہ کمبل تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ اسے تو آخر تک سننا اور سُنکر سمجھنا ہی ہوگا۔

وہ اگلا قدم یہ ہے کہ خود قرآنِ کریم میں انسان کی بعض خصوصیات کا ذکر آتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان خصوصیّات کے مجموعے کو "انسانی فطرت" قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور اگر وہی انسانی فطرت کے اجزاء ہیں تو کیا اس قسم کی فطرت کو "فطرت اللہ" کا مظہر اور اسلام کو اس فطرت کا دین سمجھا جاسکتا ہے؟ ان خصوصیات میں سب سے پہلے وہ "خصوصیتِ کبریٰ" ہے جو قصّۂ آدم کے ضمن میں مذکور ہے اور جس کی طرف ملائکہ یہ کہہ کر اشارہ کرتے ہیں کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰) کیا تو زمین کی جانشینی اس کے سپرد کرے گا جو اس میں فساد برپا کریگا اور خون بہائے گا؟ اللہ تعالےٰ نے ملائکہ کے اس اعتراض کی تردید نہیں کی بلکہ صرف اتنا کہا کہ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝ "ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔" لہٰذا انسان کی سب سے پہلی خصوصیّت "فساد اور خونریزی" ہے۔ اور اس کی تاریخ بھی اس پر شاہد ہے کہ یہ خصوصیّت فی الواقعہ، بلا قید زمان و

مکان، عمومی طور پر انسانوں میں قدرِ مشترک کہلا سکتی ہے۔

پھر قرآنِ کریم میں انسان کے متعلق ہے کہ یہ بڑا جھگڑالو ہے۔ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸/۵۴) خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (۳۶/۷۸)۔ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ہے (۳۳/۷۲) هَلُوْعًا ہے۔ یعنی ایسا جس کی نیت ہی نہیں بھرتی (۷۰/۲۰)۔ ناشکرا ہے (۱۷/۸۰) خیر کی جگہ شر کو آوازیں دے دے کر بلاتا ہے (۱۷/۱۱)۔ جلد باز ہے (۱۷/۱۱) وغیرہ۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ یہ کون سی خصوصیات ہیں؟ کیا یہ وہی خصوصیات نہیں جو بچے کی ابتدائی زندگی یا دنیا کی وحشی اقوام میں پائی جاتی ہیں؟ یعنی وہ خصوصیات جن کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان کو "علیٰ حالہٖ" چھوڑ دیا جائے (عَلٰی حَالِہٖ کی تشریح ذرا آگے چل کر آتی ہے) اگر یہ خصوصیات، انسان کی "فطرتِ اصلیہ" کی مظاہر ہیں تو انہیں "فطرت اللہ" کا مظہر کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ خصوصیات کم از کم اس خدا کی "فطرت" تو کسی طرح بھی قرار نہیں دی جا سکتیں جس کا تصور قرآن پیش کرتا ہے۔ اور نہ ہی اسلام کو اس "فطرت" کا دین قرار دیا جا سکتا ہے؟

تم جی میں کہتے تو ہو گے کہ میں نے بات کیا پوچھی اور سلسلۂ کلام کس طرف چل نکلا لیکن اس کے بغیر بات سمجھ میں ہی نہیں آسکتی۔ اس تمہید کے بعد سلیم! اس آیتِ جلیلہ کو سامنے لاؤ جسے اس مسلّمہ کے لئے بطورِ سند پیش کیا جاتا ہے کہ

(۱) انسان کو اللہ نے اپنی فطرت پر پیدا کیا۔ اس لئے انسانی فطرت، فطرت اللہ کی مظہر ہے۔ اور
(۲) اسلام دینِ فطرت ہے۔

وہ آیت یہ ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰/۳۰)

اور اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ "اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ دینِ قیّم (اسلام) ہے۔ لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔" اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انسان کی فطرت، فطرت اللہ پر متفرع ہے۔ یعنی جو اللہ کی فطرت ہے، وہی انسان کی فطرت ہے اور اسلام اس فطرت کے مطابق دین ہے۔

ذرا سوچو سلیم! کہ اگر اس آیت کا یہی مفہوم لیا جائے تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانی کوششیں فطرتِ انسانیہ کے تعین میں یکسر ناکام ہیں۔ باقی رہا قرآنِ کریم، سو اس میں انسان کی جن خصوصیات کا عمومی طور پر ذکر ہے وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ انہیں "فطرت اللہ" قرار دیا جائے یا اس "فطرت" پر فخر کیا جاسکے (یہ یاد رکھو کہ ذکر مومنین کی صفات کا نہیں بلکہ انسان کی فطرت کا ہو رہا ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ "فطرت" کا یہ مفہوم ہی غیر قرآنی ہے۔ قرآن نے اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال ہی نہیں کیا جن معانی میں یہ آج مستعمل ہے۔ قرآن اس عربی مبین میں نازل ہوا جو عہدِ نزولِ قرآن میں عربوں کی زبان تھی۔ اس زمانہ میں عربوں میں (جو بالعموم بدوی زندگی بسر کرتے تھے) فلسفہ، مابعد الطبیعات، تصوف، ایتھکس کی اصطلاحات رائج ہی نہ تھیں (بدو تو ایک طرف، اس زمانے کے شہری زندگی بسر کرنے والے عرب بھی ان اصطلاحات سے نا آشنا تھے)۔ یہ اصطلاحات بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ یا کم از کم عربی زبان میں ان کا عمل دخل بہت بعد میں ہوا ہے۔ یعنی اس زمانہ میں جب عربوں کی سادہ زندگی کی جگہ عجمی تصوراتِ حیات نے لے لی اور اس طرح ان کی زبان (عربیِ مبین) کے سیدھے سادے الفاظ، عجمی نظریات کے اصطلاحی مفہوم کے لئے استعمال ہونے لگے۔ یاد رکھو سلیم! جب کوئی قوم سیدھی سادی زندگی بسر کر رہی ہو تو اس کی زبان کے الفاظ ٹھوس اشیاء CONCRETE THINGS کا مفہوم ادا کریں گے۔ تجریدی گفتگو (ABSTRACT TALK) کے لئے استعمال نہیں ہوں گے۔ کیونکہ سیدھی سادی زندگی بسر کرنے والی قوم تجریدی گفتگو سے نا آشنا ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اس وقت قرآن کا جو مفہوم مروج ہے وہ ان اصطلاحات کی رُو سے متعین کیا گیا تھا۔ جب اسلام پر غیر اسلامی تصوّرات چھا گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس مفہوم سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص دَور میں قرآن کو اس طرح سمجھا گیا تھا۔ لیکن ہم نے اسی مفہوم کو "قرآن" سمجھ لیا اور اس طرح ایک خاص دَور کا مفہوم، ازلی، ابدی اور غیر متبدّل تصوّر کر لیا گیا۔ جب تک ہم اس بنیادی غلطی سے نہیں نکلتے، قرآن ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہمارے ہاں کے تمام اُلجھاؤ اسی غلط فہمی کے پیدا کردہ ہیں۔ اسی سے وہ تمام اختلافات پیدا ہوتے ہیں جو ہمارے لئے اس درجہ پریشانیٔ فکر و نظر کا باعث بن رہے ہیں۔ یعنی ہم نے انسانی تعبیرات کو خدا کا ازلی قرآن سمجھ رکھا ہے۔ اور چونکہ انسانی تعبیرات میں اختلاف ناگزیر ہے اس لئے ہمارے ہاں خود "قرآن" میں اختلاف محسوس ہو رہا ہے۔ ضرورت

اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کے اس اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر کر لیں جو خاص خاص ادوار کا پیدا کردہ ہے۔ قرآن کے الفاظ کے معانی ان کے مادوں کی رُو سے متعین کریں اور ان معانی کی روشنی میں، اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق، قرآن کا مفہوم متعین کریں۔ جب تک ہم قرآنی الفاظ کے مآخذ ORIGIN تک نہیں پہنچیں گے اور بعد کے اصطلاحی مفہوم ہی کو ازلی اور ابدی سمجھتے رہیں گے، قرآنی مطالب ہماری نگاہوں سے اوجھل رہیں گے۔

ہمارے ہاں لفظ فطرت کا ترجمہ نیچر NATURE کیا جاتا ہے۔ لفظ نیچر کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ علم طبیعیات PHYSICS میں نیچر، عالمِ آفاق کو کہتے ہیں۔ اور اس سے متعلقہ قوانین کو قوانینِ فطرت LAWS OF NATURE مابعد الطبیعات META PHYSICS میں اس سے مراد وہ قوّت ہوتی ہے جو کائنات کو چلا رہی ہے۔ فلسفہ میں اس کا مفہوم کسی شئے کی وہ خصوصیّت ہے جس سے وہ شے دیگر اشیاء سے ممیّز ہوتی ہے۔ علم النفس کی رُو سے نیچر، جبلّی استعداد یا قلبی رجحانات و میلانات کو کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ لفظ (نیچر) انگریزی زبان میں متعدد دیگر معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی سے پہلے خود ہمارے ہاں کے متکلمین اور حکماء کے ہاں لفظ فطرت ان ہی اصطلاحی معانی میں استعمال ہوتا تھا۔ لفظ فطرت کے یہی معنی اس وقت ہمارے ہاں رائج ہیں۔ اور چونکہ یہ معانی ایک عرصہ سے مروّج چلے آ رہے ہیں اس لئے یہ ہمارے قلب و دماغ میں اس طرح پیوست ہو چکے ہیں کہ ادھر لفظِ فطرت ہمارے کانوں میں پڑا اور ادھر بلا کد و کاوش، اس کا ایک خاص مفہوم ہمارے سامنے آ گیا۔ "اس شخص کی فطرت ہی ایسی ہے۔" "وہ فطرۃً اس قسم کا واقع ہوا ہے۔" "انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔" یہ فقرے ہماری روزمرّہ کی زبان میں داخل ہیں اور ان سے لفظِ فطرت کا ایک خاص مفہوم ہمارے ذہن میں آ جاتا ہے۔ یہی الفاظ بولتے بولتے جب ہمارے سامنے قرآنی آیت میں "فطرت اللہ" کے الفاظ آتے ہیں تو اس سے وہی مفہوم ہمارے سامنے آ جاتا ہے جس سے ہمارا ذہن اس درجہ مانوس ہو چکا ہے۔ اور اس مفہوم کے مطابق ہم قرآنی آیت کا مفہوم متعیّن کر لیتے ہیں اور پھر "اللہ کی فطرت جس پر انسانی فطرت[1]

---

[1] "خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔" یہ تصوّر درحقیقت یہود سے مستعار لیا گیا ہے۔ جن کے ہاں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

متفرع ہے" کو بطور ایک حقیقتِ ثابتہ پیش کر دیتے ہیں اور اسلام کو دینِ فطرت قرار دے دیتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس لفظ فطرت کا وہ مفہوم جو اس وقت ہمارے ذہنوں میں پیوست ہے کیا قرآن میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم کے لئے استعمال ہوا ہے ؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے' لفظِ فطرت کا موجودہ مفہوم بعد کے زمانے کا ہے' جب یونان کا فلسفہ عربی میں منتقل ہوا اور لفظ نیچر کا ترجمہ "فطرت" کیا گیا۔ مادہ کی رُو سے لفظِ فطرت کے بنیادی معنی کسی چیز کو پھاڑنا' شگاف دینا ہیں۔ لہٰذا اس سے مراد ہے کسی شے کو پھاڑ کر اس میں سے کسی نئی چیز کو پیدا کرنا۔ چنانچہ کسی جگہ پہلی مرتبہ کنواں کھودنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے معنی ہیں تخلیق' ایجاد' ابداع TO ORIGINATE قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لئے آیا ہے فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (پستیوں اور بلندیوں کا پیدا کرنے والا)۔ لہٰذا "فطرت اللہ" کے معنی NATURE OF GOD نہیں' بلکہ خدا کا قانونِ تخلیق ہے۔ اسی قانونِ تخلیق کے مطابق اس نے عالمِ آفاق کو پیدا کیا (اَلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ) اور اسی کے مطابق انسان کو (قُلِ الَّذِیْ فَطَرَکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ) لہٰذا فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا کے معنی ہوئے' اللہ کا وہ قانونِ تخلیق جس کے مطابق اس نے انسان کو پیدا کیا ہے' وہی قانونِ تخلیق جس کے مطابق خارجی کائنات وجود میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قانون کی رُو سے کائنات کی ہر شے میں کچھ امکانی صلاحیتیں POTENTIALITIES رکھ دی گئی ہیں جن کی نمود دتکمیل اس شے کی زندگی کی غایت ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کے اندر بھی کچھ صلاحیتیں مضمر ہیں۔ ان صلاحیتوں کی نشوونما انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ عالمِ آفاق اور عالمِ انسان میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر کی صورت میں نشوونما کا قانون ان اشیاء پر مسلّط کر دیا گیا ہے۔ وہ بلا اختیار و ارادہ اس قانون کی پابندی کرتی ہیں — انہیں اس امر کا اختیار نہیں کہ چاہیں تو اس قانون کی پابندی کریں اور چاہیں تو اس سے سرکشی اختیار کر لیں۔ ان کے برعکس' انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے اس پر

(گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) (توریت کی رُو سے) عقیدہ یہ ہے کہ "خدا نے انسانوں کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ (پیدائش ۱/۲۷)

کوئی قانون مسلط کر کے نہیں رکھ دیا گیا۔ یعنی کوئی قانون ایسا نہیں جو اس کی "فطرت" کے اندر رکھ دیا گیا ہو اور یہ اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو (حتّٰی کہ اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جبلّی پابندیاں، جو اس میں حیوانی زندگی سے منتقل ہو کر آتی ہیں، یہ ان کے اتّباع پر بھی مجبور نہیں)۔ بکری کا بچّہ بھوک سے مر جائے گا لیکن کبھی گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ مُرغی کا بچّہ انڈے سے نکلتے ہی خشکی کی طرف دوڑے گا اور بطخ کا بچّہ پانی کی طرف۔ لیکن انسان کے بچّے کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی بھی اُسی بے تکلفی سے مُنہ میں ڈال لیتا ہے جس طرح مصری کا ٹکڑا۔ وہ کبھی پانی میں جا گرتا ہے۔ کبھی آگ کے شعلے کو پکڑ لیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں جو اسے صحیح راستے پر چلنے کے لئے مجبور کر دے۔ اس لئے انسان خارجی راہنمائی کا محتاج ہے۔ یہ خارجی راہنمائی وحی کے ذریعہ ملتی ہے۔ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) انسانوں کی طرف من جانب اللہ ہدایت آتی رہے گی۔ جو شخص یا قوم بھی اس راہنمائی کا اتباع کرے گی اسے نہ خوف ہو گا نہ حزن۔ اس ہدایتِ خداوندی کے آخری اور مکمّل مجموعے کا نام ہے قرآن۔

یہیں سے سلیم! ایک اور اہم بات بھی نکلتی ہے۔ (لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تم کہیں اس موضوع کی "یبوست" سے گھبرا نہ جاؤ۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اس مرتبہ تم نے بات بہت مشکل چھیڑ دی ہے۔ لیکن اگر تم نے ذرا ضبط اور تحمّل سے، ذہن پر زور دے کر سمجھ لیا تو اس کے بعد، تمہاری راہ کے بہت سے کانٹے صاف ہو جائیں گے۔ وہ نئی بات کیا ہے؟ ذرا غور سے سنو۔ تم دیکھ چکے ہو کہ یہ تصوّر کہ انسان کی فطرت، خدا کی فطرت ہے، قرآنی تصوّر نہیں ہے۔ اسی سے ملتا جُلتا (بلکہ اس پر متفرع) یہ تصوّر بھی ہمارے ہاں عام طور پر مسلّمہ مانا جاتا ہے کہ نیکی اور بدی کی تمیز خود فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے۔ یہ تصوّر بھی بوجوہ غلط ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر انسان کی فطرت اپنی اصلی حالت پر ہو اور خارجی اثرات سے ملوّث نہ ہو چکی ہو تو وہ نیکی اور بدی میں از خود تمیز کر لیتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابھی تک یہی متعیّن نہیں ہو سکا کہ انسانی فطرت ہے کیا؟ پھر ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ "ایسی" فطرت" کا ملنا ناممکنات سے ہے جو خارجی اثرات (وراثت و ماحول) سے غیر متاثر ہو۔ (میں اس وقت سلیم! حضرات انبیاء کرامؑ کا ذکر نہیں کر رہا، عام انسانوں

کا ذکر کر رہا ہوں۔ (نبوّت کی حقیقت کا سمجھنا ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے) لہٰذا بات یوں ہوئی کہ

(i) کہا جاتا ہے کہ نیکی اور بدی کا علم غیر ملوّث انسانی فطرت کے اندر مضمر ہے۔

(ii) لیکن غیر ملوّث انسانی فطرت کہیں نہیں مل سکتی۔

تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس "فطرت" کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز رکھ دینے سے فائدہ کیا ہوا جس "فطرت" کا کہیں وجود ہی نظر نہیں آتا؟ یاد رکھو سلیم! نیکی اور بدی کا علم "فطرتِ انسانی" کے اندر نہیں۔ اس کا علم وحی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اور وحی قرآن کے اندر ہے۔ اگر نیکی اور بدی کا علم انسان کی فطرت میں ہوتا تو انسان کو اس کی فطرت کے اتّباع کا حکم دیا جاتا۔ لیکن حکم وحی کے اتّباع کا ہے، انسانی فطرت کے اتّباع کا نہیں۔ وحی کے اتّباع سے نفسِ انسانی کی نشو و ارتقاء ہوتی ہے۔ اس کی مضمر صلاحیتوں میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔

انسان کے اندر تعمیر و تخریب دونوں کی صلاحیّت موجود ہے۔ اسی تعمیر و تخریب کو قرآن نے فجور و تقوےٰ سے INTEGRATIONAND DISINTEGRATION سے تعبیر کیا۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (۹۱/۷) "نفسِ انسانی اور اسے ہموار رکھنے والی قوتیں اس پر شاہد ہیں" کہ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا "اس میں اس کے فجور و تقوےٰ کے امکانات ودیعت کر کے رکھ دیئے گئے ہیں"۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا "جس نے اس کی بالیدگی کا سامان بہم پہنچایا اس کی کھیتی بار آور ہو گئی"۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا "جس نے اس کی صلاحیتوں کو دبا دیا، وہ تباہ ہو گیا"۔ لہٰذا نیکی اور بدی کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر نہیں۔ صرف "نیکی اور بدی" (یعنی نفسِ انسانی کی تعمیر و تخریب) کے امکانات اس کے اندر موجود ہیں۔ ان ممکنات کو صحیح طور پر بروئے کار لانے کا طریق کیا ہے؟ اس کے لئے وحی کی راہنمائی کی ضرورت ہے۔

بات یہاں تک پہنچ چکی ہے سلیم! کہ

(i) خدا کا تخلیقی قانون (فطرت اللہ) کائنات اور انسان دونوں میں کارفرما ہے۔

(ii) اس فرق کے ساتھ کہ کائنات کی کسی شے کو اختیار نہیں کہ وہ قانونِ خداوندی سے انحراف کر سکے۔ (اسے تقدیر کی پابندی کہتے ہیں)۔

(iii) انسان کے اندر اس کی ذات کی نشو و نما کی صلاحیّت بھی رکھ دی گئی ہے اور اسے تباہ و برباد

کر دینے کی استعداد بھی۔

(۱۷) انسان کی نشو و نما اس نظام کے اندر ہوتی ہے جو ہدایتِ خداوندی کی رُو سے متشکل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر نظام اس کی تباہی کا موجب ہوتا ہے۔

(۷) انسان کو اختیار حاصل ہے کہ چاہے بالیدگی اور ارتقار کی راہ اختیار کرے اور چاہے بربادی اور تباہی کے عمیق غاروں کی طرف چلا جائے۔

جب انسان، نظامِ خداوندی کے بجائے دوسری راہیں اختیار کر لیتا ہے تو اسے "اتّباعِ ھویٰ" کہتے ہیں۔ یعنی "نیچے کی طرف لے جانے والی قوّتوں کا اتباع۔ اپنے اپنے جذبات کا اتّباع۔ انفرادی مصالح کا اتّباع۔ اس روشِ زندگی سے وہ خصوصیات اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یعنی شکست و ریخت، فتنہ و فساد، ناہمواریاں اور نااستواریاں، جنگ و جدل، ظلم و جہول، کفران دہلوعت، خود غرضی اور مفاد پرستی وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ "فطرتِ انسانی" کے مظاہر نہیں بلکہ اس روشِ زندگی کے نتائج ہیں جسے انسان، وحی کی روشنی کو چھوڑ کر، تنہا جذبات کی رُو سے اختیار کرتا ہے۔ یعنی اگر انسان کو وحی کی روشنی کے بغیر "علیٰ حالہٖ" چھوڑ دیا جائے تو اس سے اسی قسم کی خصوصیات کا ظہور ہوگا۔

ان تصریحات کی روشنی میں سلیم! سورۂ روم کی اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے جو "فطرت اللہ" "انسانی فطرت" اور "دین فطرت" کے تصوّرات کی بنیاد قرار دی جاتی ہے۔ سلسلۂ کلام یوں ہے۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○ (۳۰/۲۹)

جو لوگ ہر شے کو اس کے اصلی مقام پر نہیں رکھتے ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ علم (وحی) کے بغیر اپنے جذبات کا اتباع کرتے ہیں اور اس طرح زندگی کی صحیح راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ یوں بھٹکنے والوں کو کون صحیح راستہ پر لا سکتا ہے؟ ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہو سکتا۔

ان کے برعکس صحیح راہِ حیات پر چلنے کی آرزو رکھنے والوں سے کہا گیا کہ

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ (۳۰/۳۰)

تم، ہر دوسرے ضابطۂ حیات سے مُنہ موڑ کر، اس ضابطہ (الدین) کو اپنا نصب العین بناؤ جو اللہ کے تخلیقی قانون کا تقاضا ہے. وہ قانون جس کی رُو سے انسان کی خلقت عمل میں آئی ہے. یہ تخلیقی قانون اپنے نتائج کے اعتبار سے غیر متبدّل ہے. یہی وہ ضابطۂ حیات ہے جو خود بھی محکم ہے اور وجہِ قیامِ انسانیت بھی. لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں.

یہ ضابطۂ حیات (الدّین) کیا ہے؟

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (۳۱-۳۲/۳۰)

سفرِ زندگی میں ہر قدم اُس کی طرف اُٹھے. اس کے قوانین کی نگہداشت کی جائے نظامِ صلوٰۃ سے اپنی وحدت کو قائم رکھا جائے اور دین میں تفرقہ انگیزی پیدا کر کے مشرکانہ مسلک نہ اختیار کر لیا جائے. تفرقہ شرک ہے جس میں قانونِ خداوندی کو معیارِ حق و باطل تسلیم کرنے کی بجائے ہر گروہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ برسرِ حق ہے اور یوں اُس فریبِ نفس میں مگن رہتا ہے.

غور کیا تم نے سلیم! صحیح راہ یہ ہے کہ سفرِ زندگی میں انسان کا ہر قدم، ضابطۂ خداوندی کے مطابق اٹھے نہ یہ کہ تنہا عقل (یا جذبات) کے اتباع میں، ناقۂ بے زمام کی طرح، جدھر مُنہ اُٹھا چل دیئے. لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اپنے معاشرتی نظام کو ضابطۂ خداوندی پر متشکّل کر لیں. یہی بلندیوں کی راہ ہے. وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا (ہمارا قانونِ مشیت یہ ہے کہ قرآن کے مطابق چلنے سے بلندیاں حاصل ہوتی ہیں) وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (۷/۱۷۶) لیکن اپنے جذبات کا اتباع کرنے والا پستیوں کی طرف جانا چاہتا ہے. اس

کا کیا علاج ؟ لیکن یہ بلندیاں نظامِ ربوبیت کے بغیر ناممکن ہیں۔ دیکھو قرآن کس قدر واضح الفاظ میں اس حقیقت کی صراحت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝

انسانی کوششوں کے رُخ مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن دیکھو کونسا رُخ کس منزل کی طرف لے جاتا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى ۝

جو دیتا ہے اور خدا کے قانونِ ربوبیت کی نگہداشت کرتا ہے۔

وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝

اور اس طرح معاشرہ میں صحیح توازن و تناسب قائم رکھنے کے دعوے کو سچ کر دکھاتا ہے۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝

تو اس کے لئے کشادگی کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔

وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى ۝

لیکن جو مال کو روک رکھتا ہے اور اپنے آپ کو خود مکتفی سمجھ کر اجتماعی نظام سے مستغنی ہو بیٹھتا ہے۔

وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝

اور اس طرح معاشرہ کے توازن کی عملی تکذیب کرتا ہے۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝

تو اس کے لئے عُسرت کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ۝ (۹۲/۱۰-۵)

اور جب معاشرہ کا توازن بگڑنے سے تباہی آتی ہے تو اس کا انفرادی مال و متاع اسے اس تباہی سے بچا نہیں سکتا۔

اس تمہید کے بعد سلیم! اب تم آؤ اپنے اعتراض کی طرف۔ تم کہتے ہو جب خودغرضیؔ انسانی

فطرت" کا تقاضا ہے تو پھر کوئی ایسا اقدام جو اس خود غرضی کی جگہ کلی مفاد کی طرف لے جائے " خلافِ فطرت" ہوگا۔ جہاں تک " فطرت" کا سوال ہے، اُمید ہے کہ گذشتہ تصریحات سے بات واضح ہوگئی ہوگی۔ اب لو اس تقاضا کو۔ میں یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ انسان، حیوان ہی کی ایک ارتقا پذیر شکل ہے۔ اس لئے انسان اور حیوان میں چند اقدار مشترک ہیں۔ اگر ان اقدارِ مشترکہ کو کم از کم درجے تک لے جائیں تو نظر آئے گا کہ تحفّظِ خویش اور افزائشِ نسل، دو نمایاں خصوصیات ہیں جو حیوانات اور انسان دونوں میں موجود ہیں۔ جہاں تک تحفّظِ خویش کا تعلّق ہے، میں اپنے کسی سابقہ خط میں بتا چکا ہوں کہ حیوان اپنی وقتی ضروریات کے پورا ہوجانے کے بعد مطمئن ہوجاتا ہے، لیکن انسان وقتی ضروریات کے بعد بھی بہت کچھ سمیٹنے کی فکر کرتا ہے۔ اسی طرح افزائشِ نسل کے جذبہ کو لیجئے۔ حیوانات میں جنسی اختلاط محض افزائشِ نسل کی خاطر ہوتا ہے اور اس کے لئے خدا کے تخلیقی قانون نے ان پر ایسی پابندی عائد کر رکھی ہے جس سے سرکشی ممکن نہیں۔ حیوانات کے جوڑے ہر وقت ساتھ ساتھ پھرتے رہتے ہیں۔ لیکن جنسی قوّتوں کی موجودگی کے باوصف، انہیں جنسی اختلاط کا خیال ہر وقت دامنگیر نہیں رہتا۔ یہ جذبہ اسی وقت رُو بہ عمل آتا ہے، جب افزائشِ نسل کے لئے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انسان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے ، جس وقت جی چاہے، جنسی اختلاط میں مشغول ہوسکتا ہے۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ (تحفّظِ خویش اور اور افزائشِ نسل کے) ان دونوں بنیادی تقاضوں میں حیوان اور انسان میں کس قدر فرق ہے ۔ انسان، اس باب میں، کسی " اندرونی قاعدے" کی رُو سے مجبور نہیں، بلکہ اسے اختیار حاصل ہے کہ ان تقاضوں کو جس طرح جی چاہے پورا کرے۔ لیکن انسان، تمدّنی زندگی SOCIAL LIFE بسر کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک فرد کا عمل دوسرے افراد کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس لئے انسانی اختیار و ارادہ کو بلا حدود و قیود نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اس کے اختیار کو صحیح سواحل CHANNELS میں مقیّد رکھنے کے لئے وحی کی رُو سے تحدید کی گئی ہے۔ اگر " افزائشِ نسل" کی قوّتوں پر تحدید عائد نہ کی جائے تو انسانی معاشرہ میں جنسی نوضویت SEXUAL ANARCHY پیدا ہوجاتی ہے۔ اور اگر تحفّظِ خویش کے جذبہ کو بے زمام چھوڑ دیا جائے تو اس سے معاشی فساد (ناہمواریاں) نمودار ہوجاتی ہیں۔ تحفّظِ خویش کے جذبہ کو بے لگام چھوڑ دینے کا نام " خود غرضی" ہے۔ ہدایت

خداوندی کی رُو سے عائد کردہ تحدیدات، افزائشِ نسل اور تحفظِ خویش کے تقاضوں کی تسکین کا انتظام بطریقِ احسن کر دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی انسانی معاشرہ کو ان ناہمواریوں سے بچا لیتی ہیں جو ان جذبات کو بلا تحدید چھوڑ دینے سے لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہیں۔

اب سلیم! تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ خود غرضی "فطرتِ انسانی" کا تقاضا نہیں بلکہ تحفظِ خویش کے حیوانی (اور انسانی) تقاضا کو، ذاتی جذبات کے مطابق پورا کرنے کی کوشش بے مہار کا نام ہے۔ ذاتی جذبات، انفرادی تحفظِ خویش کی اندھی کوششوں میں، کلی مفادِ انسانیت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور وحی کی رُو سے متعین کردہ نظام، تحفظِ خویش کا ایسا انتظام کرتا ہے جس میں تمام نوعِ انسان کی پرورش اور ہر فرد کی امکانی صلاحیتوں کا نشوونما (یعنی تعمیرِ ذات) بطریقِ احسن ہو جائے۔ اس کا نام نظامِ ربوبیّت ہے۔ پھر سُن رکھو سلیم! کہ مقصودِ حیات صرف طبعی زندگی کی پرورش نہیں۔ اگر مقصود یہی ہوتا تو انسان کو حیوانی سطح سے بلند کیا ہی نہ جاتا۔ یہ حقیقت کہ انسان حیوانی سطح سے بلند ہے اس امر کی واضح دلیل ہے کہ مقصودِ حیات طبعی زندگی کی پرورش سے آگے ہے اسی کا نام انسانی صلاحیتوں یعنی اس کی ذات یا PERSONALITY کا نشوونما پانا ہے اور اس کا انتظام نظامِ ربوبیت کی رُو سے ہوتا ہے جس کا ضابطہ قرآن ہے۔

اب سلیم! تمہارا دوسرا اعتراض سامنے آتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کچھ زیادہ تگ و تاز بھی نہیں کرتا۔ لیکن یوں ہی کچھ "اتفاق" ایسا ہو جاتا ہے کہ اسے بے شمار دولت مل جاتی ہے۔ چونکہ اس قسم کے اتفاقات CHANCES کی کوئی منطقی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی اس لئے اس سے انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ ایسا خدا کی طرف سے ہوتا ہے ____ اس کے بعد یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جب خدا کا منشا یہ ہے کہ اس شخص کو اس قدر فراواں دولت دے دی جائے تو اس پر تحدید منشائے خداوندی کے خلاف ہوگی۔

تمہارا یہ اعتراض بھی سلیم! بہت سی بنیادی غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ تم نے "اتفاق" CHANCE کا ذکر کر کے "تقدیر" کا مسئلہ چھیڑ دیا اور تم جانتے ہو کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں جو خطوں میں طے ہو جائے۔ بایں ہمہ جہاں تک تمہارے زیرِ نظر اعتراض کا تعلق ہے، اس کے متعلق مختصراً اس خط میں لکھنا مناسب ہے۔*

(فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ہماری کائنات کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ عالمِ آفاق (یعنی انسانوں کی دنیا کے سوا باقی ساری کائنات) اور دوسرا حصہ، انسانی دنیا۔ سلیم! اگر تم اس بنیادی فرق کو پیشِ نظر رکھو تو مسئلۂ تقدیر کی بہت سی پیچیدگیاں خود بخود حل ہو جائیں گی۔ عالمِ آفاق میں خدا کا قانون از خود کارفرما ہے اور کسی کو اس سے سرتابی کی مجال نہیں (کل له قانتون) لیکن انسان کو صاحبِ ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اپنی مملکت میں آپ صاحبِ اختیار ہے۔ لیکن جس طرح عالمِ آفاق کی نشوو ربوبیت ایک قانون کے تابع ہوتی ہے اسی طرح عالمِ انسانی کی نمود وارتقا بھی ایک نظام کے ماتحت کارفرما ہوتی ہے۔ عالمِ آفاق میں ہر شے کو اس قانون کی پابندی طوعاً وکرہاً کرنی پڑتی ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ "تقدیر" کے پابند ہیں۔ یعنی ان اندازوں کے پابند جو ان کی نقل و حرکت اور نشوونما کے لئے مقرر ہیں اور جن سے انہیں کسی صورت میں بھی مفر نہیں۔ اس کے برعکس عالمِ انسانیت میں یہ قانون، ہدایتِ خداوندی کی شکل میں موجود رہتا ہے، لیکن انسان کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس پر عمل کرے یا نہ کرے۔ بالفاظِ دیگر، اشیائے کائنات تخلیقی قانون کی پابندی مجبوراً کرتی ہیں، جو ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن انسان، قانونِ خداوندی کی پابندی اپنے اختیار سے کرتا ہے جو اسے انبیاء کی وساطت سے ملتا ہے۔ بقول اقبالؒ

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات

مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

اب آگے بڑھو۔ انسانی زندگی کا ایک حصہ خارجی کائنات سے بھی متعلق ہے۔ یعنی اس کی طبعی زندگی یا اس کا نظامِ بدن انہی قوانین کے مطابق چلتا ہے جو حیوانات کی طبعی زندگی میں کارفرما ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کائنات ہی کی فضاؤں میں سکونت پذیر ہے، اس لئے کائناتی حوادث بھی اس کی زندگی کے نظامِ طبعی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً کسی جگہ زلزلہ آجاتا ہے تو ہزاروں انسان دب کر مر جاتے ہیں۔ سیلاب آتا ہے تو بستیوں کی بستیاں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہیں۔ انسان کائنات کی ان خارجی قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے لیکن جو قوتیں

(گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) مسئلۂ تقدیر کی تفصیل 'کتاب التقدیر' میں ملے گی۔ (۱۹۸۳ء)

ہنوز اس کے دامِ تسخیر سے باہر ہیں، وہ ضرور اس پر غلبہ پالیتی ہیں۔ جس چیز کا نام تم نے "اتفاق" رکھا ہے اس کا ایک حصہ ان ہی قوتوں کے غلبہ سے متعلق ہے۔ یہ "اتفاق" محض اس وقت تک "اتفاق" CHANCE رہتا ہے جب تک کائنات کی ان قوتوں کے اسباب وعلل انسان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ جب یہ اسباب وعلل انسان کی سمجھ میں آ جاتے ہیں تو یہ قوتیں مسخر ہوجاتی ہیں اور تسخیر شدہ قوتیں، قاعدے اور قانون کے مطابق کارفرما رہتی ہیں۔ ان میں "اتفاق" کا طلسم ختم ہوجاتا ہے۔

"اتفاق" کا دوسرا حصہ وہ ہے جو انسانی دنیا سے متعلق ہے اور یہی وہ حصہ ہے جس کی طرف تم نے اپنے اعتراض میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی تمہارا کہنا یہ ہے کہ عام قاعدے کے مطابق، ثمر محنت کے ماحصل کا نام ہونا چاہیئے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے بیشتر ثمرات ان کی سعی وکاوش کا ماحصل نہیں ہوتے بلکہ ایسی راہوں سے آتے ہیں جنہیں سعی وکاوش اور جدّوجہد سے کچھ علاقہ نہیں ہوتا۔ ان ہی کا نام تم نے "اتفاقات" رکھا ہے۔ لیکن اگر تم غور کرو سلیم! تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ یہ "اتفاقات" دراصل ہمارے غلط معاشری نظام کا نتیجہ ہیں۔ صحیح معاشری نظام میں ہر نتیجہ قاعدے اور قانون ہی کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ اس میں ثمرات، سعی وکاوش ہی کا ماحصل قرار پاتے ہیں۔ جس طرح کائنات کی مسخر شدہ قوتوں میں "اتفاقات" کا طلسم باقی نہیں رہتا اسی طرح صحیح معاشری نظام میں بھی "اتفاقات کا سم سم" ختم ہوجاتا ہے۔ وہاں "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝" (۹۹/۷-۸) کا بےلاگ قانون کارفرما ہوتا ہے جس میں عملِ انسانی کا ذرّہ ذرّہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور بےعملی کوئی ثمر پیدا نہیں کرتی۔ نہ ہی غلط عمل صحیح نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ ہم نے اپنے اوپر غلط نظام مسلّط کر رکھا ہے اور اس کے نتائج کو "اتفاقات" کا نام دے کر انہیں "فضلِ خداوندی" کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ ذرا غور کرو سلیم! "ہذا من فضلِ ربی" کے یہ بڑے بڑے درخشندہ اور مقدس کتبے کیا اس غلط معاشری نظام کے "اتفاقات" ہی کے مظہر نہیں ہیں؟

اب یہ بات سامنے آنی چاہیئے کہ غلط نظام میں یہ "اتفاقات" وقوع پذیر کس طرح ہوتے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ غلط نظام طاغوتی نظام ہوتا ہے۔ اس میں "ابلیس" کا قانون کارفرما ہوتا ہے۔ ذرا سوچو

کہ "ابلیس" کرتا کیا ہے؛ وہ کسی دوسری دنیا سے، دولت یا قوت لاکر "اتفاقات" کے ذریعے بہم نہیں پہنچا دیتا۔ وہ کرتا صرف یہ ہے کہ دولت اور قوت کی تقسیم ناہموار طریق سے کر دیتا ہے۔ یعنی قانونِ بقائے توانائی LAW OF CONSERVATION OF ENERGY کی طرح دولت یا قوت کی مقدار تو اتنی ہی رہتی ہے۔ صرف اس کی تقسیم ناہموار ہو جاتی ہے (اسی کا نام فساد ہے) وہ ایک طبقہ سے اس کی محنت کا ماحصل چھین کر، دوسرے طبقہ کو بلاسعی و محنت دے دیتا ہے (اسی بلاسعی و محنت یافت کا نام "اتفاق" ہے)۔ یہ "معاشی" فساد ہے۔ اسی طرح وہ ایک طبقہ کی اختیاراتی قوتوں کو چھین کر دوسرے طبقہ کو دے دیتا ہے۔ اس کا نام "سیاسی فساد" ہے۔ (چھین کر کیا دے دیتا ہے۔ وہ اس مقصد کے لئے ایسے ایسے غلط تصورات پیدا کر دیتا ہے جس سے ایک طبقہ اپنی قوتوں کو از خود دوسرے طبقہ کے حوالے کر کے ان کے رحم و کرم پر جینے کا خوگر ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے اس کا نام "مقدر" رکھ لیتا ہے)۔ یہی وہ معاشی فساد ہے جس کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے کہ

فرنگ آئینِ رزاقی بداند بایں بخشد ازو وامی ستاند

بہ شیطاں آنچناں روزی رساند کہ یزداں اندراں حیراں بماند

اسی طرح اقبالؒ سیاسی فساد کے پیدا کردہ خداؤں کے متعلق کہتا ہے کہ ان کی قوت بھی اپنی نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ

ایں خدا تا سجدہ اش کردی خداست

چوں یکے اندر قیام آئی فناست

یہ سب کچھ لازمی نتیجہ ہے اس غلط نظام کا جو وحی سے الگ ہٹ کر قائم کیا جاتا ہے۔ اگر سلیم! انسان اپنے معاشرتی نظام کو وحی کی متعین کردہ بنیادوں پر استوار کر لے تو اس میں نہ "غلط تقسیم" ہوتی ہے اور نہ ہی وہ "اتفاقات" باعثِ فریبِ نگاہ بنتے ہیں، جن کا نام معاشی دنیا میں "فضلِ ربی" رکھ کر دھوکے کا جال بچھایا جاتا ہے اور سیاسی دنیا میں "ظلِ الٰہی" اور "نیابتِ خداوندی" کے سحرِ مقدس سے اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کی جاتی ہے۔

ان تصریحات کے بعد یہ حقیقت تمہاری سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ انسان کی معاشرتی دنیا میں جن چیزوں کو ہم "اتفاقات" قرار دے کر "منجانب اللہ" تصور کر لیتے ہیں، وہ درحقیقت ہماری

معاشرتی ناہمواریوں کے نتائج ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ضابطے میں "اتفاقات" کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جس خدا کے تخلیقی قانون کی یہ کیفیت ہو کہ آسمان کے محیّر العقول کرّے اس قدر حیرت انگیز جسامت اور حیران کن رفتار کے باوجود ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصّے کے برابر بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے، کیا اسی خدا کے قانون کا وہ حصّہ جو انسانی اعمال اور ان کے نتائج سے متعلق ہے (معاذ اللہ) اس قدر "سکھا شاہی" کا قانون ہو جائے گا کہ جسے چاہے بلا قاعدہ اور قانون فراوانیٔ رزق عطا کر دے اور جس پر چاہے روزی کے دروازے بند کر دے؟ سبحان اللہ تعالیٰ عمّا یصفون۔ اللہ تعالیٰ جہاں "مَنْ يَّشَآءُ" کہتا ہے اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ جسے چاہا "موج میں آکر" خزانے بخش دیئے اور جسے چاہا "خفگی میں آکر" نانِ شبینہ تک سے محتاج کر دیا۔ خدا کی مشیّت اس کے قانونِ کائنات کا دوسرا نام ہے۔ اور انسانوں کی دنیا میں اس کا قانونِ مشیّت انسانوں ہی کے ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ یعنی جب انسانی نظام خدا کے ضابطے کے مطابق متشکّل ہو گا تو اس کے نتائج قانونِ مشیّت کے مطابق خوشگوار مرتّب ہوں گے۔ اور جب یہ نظام غیر خدائی ضابطے کے مطابق ہو گا۔ تو اس کے عواقب قانونِ مشیّت کے مطابق ناخوش آئند ہوں گے۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ اور تم خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے[1]۔ لہٰذا جو قانون اپنے نتائج کے اعتبار سے اٹل اور غیر متبدّل ہو، اس میں "اتفاقات" کا کیا دخل اور بلا سعی و محنت ثمرات حاصل کرنے کی توقع کیسی؟ اس میں قدم قدم پر جَزَآءً بما کانوا یعملون کا قانون خوشگواریوں اور بدحالیوں کی میزان بنتا ہے۔

قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا

اس کے برعکس یہ "ابلیسی نظام" کے کرشمے ہوتے ہیں کہ

دانہ ایں می کارد، آں حاصل بُرد

تمہاری بیتابیٔ تمنا مجھ سے رہ رہ کر پوچھتی ہے کہ قرآن کا یہ نظامِ ربوبیّت، جو نوعِ انسانی کے لئے آیۂ رحمت ہے، کس سرزمین میں متشکّل ہو گا اور کب ہو گا؟ اس کے متعلّق میں کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں کہ اس نظام کی تشکیل کے لئے اوّلیں مرحلہ یہ ہے کہ اس کا صحیح اور واضح تصوّر ذہنوں میں جاگزیں ہو جائے۔ اس لئے کہ انسان کی خارجی دنیا میں کوئی انقلاب وقوع پذیر نہیں ہو سکتا جب تک پہلے اس

---

[1] تفصیل اس اجمال کی "کتاب التقدیر" میں ملے گی۔

کی داخلی دنیا میں تبدیلی پیدا نہ ہو جائے۔ اندرونی تبدیلی کے بغیر ہنگامے تو رونما ہو سکتے ہیں، انقلاب ظہور میں نہیں آ سکتا۔ مجھے اس ذہنی تبدیلی کے آثار اسلامی ممالک میں کہیں نظر نہیں آتے۔ میں قریب قریب ہر اسلامی ملک کے اربابِ فکر سے ملا ہوں اور جن سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا ان کے فکر کا مطالعہ کیا ہے۔ تم حیران ہو گے سلیم! مجھے خالص قرآنی فکر کہیں دکھائی نہیں دی اور خالص قرآنی فکر کے بغیر، قرآنی نظام کی تشکیل کا تصور بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہاں یا تو اس فکر کا نام اسلامی رکھا جاتا ہے جو ہم میں ہزار برس سے متوارث چلا آ رہا ہے، اور جس کے متعلق میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں کہ وہ یہود، نصاریٰ اور مجوسیوں کے تصوراتِ حیات اور نظریاتِ زندگی سے اس حد تک متاثر ہے کہ اس میں خالص قرآنی فکر کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اور یا، اسلام کو ایک نجی عقیدہ قرار دے کر، عملی دنیا میں مغرب کی تقلید کی جاتی ہے۔ اس باب میں ہم پاکستانی مسلمان فی الجملہ خوش بخت واقع ہوئے ہیں۔ کہ یہاں خالص قرآنی فکر کی تابناک شعاعیں ضوفشاں ملتی ہیں۔ مبداءِ فیض کی کرم گستری سے یہیں اقبالؒ پیدا ہوا جس نے اسلامی فکر پر چھائے ہوئے عجمی تصورات کو نمایاں کر دینے کی کوشش میں اپنی عمر صرف کر دی اور اپنی لوائے شوق سے ملّتِ اسلامیہ کو مجموعی حیثیت سے قرآن کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ یہی سرزمین حافظ سیّد محبّ الحق (مرحوم و مغفور) کی بصیرتِ قرآنی کی جلوہ گاہ بنی کہ جنہوں نے قریب ساٹھ ستّر برس مسلسل قرآن کی طرف دعوت دی۔ آج اسی سرزمین میں علّامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی[1] کی قرآنی فکر برگ و بار لا رہی ہے، جنہوں نے اپنی عمرِ عزیز اسی جہاد کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ (اللہ تعالیٰ انہیں تا دیر سلامت رکھے تاکہ ہم ان کے تدبّر فی القرآن کے نتائج سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں) میرے کاشانۂ فکر میں سلیم! اگر کوئی چمکتی ہوئی کرن دکھائی دیتی ہے تو وہ ان ہی کے جلائے ہوئے چراغوں کا نور ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ میں ان حضرات کی اندھی تقلید کرتا ہوں۔ اندھی تقلید قرآن کی رُو سے جرمِ عظیم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان حضرات نے قرآن فہمی کے سلسلے میں جس قدر راستے ہموار کئے ان سے میرا سفرِ زندگی بڑا سہل اور آسان ہو گیا۔ یہی ان کی وہ قرآنی خدمت ہے جس کی وجہ سے میرے دل میں ان کا اس قدر احترام ہے۔ ویسے میں، اپنی بصیرت کے مطابق، ان کی فکر کو بھی

---

[1] آپ کا انتقال دسمبر ۱۹۵۵ء میں ہو گیا۔ علیہ الرحمۃ۔

قرآن کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بہرحال جو قرآنی فکر فضائے پاکستان میں نورپاش دکھائی دیتی ہے اس کی مثال مسلمانوں کے کسی اور ملک میں نظر نہیں آتی۔ اس لئے میری توقعات اسلامی ممالک میں سے اسی سرزمین سے وابستہ ہیں۔ یہی میری آرزوؤں کی محور اور میری تمناؤں کی مرکز ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس فضا پر بھی بڑے بڑے دبیز بادل چھا رہے ہیں تاکہ آفتابِ قرآنی کی یہ تابندہ شعاعیں اندھیرے میں جینے والی چمگادڑوں کے لئے وجۂ خیرگیٔ نگاہ نہ بن جائیں۔ لیکن بایں ہمہ اسلامی ممالک میں اگر اس فکر کی تابانی کے کہیں امکانات ہیں تو وہ یہی سرزمین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں سلیم! تمہیں اور تمہاری وساطت سے تمام نوجوانانِ ملّت کو تاکید کرتا رہتا ہوں کہ اس سرزمین کی حفاظت اور استحکام کے لئے اپنی جانیں تک وقف کر دو۔ یہ محض اس لئے کہ اگر اسلامی ممالک میں سے کسی سرزمین میں قرآنی نظام کی تشکیل کے امکانات (زود یا بدیر) ہو سکتے ہیں تو وہ یہی خطۂ زمین ہے[1]۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ نامساعد حالات کے ان جھکڑوں میں کسی نہ کسی طرح اس دیئے کو جلائے رکھوں۔ وہ دیا جو تیل کی جگہ خونِ جگر سے روشن ہوتا ہے۔ اگر غیر قرآنی اسلام کی علمبردار ملاّئیت کی تند و تیز ہواؤں نے اسے سرِبام نہ جلنے دیا تو تہ داماں جلاؤں گا اور اگر ان کی یورشیں وہاں تک بھی پہنچ گئیں تو اسے سینہ کے محراب میں فانوسِ قلب میں روشن رکھوں گا کہ وہاں تو کوئی قوت اسے بجھا نہیں سکے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ سلیم! تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگوں گا تاکہ مرتے وقت اس گراں بہا امانت کو تمہارے سپرد کر کے اطمینان کی موت مروں۔ یاد رکھو سلیم! دنیا میں فروغِ آدمیت صرف قرآنی چراغ سے ہو سکے گا اور بس! واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

کبھی کبھی مجھے یہ خیال بھی آتا ہے کہ اس پیغامِ خداوندی کی اشاعت کے لئے ہم اپنے آپ کو اسلامی ممالک میں ہی کیوں مقیّد رکھیں۔ یہ پیغام تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ اس لئے اگر اس کے لئے کسی غیر مسلم ملک کی فضا زیادہ سازگار ہے تو اسے وہاں کیوں نہ عام کیا جائے؟ میرا اندازہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی نسبت مغربی اقوام کے غیر مسلم قرآن کی آواز کو زیادہ توجہ سے سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ مسلمانوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ جو کچھ

---

[1] یہ ۱۹۵۱ء میں کہا گیا تھا۔ اب تو اس خطۂ زمین میں بھی اس کے امکانات بہت بعید ہو چکے ہیں۔ (۱۹۸۳ء)

ہزار برس سے ہوتا چلا آرہا ہے اسے کس طرح چھوڑ دیا جائے؟ غیر مسلموں کے سامنے یہ سوال ہی نہیں۔ وہ قرآن کو اس کی ذاتی قیمت INTRINSIC VALUE کے لحاظ سے پرکھیں گے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس نے، جب اور جہاں قرآن کو اس کی ذاتی قیمت سے ON ITS MERITS پرکھا، وہ قرآن کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اس اعتبار سے مجھے مغربی اقوام کی سرزمین، قرآنی پیغام کے لئے زیادہ سازگار معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہاں عقل ہے، مُلّا ازم کی جہالت اور تنگ نظری نہیں۔

اب رہا یہ کہ ایسا کب ہوگا؟ سو اس کے جواب میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ "جب تم چاہو گے"۔ اس لئے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (۱۳/۱۱) اللہ کا قانون اس وقت خارجی انقلاب لایا کرتا ہے۔ جب قوم میں داخلی انقلاب پیدا ہو جائے۔ یہی وہ "داخلی انقلاب" ہے جس کے لئے سب سے پہلے نوجوانانِ ملّت کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا کرنی ضروری ہے۔ اور یہ تبدیلی اسی صورت میں ممکن ہے جب ان کے سامنے وہ قرآنی تصورات بے نقاب کئے جائیں۔ جن سے عہدِ محمدؐ رسول اللہ والذین معہ میں وہ انقلاب پیدا ہو گیا تھا جس کی مثال پھر سامنے نہیں آئی۔ میری زندگی کا مقصد انہی قرآنی تصورات کو عام کرنا ہے۔ ولو کرہ المشرکون۔

والسلام

پرویز

جون ۱۹۵۱ء

پینتیسواں خط

انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کیسے ہو سکتی ہے؟

ہاں سلیم! تمہاری اطلاع درست تھی. میں پچھلے دنوں اچھا نہیں رہا. تمہیں یاد ہوگا کہ ۱۹۴۲ء میں مجھے لُو لگ گئی تھی. اس کے بعد آج تک میری حالت یہ ہے کہ ذرا سی گرم ہوا بھی اثر کر جاتی ہے. اگلے دنوں یہی ہوا. ایک رات سخت تکلیف رہی. درد سے تڑپتا رہا. ڈاکٹر صاحب کا دوائیوں کا بکس میرے سرہانے رکھا تھا لیکن معلوم نہ تھا کہ اس کے لئے کون سی دوائی چاہیئے. صبح وہ آئے اور اسی ڈبے میں سے ایک دوائی نکال کر دی جس سے مجھے فوراً آرام آگیا. میں نے سوچا کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے. دنیا بھر کے مصائب و نوائب کا شکار ہو رہے ہیں. مختلف نوعیتوں کے درد اور آلام میں مبتلا ہیں. قرآن ان کے سرہانے رکھا رہتا ہے. لیکن انہیں معلوم نہیں کہ اس نسخے کا استعمال کیسے کیا جائے. "نیم حکیم" کے جال میں پھنس چکے ہیں. نہ شفا ہوتی ہے' نہ رہائی. ورنہ اگر یہ کبھی قرآن کھول کر دیکھ لیتے تو اس میں سے انہیں شفا کا نسخہ اسی طرح مل جاتا جس طرح برادرانِ حضرت یوسفؑ کو بوریوں میں سے اپنی پونجی مل گئی تھی. لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ (۱۲/۶۵).

کیسی بدبختی ہے سلیم! اس مریض کی جو تڑپ تڑپ کر جان دے دے درآں حالیکہ دواؤں کا بکس اس کے سرہانے رکھا ہو!

مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے "فطرت اللہ" کا صحیح مفہوم سمجھ لیا. ورنہ وہ بات مشکل بھی تھی اور

روشِ عامہ سے ہٹی ہوئی تھی. مجھے ڈر تھا کہ شاید اتنی جلدی تمہاری سمجھ میں نہ آسکے. دیکھا تم نے سلیم! ایک بات کے واضح ہو جانے سے کتنی اور باتیں خود بخود صاف ہو جاتی ہیں؟ قرآن فی الواقعہ بہت آسان ہے (وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ) بشرطیکہ اسے سلیقے سے سمجھا جائے۔ اور اگر اسے چیستان بنا دیا جائے تو پھر اس میں ایسا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے مکتبوں کے اٹھارہ علوم تو ایک طرف، دنیا بھر کے علوم زندگی کی گتھی کو سلجھا نہیں سکتے. لیکن یہ گتھیاں خود ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں. ہماری حالت یہ ہے کہ خود ہی اندر سے کواڑ بند کر رکھا ہے اور خود ہی رو رہے ہیں کہ باہر کیسے نکلیں. ہاتھ بڑھاؤ. کواڑ کھولو. باہر نکلنے کا راستہ خود بخود مل جائے گا۔

تم نے ٹھیک سمجھا ہے کہ خدا کا جو قانونِ تخلیق، عالمِ آفاق میں کارفرما ہے، وہی انسانوں کی دنیا میں نافذ العمل ہے، اس فرق کے ساتھ کہ وہاں یہ قانون از خود کارفرما ہے اور یہاں انسان کو اختیار ہے کہ چاہے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے کوئی دوسرا قانون اختیار کرلے. بلکہ یوں سمجھو کہ انسان کی زندگی کے دو حصے ہیں. ایک حصہ وہی ہے جو حیوانات سے متعلق ہے. یعنی انسان کی طبعی زندگی. اس میں بدیہی طور پر وہی قانون کارفرما ہے جو عام حیوانات میں جاری و ساری ہے. حیوانات ہی کی طرح اس کی زندگی کا دارومدار بھی ہوا اور غذا پر ہے. سونا اور جاگنا بھی ان ہی کی طرح ہے. اس کے جسم کی مشینری بھی اسی طرح چلتی ہے. اسی قانون کے مطابق یہ زندہ رہتا ہے اور اسی کے مطابق مر جاتا ہے. لہٰذا جس قدر معاملات اس کی طبعی زندگی سے متعلق ہیں وہ اس کی انسانی زندگی نہیں بلکہ حیوانی زندگی کا حصہ ہیں. لیکن اس نے اس حصۂ زندگی میں بھی اپنے لئے اس قدر مصیبتیں پیدا کر لی ہیں کہ وہ مسائل جو حیوانات کی زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتے، اس کے لئے زندگی کی اہم ترین مشکلات PROBLEMS بن گئے ہیں. جنگل کے جانوروں کو یہ سوچنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ آج کھائیں گے کیا اور رات کو رہیں گے کہاں؟ ہم بیمار پڑیں گے تو دوائی کون لا کر دے گا. اور مر گئے تو بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ ان میں سے کسی کو اس کی فکر نہیں ستاتی. لیکن یہ حضرت "اشرف المخلوقات" ہیں کہ ان کی زندگی کی ساری تگ و تاز انہی گتھیوں کے سلجھانے میں صرف ہو جاتی ہے اور اس پر بھی یہ سلجھنے میں نہیں آتیں. ذرا غور کرو سلیم! آج ساری دنیا انہی خود پیدا کردہ مسائل کے حل کرنے میں مصروف ہے اور مسائل ہیں کہ جس قدر حل کرو

اور پیچیدہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے کسی حد تک کھانے پینے کے مسئلہ کا حل پا لیا ہے، وہ اسے انسانیت کا منتہائے کمال اور زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ اتنا بھی نہیں کر پاتے ان کے مقابلے میں یہ لوگ اپنی کاوش پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچو کہ کیا اس سے انسانیت کے مسائل حل ہو گئے ؟ کیا انسانی زندگی کا مقصود یہی ہے؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ مسائل انسانی زندگی کے اس حصہ سے متعلق ہیں جو انسان اور حیوان میں مشترک ہے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ کہو کہ اس سے حیوانی زندگی کے مسائل حل ہو گئے! انسانی زندگی کو تو اس نے ابھی تک چھوا تک بھی نہیں۔ وہ مقام اس سے آگے ہے۔ قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے معاشی پہلو (طبعی زندگی سے متعلق مسائل) کا حل بھی پیش کرتا ہے اور اس کی انسانی زندگی کے نشوونما اور ارتقاء و بالیدگی کا نظام بھی متشکل کرتا ہے۔ خدا کا قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) ان تمام مسائلِ حیات کو محیط ہے۔

میں نے تمہیں پچھلے خط میں بتایا تھا کہ خدا کے قانونِ تخلیق کی ایک شق یہ ہے کہ ہر شے میں کچھ امکانی قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں، اور ان مضمر قوتوں کے نشوونما کے بعد انہیں تکمیل تک پہنچانا، ان اشیاء کا مقصودِ حیات ہے (اسے قانونِ ربوبیت کہا جاتا ہے) بَڑ کے ایک ننھے سے بیج کو دیکھو۔ اس میں کتنی عظیم القدر امکانی وسعتیں مضمر ہوتی ہیں۔ اس میں سے کونپل پھوٹتی ہے۔ کونپل پودا بنتی ہے۔ پودا بڑھ کر پیڑ بنتا ہے اور رفتہ رفتہ ایک تناور بڑ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس میں پھل لگتا ہے جس کے اندر بے شمار ویسے ہی ننھے ننھے بیج ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر بیج اسی قسم کا بَڑ بننے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ عالمِ آفاق میں یہ لامتناہی سلسلہ جاری و ساری ہے۔

بَڑ کے بیج کا بَڑ بن جانا، اس کا مقصودِ حیات ہے۔ یہی اس کی صلاحیتوں کا پیمانہ ہے، اسی کو اس کی تقدیر کہتے ہیں۔ وہ اگر اس انتہا تک نہیں پہنچتا، تو اپنے مقصدِ حیات میں ناکام رہ جاتا ہے۔ اس کی مضمر قوتیں تمام و کمال مشہود نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ اپنے آخری مقام سے آگے بھی نہیں بڑھ سکتا کیونکہ اس میں اس سے آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہ آخری مقام اس کی منزلِ مقصود ہے۔ اس کی سعی و کاوش کا رُخ اسی آخری مقام کی طرف ہوتا ہے۔ اس کی تمام تگ و تاز

اسی نہج پر ہوتی ہے۔ وہ اسی کے لئے متشکّل کیا گیا ہے۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖؕ (۱۷/۸۴)
پھر، اس پر بھی غور کرو سلیم! کہ مختلف اشیاء کی امکانی وسعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ تمہاری کوٹھی کی باڑ کس قدر خوبصورت ہے، لیکن اس بیل میں نہ پھول آتے ہیں نہ پھل۔ پتوں کی ترو تازگی اس کی آخری منزل ہے۔ اس کے ساتھ ہی چنبیلی کی شاخیں ہیں کہ بہار میں ہر شاخ عطر بیز اور عنبر فشاں بن جاتی ہے۔ لیکن اس کی منزل بھی پتوں اور پھولوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس سے آگے بڑھو تو آم کے پیڑ ہیں۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ!

انگبیں کے ہیں سر بمُہر گلاس

اس سے آگے ببول ہے کہ بیچارے کا منتہائے کمال چند کانٹے ہیں جو قیس عامری کے لباسِ برہنگی کی بخیہ گری کرتے یا اس کی صحرا نوردیوں میں سامانِ آبلہ شکنی بنتے ہیں۔ لیکن پتے ہوں یا پھل، پھول ہوں یا کانٹے، کامیاب درخت وہی کہلاتا ہے جو اپنے انتہائی مقام تک جا پہنچے۔ جو راستہ میں سوکھ جائے اسے کاٹ کر جلا دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی مضمر قوتیں بہ تمام و کمال نشوونما نہیں پاتیں۔ اس کی ممکناتِ زندگی تزکیہ یاب نہیں ہوتیں۔ UN-DEVELOPED رہ جاتی ہیں۔ قانونِ حیات یہی ہے کہ جو بیج نشوونما پا گیا وہ کامیاب ہو گیا۔ جو مٹی کے تودے کے نیچے دب کر رہ گیا وہ نامراد رہا لہٰذا قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) کی پہلی شق یہ ہے کہ ہر شے کی مضمر قوتیں اس کی آخری منزل تک نشوونما پا کر مشہود ہو جائیں۔ چونکہ انسان کی خلقت بھی اسی قانونِ تخلیق کے مطابق ہوئی ہے۔ (فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا)۔ اس لئے جس انسان کی مضمر صلاحیتیں بہ تمام و کمال نشوونما پا گئیں، وہ کامیاب ہو گیا۔ جس کی صلاحیتیں دب کر رہ گئیں وہ ناکام رہا۔ زندگی کی علامت، ذوقِ نمو اور اس کا معراج، اس کے جوہروں کی برومندی اور ثمر باری ہے۔ رشکِ صد فردوس ہے۔ وہ معاشرہ جس میں یہ شادابیاں اور سیرابیاں ہمیشہ قائم و دائم رہیں۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا اور جہنم کی آگ ہے وہ ماحول جس میں یہ سرسبز شاخیں جل کر متحجر ہو جائیں وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ۔

اب سلیم! ایک قدم آگے بڑھو اور دیکھو کہ ایک ننھا سا بیج کس طرح تناور درخت بن جاتا ہے۔ بیج کو میز پر رکھ چھوڑو۔ اس میں قیامت تک آثارِ نمود دکھائی نہیں دیں گے۔ اس کے لئے اسے

مٹی میں ملانا ہوگا۔ مٹی میں نمی کا ہونا بھی ضروری ہے پھر اسے حرارت بھی درکار ہے۔ اس کے بعد ہوا بھی۔ آب و خاک و باد و نار کے امتزاج سے بیج میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے یہ مختلف عناصر باہمی تعاون ہی نہیں پیدا کرتے بلکہ ان میں ائتلاف کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ تمام عناصر اپنے آپ کو بیج کے اندر جذب کر دیتے ہیں اور جسے ہم کونپل کہتے ہیں وہ درحقیقت ان تمام عناصر کے امتزاج سے عبارت ہوتی ہے۔ ان عناصر کو الگ الگ رکھیۓ کسی میں بالیدگی پیدا نہیں ہوگی۔ جب یہ اپنے آپ کو ایک دوسرے میں جذب کر دیں گے تو ہر ایک میں جوشِ نمو اُبھر آئے گا۔ جسے ہم پھل کہتے ہیں وہ تنہا بیج کی ارتقا یافتہ صورت نہیں ہوتی۔ نہ معلوم اس میں کس قدر مٹی کے نمک، پانی، ہوا اور حرارت کے مرکبات باہمدگر مدغم ہوتے ہیں۔ پھل، گویا ان سب کی ارتقا یافتہ شکل کا نام ہے جو سینکڑوں گردشوں کے بعد ظہور میں آتی ہے۔

لہٰذا قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) کی دوسری شق یہ ہے کہ کوئی قوّت انفرادی طور پر ارتقائی منازل طے کر کے نشوونما نہیں پا سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دوسری قوّتیں بھی اپنے آپ کو اس کے اندر جذب کر دیں۔ اور اس طرح یہ تمام قوّتیں ایک دوسرے میں سمو کر اپنی آخری منزل تک پہنچ جائیں۔ نشوونما DEVELOPMENT کا راز ربطِ باہمی میں ہے۔

انسانی زندگی میں اس ربطِ باہمی کا نام اجتماعی نظام یا معاشرہ ہے۔ جس نظم کے تحت یہ اجتماعی نظام وجود میں آتا ہے، قرآن کی اصطلاح میں اسے "الدّین" کہا جاتا ہے۔ قانونِ تخلیق کی اس شق کے مطابق، افرادِ انسانیہ، انفرادی طور پر، اپنی مضمر صلاحیتوں کو نشوونما دے ہی نہیں سکتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مختلف افراد اپنی اپنی صلاحیتوں کو ایک کُل میں سمو دیں۔ (اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ) اور اس عملِ ائتلاف سے نشو و ارتقاء کی منازل طے کرتے چلے جائیں۔ اس کا نام اُمّت، یا ملّت یا جماعت ہے۔ یہ کُل ان افراد کی قوّتوں میں سے اپنے لئے کچھ نہیں لیتا۔ اس کا دراصل وجود ہی نہیں ہوتا۔ جس طرح مشین پُرزوں کے مجموعہ کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن مشین کی مجموعی قوّت، یا تخلیقی نتیجہ CREATIVE OUTCOM پُرزوں کی مجموعی قوّت سے زیادہ ہوتا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مشین میں قوّت کی یہ زیادتی کہاں سے آجاتی ہے۔ لیکن اس کے وجود سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ دراصل نتیجہ ہوتی ہے اس نظم ORDER کا جس میں وہ پُرزے رکھ دیئے جاتے ہیں۔

ان پرزوں سے اس نظم کو الگ کر دیجئے. ان کی تمام قوت معدوم ہو جائے گی. وہ نظم جو افراد (کے پرزوں) کو جماعت (کی مشین) کی صورت میں متشکل کر دیتا ہے الدّین کہلاتا ہے. "دیندار" وہ افراد ہیں جو نظم باہمی سے جماعت (مشین) کی صورت میں مربوط ہو جائیں اور اس طرح ان کی ہر حرکت ایک خاص نتیجہ پیدا کر دے. پرزوں کی اس ہم آہنگی (ایک قانون کے تابع نقل و حرکت) کو اسلام کہتے ہیں. جب چار چار گھوڑے اکٹھے چلیں، اس طرح کہ ان کے قدم ایک ساتھ اٹھیں اور ایک ساتھ جھکیں تو اسے تسالم کہتے ہیں. اسی سے اسلام کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں. یعنی وارکعوا مع الرّاکعین. جھکنے والوں کے ساتھ جھکنا.

میں نے پرزوں اور مشین کی مثال محض سمجھانے کی خاطر دی ہے. ورنہ افراد کے نظم و ضبط باہمی کا تعلق پرزوں کے ربط و ترتیب سے مختلف اور بلند ہوتا ہے. پرزوں کا ربط زیادہ سے زیادہ تعاون کہلا سکتا ہے، لیکن مسلم افراد کا ربطِ باہمی (اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ) یعنی اس طرح ایک دوسرے میں ضم ہو جانا جس طرح ایک بادل دوسرے بادل میں سمو جاتا ہے.

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

قانونِ خداوندی سے ہم آہنگی اور یک جہتی کی یہ آخری منزل ہے جسے تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے. یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا قف وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ (۳/۱۹۹) فلاحت، یعنی "کھیتی کے بار آور" ہونے (بیج کے درخت بن کر ثمر بار ہو جانے) کے لئے اس قسم کا ارتباط و ائتلاف ناگزیر ہے. اس میں ہر فرد، دوسرے افراد کی ربوبیت کا سامان بن کر خود اپنی نشو و نما کا ذریعہ بن جاتا ہے، جس طرح مٹی اور پانی، حرارت اور ہوا، بیج کی ربوبیت کا ذریعہ بن کر درحقیقت خود اپنی نشو و ارتقاء کا موجب بنتے ہیں. یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں محسوس ہی نہیں ہونے پاتا کہ کون کس کی ربوبیت کا ذریعہ بن رہا ہے. تمام افراد اپنی اپنی مضمر صلاحیتوں کو ایک مشترک منزل کے حصول کے لئے رو بہ عمل لانے چلے جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرد کی صلاحیتیں نشو و نما پا کر خود بخود DEVELOP ہوتی چلی جاتی ہیں. اسی کا نام مساعی کا مشکور ہو جانا ہے. (کان سعیکم مشکورًا).

قانونِ تخلیقِ خداوندی (فطرت اللہ) کی یہ دوسری شق ہے. اس کے بغیر امکانی صلاحیتیں

کبھی نشوونما نہیں پا سکتیں۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھو۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بیج کی نشوونما کے لئے، مختلف اور متضاد قوتوں کے باہمی امتزاج و ادغام کی ضرورت ہے۔ پانی اور حرارت، ہوا اور مٹی، سب کا باہمی امتزاج لیکن اس کے ایک اور پہلو پر بھی غور کرو۔ آغوشِ خاک، بیج کے لئے سامانِ زیست ہے۔ لیکن وہی مٹی اگر ذرا زیادہ مقدار میں بیج کے اوپر آجائے تو اس سے بیج کا گلا گھٹ جاتا ہے اور وہ وہیں دب کر رہ جاتا ہے۔ پانی، کونپل اور پودے کے لئے ذریعۂ حیات ہے۔ لیکن اگر پانی ذرا بھی اپنی حد سے بڑھ جائے تو پودے کی کشتیٔ حیات اس میں غرق ہو جاتی ہے۔ حرارت کے بغیر رگِ تاک میں خونِ زندگی موجزن نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہی حرارت اگر ایک قدم آگے بڑھ جائے تو ہری بھری کھیتیوں کو جھلسا کر رکھ دیتی ہے۔ ہوا، ہر پودے کے لئے نفسِ حیات ہے لیکن اس ہوا کی تیزی اسے جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان متضاد عناصر کا باہمی ارتباط و امتزاج ہی ضروری نہیں، اس امتزاج کے لئے ایک خاص توازن و تناسب بھی لاینفک ہے۔ جہاں یہ توازن بگڑا، نہ صرف نشوونما رُک گئی بلکہ بیج کی تمام امکانی قوتیں سلب ہو کر رہ گئیں۔

اعتدال اور تناسب کے ساتھ ہی، ایک چیز موقع اور محل بھی ہے۔ پودے کی برومندی کے لئے کبھی حرارت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، کبھی ٹھنڈک کی، کبھی پانی کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی خشکی کی۔ موسم اور بے موسم کی کاشت اسی فرق کی مظہر ہوتی ہے۔ لہٰذا قانونِ تخلیق کی تیسری شق یہ ہے کہ مختلف قوتوں میں خاص تناسب قائم رہے اور جس وقت جس قوت کی خاص طور پر ضرورت ہے اس وقت وہی قوت، اپنے خاص توازن کو لئے ہوئے، بروئے کار آئے۔

انسانی زندگی میں متضاد قوتوں کا تناسب، ایک تو ہر فرد کے اپنے سینے میں ہوتا ہے اور دوسرے مختلف افراد میں۔ باہمدگر متضاد قوتوں کی کشمکش جو انسان کے اپنے سینے میں موجزن ہوتی ہے، اس سے کہیں زیادہ گہری اور شدید ہوتی ہے جو دو افراد کے درمیان وجۂ کشاکش ہوتی ہے۔ افراد کی متضاد قوتوں کی کشاکش محسوس اور مشہود ہوتی ہے، اس لئے انہیں اس کا علم بدیہی طور پر ہو جاتا ہے۔ برعکس اس کے جن قوتوں کی رزمگاہ انسان کا اپنا سینہ ہوتا ہے وہ بڑی غیر محسوس اور غیر مرئی ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کا تضاد بدیہی طور پر نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دوسرے ل

کے فریب کے مقابلہ میں خود اپنے نفس کے فریب میں بہت جلد آ جاتا اور اس سے بڑی مشکل سے نکل پاتا ہے۔

متضاد قوتوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے عدم توازن سے۔ اگر ان میں توازن قائم رہے تو ان کی باہمی کشمکش ختم ہو جاتی ہے اور وہ باہمی امتزاج و ائتلاف سے وجۂ بالیدگیٔ نفس بن جاتی ہیں۔ یعنی خود اپنے نشو و نما کا ذریعہ۔ اس توازن کو قائم رکھنے کا نام "حسنِ عمل" ہے۔ سلیم! تم جانتے ہو کہ "حسن" کسے کہتے ہیں؟ حُسن، صحیح صحیح تناسب PROPORTION کا نام ہے۔ کسی شے کے مختلف اجزاء میں جس قدر صحیح تناسب ہوگا، وہ اتنی ہی حسین کہلائے گی۔ اور جب وہ تناسب اپنے انتہائی درجہ تک پہنچ جائے گا تو وہ شے جمالیاتی معراج تک جا پہنچے گی۔ تاج محل کا حُسن کہ جسے دیکھ کر تم نے کہا تھا کہ جی چاہتا ہے کہ اسے گلے سے لگا لوں اور خوب زور سے بھینچوں، اس کے تناسب کے سوا اور کیا ہے؟ اس میں تناسب اپنی انتہا تک پہنچ گیا ہے جس کی وجہ سے اس کا حُسن بے مثال ہو گیا ہے۔ دہلی کی جامع مسجد، کہ جس کے متعلق حضرت علّامہ نے کہا تھا کہ وہ تو "بیگم" ہے، اسی صحتِ تناسب سے حسنِ مجسّم بن گئی ہے۔ یہی تناسب جب انسان کی مضمر قوتوں میں رونما ہوتا ہے تو اسے قرآن "حسنات" سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی ضد "سیّئات" ہے، جس کے معنی تناسب کا بگاڑ ہیں۔ جب ان قوّتوں میں ٹھیک ٹھیک تناسب، پیدا ہو جائے تو اس کا نتیجہ خیر کہلاتا ہے۔ جب توازن بگڑ جائے تو اسے شر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسانی قوّتوں میں سے کوئی قوّت نہ بجائے خویش خیر ہے نہ شر۔ انسان کی امکانی قوّتوں میں سے ہر قوّت، حصولِ مقصدِ حیات کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے ان تمام قوّتوں کی کامل نشو و نما لاینفک۔ اس نشو و نما کے بعد، جب ان قوّتوں میں باہمی تناسب پیدا ہو جائے تو وہ وجۂ ربوبیت بن جاتی ہیں۔ اس کا نام خیر ہے۔ جب ان کا باہمی تناسب بگڑ جائے تو وہ باعثِ تخریب ہو جاتی ہیں۔ اسے شر کہا جاتا ہے۔ گویا ہر شے کی ایک شرّی کیفیت ہوتی ہے اور ایک خیر کی حالت۔ خیر کی حالت وہ ہے جب اس میں توازن و اعتدال ہو اور شر کی کی حالت وہ ہے جس میں توازن بگڑ جائے۔ ایک گلاس پانی باعثِ حیات ہے۔ یہ اس کی خیر کی کیفیت ہے۔ لیکن وہی پانی جب اپنے اعتدال سے بڑھ جائے اور انسان اس میں ڈوب کر مر جائے تو موجب ہلاکت ہو جاتا ہے۔ یہ پانی کی شرّی کیفیت ہے۔ لہذا پانی اپنی ذات میں نہ خیر ہے نہ شر۔

اس میں دونوں پہلو موجود ہیں۔ یہی حالت کائنات کی ہر شے کی ہے۔ خدا کا قانون یہ سکھاتا ہے کہ ہمیشہ اشیائے کائنات کے خیر کے پہلو سے متمتع ہو اور شر کے پہلو سے مجتنب رہو۔ غور کرو سلیم! " قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِن شَرِّ مَا خَلَقَ " (۱۱۳/۱) میں نے پناہ مانگی ہے " مِن شَرِّ مَا خَلَقَ " ــــ اشیائے کائنات کے شرّی پہلو ــــ سے کائنات اور انسان کی مختلف قوتوں میں صحیح تناسب، قانونِ خداوندی کے مطابق پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے جب کبھی آفاقی اور انسانی قوتیں قانونِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہوں گی، ان کی خیر ہی کا پہلو مشہود ہوگا۔ (بِيَدِكَ الْخَيْرُ) انسان کے صحیح اختیار کے معنی بھی یہی ہیں کہ وہ معاشرہ میں خیر کے پہلو کو سامنے لائے۔

جب افراد کے اندر، مضمر قوتوں کی نشوونما بطریقِ احسن ہوتی ہے اور ان میں صحیح صحیح تناسب بھی پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے انسان کی اپنی ذات پر جو کیفیت مرتب ہوتی ہے اسے قرآن نے " اطمینانِ قلب " سے تعبیر کیا ہے۔ اطمینان کسی منفی کیفیت NEGATIVE CONDITION کا نام نہیں۔ یہ ایک ایجابی صفت POSITIVE VIRTUE ہے۔ مثلاً جس انسان کی تندرستی ٹھیک ہو اور اسے کسی قسم کا فکر بھی دامن گیر نہ ہو، اس میں ایک عجیب قسم کے بھاری بھرکم، ثقاہت اور متانت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جسے یہ نصیب ہوتی ہے وہ اس کے سرور سے کیف اندوز ہوتا ہے اور دوسرے لوگ صرف اس کے مظاہر سے اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اسی طرح جس انسان کی مضمر قوتیں پورے نشوونما کے بعد، متناسب و متوازن ہو جائیں اس میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو اسے دوسرے انسانوں سے نمایاں طور پر متمیز کر دیتی ہے۔ اسی کو قرآن، مومن کا امتیازی نشان قرار دیتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لو کہ یہ کیفیت انفرادی طور پر پیدا نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، انسانی مضمر قوتوں کی نشوونما انفرادی طور پر ناممکن ہے۔ اس کے لئے اسے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے۔ جس اطمینانِ قلب کو کسی انفرادی عمل کا نتیجہ بتایا جائے وہ خواب آور افسوں ہوتا ہے۔ اور تصوّف میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جن افراد میں اطمینانِ قلب کی یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ اس کیفیت سے خود ہی لذت اندوز نہیں ہوتے رہتے۔ اس کیفیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ افراد، معاشرہ کا جزو بن کر اس کیفیّت کو پورے معاشرہ میں مشہود کریں۔

بالفاظِ دیگر، قرآنی اطمینانِ قلب کی کیفیت پیدا بھی معاشرے کے اندر ہوتی ہے۔ اور معاشرہ ہی اس سے متمتع بھی ہوتا ہے۔

جس طرح ایک فرد کی زندگی کی مضمر قوتوں میں ٹھیک ٹھیک تناسب ناگزیر ہے، اسی طرح معاشرہ (اجتماعی زندگی) میں مختلف قوتوں میں تناسب بھی نہایت ضروری ہے۔ جب کسی معاشرہ میں یہ تناسب قائم ہوجاتا ہے تو اسے "اصلاح" کی حالت کہتے ہیں اور جب یہ تناسب بگڑ جاتا ہے تو اسے حالتِ "فساد" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اصلاح کے معنی ہمواری۔ اور فساد کے معنی ناہمواری۔ "مصلحین" معاشرہ کے ان افراد کا نام ہے جن کی صلاحیتوں میں اس قسم کا تناسب و توازن قائم رہتا ہے۔ مفسدین انہیں کہتے ہیں جن میں یہ توازن موجود نہیں ہوتا۔ اصلاح کا نتیجہ اجتماعی ربوبیت ہے۔ یعنی اس معاشرہ میں تمام افرادِ معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان موجود ہوتا ہے (اس قسم کا معاشرہ خود ہی اس نشوونما کا ذریعہ بن جاتا ہے)۔ اس کے برعکس "مفسدین" کے معاشرہ میں بڑی ناہمواریاں ہوتی ہیں اور اجتماعی ربوبیت کے بجائے ہر فرد سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔

دوسری چیز موقعہ اور محل کا سوال ہے۔ یعنی ان قوتوں کی نشوونما کے بعد، اس چیز کا فیصلہ کہ کس موقعہ پر کس قسم کی قوت کا رُو بعمل آنا ضروری ہے۔ قرآن اس قسم کی قوّتِ تمیز کو "بصیرت" سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی لئے وہ مردانِ مومن کے متعلق کہتا ہے کہ وہ "اولی الایدی والابصار" صاحبانِ قوت و بصیرت ہوتے ہیں۔ یہ بصیرت قرآن میں غور و فکر سے پیدا ہوتی ہے۔

اب سلیم! ایک قدم آگے بڑھو۔ لیکن جتنا کچھ اس وقت کہا گیا ہے پہلے اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلو، پھر بات آگے چلے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کہتا چلا جاؤں اور تم "بابا فتے خاں" کی طرح سوتے ہی میں "ہوں ہوں" کرتے رہو۔ تم "بابا فتے خاں" پر تو ہنسا کرتے تھے لیکن اگر غور کرو تو دنیا میں اکثریت فتے خانوں ہی کی پاؤ گے۔ سو رہے ہیں اور "ہوں، ہوں" کر رہے ہیں۔ بات سمجھنے والے بہت کم دکھائی دیں گے۔ اور پھر، جب تم بات بھی ایسی چھیڑ دو جو دنیا جہان سے نرالی ہو تو اس پر کان دھرنے والے کتنے مل سکیں گے؟ ایک وہ تھے جو کہتے تھے کہ

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے!

اور ایک ہم ہیں کہ کہانی کہہ رہے ہیں، اور اوّل تو اسے سننے والے ہی نہیں ملتے، اور جو سُن کر "ہنکارا" بھر رہے ہیں ان کے متعلق بھی شُبہ ہے کہ نہ معلوم جاگ رہے ہیں یا سوتے ہی میں "ہوں ہوں" کئے جا رہے ہیں! بہرحال تمہارا تقاضا ہوتا ہے تو میں کہانی شروع کر دیتا ہوں۔ اب سننا نہ سُننا تمہارا کام ہے۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ خدا کے جس قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) کے مطابق انسان کی تخلیق ہوئی ہے اس کے مطابق

(i) مقصودِ تگ و تاز یہ ہے کہ ہر انسان کی امکانی وسعتوں HUMAN POTENTIALITIES کی پوری پوری نشو و نما DEVELOPMENT ہو جائے۔

(ii) یہ نشو و نما انفرادی طور پر ناممکن ہے۔ اس کے لئے نظامِ اجتماعی لاینفک ہے۔

(iii) اور نظامِ اجتماعی میں ان کی صحیح نشو و نما اسی صورت میں ممکن ہے جب ان میں ٹھیک ٹھیک تناسب قائم ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ کس موقعہ پر کس قسم کی قوّت رُو بہ عمل آنی چاہیئے۔

اب آگے بڑھو۔ عالمِ آفاق (باہر کی دنیا) میں خدا کا قانون اس طرح کار فرما ہے کہ کائنات کی متضاد قوّتوں میں کبھی تصادم واقعہ نہیں ہوتا۔ ان میں ٹھیک ٹھیک تناسب بھی قائم رہتا ہے اور جہاں جس قوّت کی ضرورت ہوتی ہے اور جتنی ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ قوّت اتنی ہی مقدار میں بروئے کار آجاتی ہے کُلٌّ لَهٗ قَانِتُوْن کے یہی معنی ہیں۔

لیکن انسان کی دنیا میں یہ قانون اس طرح نافذ العمل نہیں۔ انسان کو آزادی حاصل ہے۔ اسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے اس نے صحیح اور غلط راستے کو اپنے فیصلے سے اختیار کرنا ہے۔ اس باب میں انسان نے اپنے جذبات کی رُو سے کیا فیصلہ کیا، یہ داستان دلخراش بھی ہے اور تبسّم خیز بھی۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ انسان کے اندر بعض قوّتیں شر کا موجب ہیں اس لئے ان کا علاج یہ ہے کہ انہیں دبا دیا جائے۔ اگر تم غور کرو تو یہ حقیقت تمہارے سامنے آجائے گی کہ انسان کی ساری تاریخ اسی لفظ "دبانے" SUPPRESSION ہی کی تفصیل ہے۔ انفرادی دنیا میں یہ "دبانا" رہبانیت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ رہبانیت کیا ہے؟ ان قوّتوں کے دبانے (اور دبا دبا

کہ بالآخر انہیں، بزعم خویش فنا کر دینے) کا فلسفہ اور عمل، لیکن یہ انسان کی بھول تھی. انسان کے اندر نہ تو کوئی ایسی قوت ہے جو بجائے خویش شر ہے اور نہ انسانی قوتیں دبانے سے فنا ہوتی ہیں. انہیں ایک طرف سے دبایئے تو نہ معلوم کتنے غیر معلوم "چور دروازوں" کے راستے باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہیں. لہذا رہبانیت (جو آگے چل کر خانقاہیت اور تصوف کے نام سے چور دروازوں سے مسلمانوں میں گھس آئی) انسان کی غلط نگہی کے سوا کچھ نہیں. یہ تو تھا انسان کی انفرادی زندگی کے متعلق. اس کی اجتماعی زندگی میں یہی "دبانے" کا عمل، استبداد ملوکیت کی شکل میں ظہور پذیر ہوا. استیلاء پسند انسانوں نے جب دیکھا کہ فلاں فلاں قوتیں ان کے مفاد کی راہ میں حائل ہیں، تو انہوں نے ان قوتوں کو دبانے اور دبا کر فنا کر دینے کی تدابیر سوچنی شروع کر دیں. (قانونِ خداوندی کے بجائے انسانوں کا تراشیدہ) نظامِ حکمرانی اسی "دباؤ کے عمل" کی منظم شکل ہے. نام مختلف ہیں. صورتیں بھی متنوع ہیں. لیکن روح ہر جگہ وہی کار فرما ہے. اس مقصد کے لئے انسان نے "عہدِ جاہلیت" میں لوہے کے شکنجے وضع کر رکھے تھے. اب تہذیب و تمدن کا دور ہے اس لئے آہنی شکنجوں کی جگہ آئینی شکنجوں نے لے لی ہے. مقصد دونوں کا ایک ہی ہے. تم نے پڑھا ہوگا سلیم! جب ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ کر کے خلیفہ کو گرفتار کر لیا تو یہ مسئلہ پیش ہوا کہ خلیفہ کے ساتھ کیا کیا جائے. ہلاکو خاں نے کہا کہ اسے قتل کر دیا جائے. لیکن اس کے مشیروں نے اس سے کہا کہ مسلمانوں میں خلیفہ کا مقام بہت بلند ہوتا ہے اور اس کی شخصیت بڑی مقدس. ہم نے سُنا ہے کہ اگر خلیفہ کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گر جائے تو زمین شق ہو جاتی ہے. اس لئے اس خلیفہ کی خونریزی خطرہ سے خالی نہیں. اس پر ہلاکو متردّد ہوا کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہو. چنانچہ حل یہ سوچا گیا کہ خلیفہ کو بڑے بڑے نمدوں میں لپیٹ کر کچل دبا جائے تاکہ اس کے مقدس خون کا کوئی قطرہ زمین پر گرنے نہ پائے. انسان کے دورِ جہالت اور زمانۂ تہذیب میں، سلیم! بس اتنا ہی فرق ہے. "دباؤ" استبدادی شکنجے اب بھی وہی ہیں. فرق اتنا ہے کہ اب کوشش یہ کی جاتی ہے کہ جسے کچلا جائے اس کے خون کے قطرے ٹپکتے دکھائی نہ دیں.

قرآن نے آکر کہا کہ یہ "دبانے کا عمل" یکسر غلط ہے. نہ رہبانیت کا دباؤ درست ہے، نہ ملوکیت کا. (قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا) جس نے انسانی قوتوں کو دبایا وہ تباہ ہو گیا. اسے یہ قوتیں دبانے اور کچلے جانے کے لئے نہیں دی گئیں. انسان یوں ہی اتفاقی طور پر وجود میں نہیں

آگیا کہ اس میں کارآمد اشیاء کے ساتھ ساتھ کچھ مضر عناصر بھی رہ گئے ہوں جنہیں ختم کرنا ضروری ہے۔ اس کی تخلیق خدا کے قانونِ تخلیق کے مطابق عمل میں آئی ہے اور خدا کا قانون ایسا ناقص نہیں کہ وہ مفید کے ساتھ مضر اور خیر کے ساتھ شر کو بھی لگا رہنے دے۔ اور اس کے بعد اس کی ایسی صفائی کی ضرورت پڑے کہ مضر کو مفید اور شر کو خیر سے الگ کر دیا جائے۔ تزکیۂ نفس کے معنی انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہے (وَقَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا) اسی کی کھیتی پروان چڑھتی ہے جو ان قوتوں کو کامل نشوونما دیتا ہے۔ فساد اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تم ان کا تناسب بگاڑ دیتے ہو۔ معاشرہ SOCIETY کے مختلف افراد کی صلاحیتوں میں صحیح صحیح تناسب BALANCE قائم رکھنا، یہی معاشرہ کا حُسن ہے۔ اقامتِ تناسب کا نام احسان ہے (یعنی حُسن قائم کرنا) بالفاظِ دیگر افراد کی بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کا رُخ اس طرف پھیر دینا جہاں ان صلاحیتوں کی کمی ہے۔ اور اس طرح معاشرہ میں ہمواری پیدا کر دینا۔ اسلامی معاشرہ میں مرکزِ امت اسی قسم کی ہمواریاں پیدا کرتا ہے۔ اس سے تمام افرادِ معاشرہ کی مضمر قوتوں کی ربوبیت کا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔ نہ بڑھی ہوئی قوتیں بیجا مصرف سے موجبِ تخریب بنتی ہیں، نہ پیچھے رہ جانے والے، سامانِ ربوبیت کی کمی سے مرجھا کر خشک ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ کیا ہوتا ہے؟ یوں سمجھو کہ ایک BLOOD BANK ہے، جو ان افراد سے خون لے کہ جہاں اس کی زیادتی سے رگیں پھٹ جانے کا احتمال ہو، ان جسموں میں داخل کر دیتا ہے جو کمیٔ خون کی وجہ سے کمزور ہو رہے ہوں۔ اس سے اوّل الذکر افراد کے مزاج میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور ثانی الذکر میں احسان (یعنی کمی کو پورا کر کے تناسب کا قیام) اس طرح معاشرہ کی تشکیل عدل و احسان کی رُو سے قائم ہو جاتی ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

(۱) انسان کو کیسے معلوم ہو کہ اس کے اندر کون کون سی قوتیں مضمر ہیں جن کا تزکیہ (نشوونما) ضروری ہے؟

(۲) ان قوتوں میں تناسب کس طرح قائم رکھا جائے؟

(۳) اور یہ کیسے معلوم ہو کہ کس موقع پر کس قوت کا مظاہرہ ضروری ہے؟

شق (۱) کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے کوئی خارجی معیار OBJECTIVE STANDARD

ہو جس سے وہ ان قوتوں کا اندازہ کرتا جائے۔ وہ معیار، قرآن کی رُو سے، ذاتِ خداوندی (اللہ) ہے۔
اللہ کی جو صفات قرآن میں مذکور ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک کو صفاتِ ذاتی PERSONAL ATTRI-BUTES کہیئے اور دوسری کو صفاتِ اخلاقی ETHICAL ATTRIBUTES مثلاً
ھُوَ الْاَوَّلُ میں صفتِ اوّلیت پہلی قسم کی ہے۔ یہ صفات تھوڑی سی ہیں۔ دوسری قسم کی صفات وہ ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً اللہ کے رنگ میں رنگے جاؤ اور اللہ کے رنگ سے زیادہ متناسب اور متوازن رنگ اور کون سا ہوگا۔ یہ وہ قوتیں ہیں جو انسان کے اندر مضمر ہیں اور جن کی نشوونما بدرجہ اُتم MAXIMUM DEVELOPMENT اس کی زندگی کا مقصود۔ یہ ہے وہ خارجی معیار جس کے مطابق یہ دیکھنا چاہیئے کہ انسان کے اندر کن صفات (قوتوں) کی نشوونما کا امکان ہے اور ان کی نشوونما کس حد تک ہو رہی ہے۔ اللہ اس آئیڈیل کا نام ہے جس میں تمام صفات اپنے انتہائی نقطہ تک تکمیل یافتہ ہیں اور ایک ایسے تناسب و توازن سے سموئی ہوئی ہیں جس سے بہتر تناسب تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ لہ الاسماء الحسنیٰ[1]۔ باقی رہا یہ کہ انسان اپنی ذات اور اپنے معاشرہ میں ان قوتوں میں تناسب کس طرح قائم رکھے، سو اس کا ذریعہ، قرآنی اوامر و نواہی ہیں۔ یعنی کس حد تک بڑھا جائے اور کہاں پہنچ کر رُک جائے۔ ان ہی کا نام حدود اللہ ہے۔ اس کو قرآنی نظامِ حیات کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ سوال سامنے آئے گا کہ کس مقام پر کون سی صفت (قوت) رُوبعمل آنی چاہیئے۔ سو اس کے لئے قرآن کے ان مقامات پر غور کرنا ضروری ہے، جن میں اممِ سابقہ اور انبیائے گذشتہ کے احوال و کوائف مذکور ہیں۔ ان سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ کس موقعہ پر خدا کی کون سی صفت ظہور میں آتی ہے۔ اسی سے یہ متعین کرنا ہوگا کہ کون سے مقام پر ہماری کس قسم کی قوت کو رُوبکار آنا چاہیئے۔ جب کسی معاشرہ کا انداز اس کے مطابق ہو جائے تو اس وقت کہا جائے گا کہ اس معاشرہ کی تشکیل فطرت اللہ (خدا کے تخلیقی قانون) کے مطابق ہے۔ یہی وہ معاشرہ ہوگا جس میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہوگی اور انہیں ٹھیک ٹھیک مقام پر، صحیح انداز کے مطابق صرف میں لایا جائے گا۔ جب انسانی معاشرہ ان خطوط پر متشکل ہوگا تو اس کا فطری نتیجہ (یعنی قانونِ تخلیق کے مطابق) یہ ہوگا کہ (وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا) زمین اپنے نشوونما

---

[1] تفصیل اس اجمال کی میری کتاب "من و یزداں" میں ملے گی۔

دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی اور یہی وہ نور ہوگا جس کی روشنی میں انسانیت اپنے بلند مقامات کی طرف رواں دواں چل پڑے گی. لہذا سلیم! سب سے پہلے اللہ کے اسماءِ حسنیٰ کا قرآنی مفہوم سمجھنا نہایت ضروری ہے. اس لئے کہ قرآنی تعلیم کی بنیاد یہی ہے. اسی لئے قرآن نے "اللہ پر ایمان" لانے پر اس قدر زور دیا ہے. اللہ پر ایمان لانے کا عملی نتیجہ اپنے آپ کا صحیح صحیح اندازہ لگانا اور اپنی منزلِ مقصود کو پہچاننا ہے. بالفاظِ دیگر، حدودِ بشری کے اندر، صفاتِ خداوندی کا اپنے اندر منعکس کئے جانا.

اُمید ہے سلیم! ان تصریحات سے فطرت اللہ کے متعلق اور گوشے بھی نکھر کر تمہارے سامنے آگئے ہوں گے اور اب اس عنوان پر تمہیں کچھ اور پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی ہوگی.

والسّلام

پرویز

اگست ۱۹۵۱ء

چھتیسواں خط

جنسی تعلّقات کا تمدّن پر اثر

سلیم میاں! تم نے بالآخر اس موضوع پر بھی بات چھیڑ دی جس سے تم اس وقت تک اتنی جھجک محسوس کر رہے تھے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ (تمہارے الفاظ میں) میرے احترام کے جذبہ پر اس موضوع کی اہمیت غالب آگئی۔ مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ تم نے بات کرتے وقت اس روایتی حجاب کو آڑے نہیں آنے دیا جو اس باب میں اکثر نوجوانوں کے گلوگیر ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے ایسے اہم عنوان پر صحیح راہنمائی سے محروم رہ جاتے ہیں! اور یہی حجاب ان کی تباہی کا موجب بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جنسی تعلقات کے موضوع کو اس قدر شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا ہے کہ "شریفوں کی مجلس" میں اس کا نام تک لینا بھی بے حیائی تصوّر کیا جاتا ہے۔ یہ غیر شعوری طور پر نتیجہ ہے اس خانقاہی ضابطۂ اخلاق MYSTICAL ETHICS کا جو عیسائیت کی رہبانیت سے تصوّف کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے ہاں آپہنچا اور جس نے تمہارے تمام تصوّرات کو متاثر کر دیا۔ چونکہ رہبانیت میں جنسی تعلقات کو سخت معیوب اور وجۂ ذلّتِ انسانیت سمجھا جاتا ہے اس لئے ہمارے ہاں بھی جنسیات کو نہایت شرمناک تصوّر کیا جاتا ہے اور کسی کے سامنے اس کا ذکر آجانے سے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ جب ہمارے معاشرے میں جنسیات کے ذکر تک کو اس قدر شرمناک سمجھا جاتا ہو تو ظاہر ہے کہ اس موضوع پر ہمارے ہاں لٹریچر کس طرح مل سکتا ہے! چنانچہ جہاں تک میری معلومات یادری کرتی ہیں ہمارے ہاں اس موضوع پر ایک کتاب بھی ایسی نہیں جسے سنجیدگی سے کسی نوجوان کے

ہاتھ میں دیا جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نوجوان (لڑکے اور لڑکیاں دونوں) چوری چھپے اس سطحی CHEAP جنسی لٹریچر کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں جو آوارگانِ مغرب کی بدلگام ذہنیت کا پیدا کردہ ہوتا ہے اور جس سے طرح طرح کے ذہنی، اعصابی اور جسمانی مفسدات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ (حالانکہ یورپ میں اس موضوع پر سائنٹیفک، سنجیدہ اور بلند پایہ لٹریچر کی بھی کمی نہیں لیکن چونکہ ہمارے نوجوان اس موضوع پر بات کرنے سے شرماتے ہیں اس لئے ان کی صحیح راہنمائی ہو نہیں سکتی اور ان کی رسائی صرف سطحی لٹریچر تک ہوتی ہے)۔ بہرحال تم نے اچھا کیا کہ اس موضوع کے متعلق بے تکلفی سے بات چھیڑ دی۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ نہایت نازک، لیکن بڑا اہم مسئلہ، اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آجائے۔ لو سنو۔

جب زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی، حیوانی سطح سے انسانی پیکر میں پہنچی تو وہ حیوانی زندگی کے بعض خصائص و لزومات بھی اپنے ساتھ لائی۔ کھانا پینا، سونا وغیرہ (جسم کا طبعی نظام) حیوان اور انسان میں مشترک ہیں۔ بالفاظِ دیگر، یہ انسانی زندگی کی حیوانی سطح کے مظاہر ہیں۔ انہی میں افزائشِ نسل PROCREATION اور اس کے لئے جنسی جذبہ SECUAL INSTINCT بھی شامل ہے۔

کھانے پینے کے معاملہ میں، حیوانات پر بعض پابندیاں فطرت کی طرف سے از خود عائد ہوتی ہیں۔ مثلاً بکری گھاس کھاتی ہے۔ گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ شیر گوشت کھاتا ہے۔ گھاس نہیں کھاتا۔ بطخ کے بچے انڈوں سے نکلتے ہی پانی کی طرف لپکتے ہیں۔ مرغی کے بچوں کو پانی کی طرف گھیر کر بھی لے جائیں تو وہ آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ حیوانات پر یہ پابندیاں از خود عائد ہوتی ہیں اور وہ انہیں توڑنے کا اختیار ہی نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس، انسانی بچے کو دیکھئے۔ وہ سنکھیا کی ڈلی کو بھی اسی طرح بے تکلفی سے منہ میں ڈال لیتا ہے جس طرح شاخِ نبات (مصری کی ڈلی) کو۔ وہ کبھی دہکتے ہوئے کوئلے کو ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے اور کبھی پانی میں ڈبکیاں لگاتا دکھائی دیتا ہے۔ اس پر فطرت کی طرف سے از خود ایسی پابندیاں نہیں عائد ہوتیں جیسی حیوانات پر عائد ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ پابندیوں کے بغیر زندگی دوبھر ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں ناممکن بھی ہو جاتی ہے اس لئے انسان پر بھی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ پابندیاں یا تو معاشرہ کی طرف سے عائد کی

جاتی ہیں اور یا مذہب کی طرف سے۔ (مذہب کے بجائے وحی کا لفظ زیادہ موزوں ہے اس لئے آئندہ صفحات میں اسے وحی ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ وحی سے مراد ہے ایسی پابندیاں جو انسانی معاشرہ کی طرف سے عائد کردہ نہ ہوں بلکہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہوں)۔

معاشرتی پابندیاں

معاشرہ کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں اور وحی کی رُو سے متعین کردہ پابندیوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی پابندیاں بعض مصالح کی بناء پر بدلی بھی جاسکتی ہیں، لیکن وحی کی رُو سے عائد کردہ پابندیوں میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً معاشرہ کسی وقت فیصلہ کرتا ہے کہ لوگوں کو سڑک کے بائیں طرف چلنا چاہیئے۔ اس فیصلہ کی رُو سے KEEP TO THE LEFT سڑک کا قانون قرار پا جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی وقت معاشرہ اس کی ضرورت محسوس کرے تو وہ اس قانون کو بدل کر "دائیں طرف چلو" کا قانون بھی نافذ کرسکتا ہے۔ اس کے برعکس جب وحیٔ خداوندی نے کہا ہے کہ (مثلاً) لحمِ خنزیر حرام ہے تو کوئی انسان اس قانون میں ترمیم نہیں کرسکتا۔ وحیٔ خداوندی کے ماننے والوں کو لحمِ خنزیر سے اسی طرح پرہیز کرنا ہوگا جس طرح بکری گوشت سے پرہیز کرتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ بکری ایسا اپنی مرضی سے نہیں کرتی، لیکن انسانوں کو ایسا اپنے اختیار و ارادہ سے کرنا ہوگا۔

کھانے پینے کے علاوہ، جنسی جذبہ کی تسکین کے سلسلہ میں بھی حیوانات پر فطرت کی طرف سے

جنسی جذبہ پر پابندیاں

کنٹرول عائد ہوتا ہے۔ ایک بیل ہر روز گایوں کے گلے میں پھرتا رہتا ہے لیکن کبھی جنسی اختلاط نہیں کرتا، تاوقتیکہ اسے گائے کی طرف سے استقرارِ حمل کا طبعی تقاضا اس کی دعوت نہ دے۔ لیکن انسان پر اس قسم کا کوئی کنٹرول نہیں عائد کیا گیا۔ وہ جب جی چاہے، اپنے جنسی جذبہ کی تسکین کرسکتا ہے۔

حیوانات پر اس طبعی کنٹرول کے علاوہ (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) کسی قسم کا اخلاقی کنٹرول عائد نہیں کیا گیا (حیوانات کی صورت میں اخلاقیات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔ لیکن انسان پر اس ضمن میں اخلاقی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ (جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے) یہ پابندیاں معاشرہ کی طرف سے بھی عائد کی جاتی ہیں اور وحی کی رُو سے بھی۔ معاشرتی پابندیوں پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ پابندیاں مختلف اقوام و ممالک میں مختلف نوعیتوں کی ہیں۔ نیز، کسی ایک ہی

قوم میں، مختلف زمانوں میں، ان پابندیوں میں ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انگلستان میں اگر ایک بالغ لڑکا اور لڑکی، باہمی رضامندی سے (شادی کے بغیر) جنسی اختلاط کی صورت پیدا کر لیں تو معاشرہ کی نگاہوں میں یہ کوئی معیوب بات نہیں۔ نہ ہی ایسا کرنا قانوناً جُرم ہے۔ اسی طرح اگر ایک شادی شدہ مرد یا عورت کسی اور سے جنسی تعلق پیدا کر لے تو یہ کوئی معاشرتی جرم نہیں۔ یہ اسی صورت میں جرم قرار پائے گا جب میاں یا بیوی کو اس پر اعتراض ہو۔ ان پابندیوں میں ردّ و بدل بھی ہوتا رہتا ہے مثلاً اس وقت تک وہاں یہ صورت ہے کہ اگر کسی غیر شادی شدہ لڑکی کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے اور بچے کا باپ اس لڑکی سے شادی نہ کرے تو وہ بچہ حرامی قرار پاتا اور سوسائٹی میں ذلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن پچھلے دنوں وہاں ایک تحقیقاتی کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ ایسے تعلقات کو جائز سمجھا جائے، ان سے پیدا شدہ بچوں کو معاشرہ کا صحیح جزو قرار دیا جائے اور انہیں حقارت کی نظروں سے نہ دیکھا جائے۔ وقس علیٰ ہذا۔ (اس وقت ان فیصلوں پر تنقید و تبصرہ مقصود نہیں۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ اگر معاشرہ چاہے تو اپنی عائد کردہ پابندیوں میں تبدیلی بھی کر سکتا ہے۔

اس کے برعکس، اس باب میں وحی (یعنی قرآنِ کریم) نے بھی کچھ پابندیاں عائد کی ہیں۔ ان

وحی کی پابندیاں

پابندیوں کا ماحصل یہ ہے کہ معروف طریقہ پر شادی کے بغیر کسی لڑکے یا لڑکی (مرد و عورت) کو جنسی اختلاط کی قطعاً اجازت نہیں۔ اور شادی کے بعد، نہ بیوی کسی غیر مرد سے اختلاط پیدا کر سکتی ہے، نہ میاں کسی اور عورت سے۔ اس قسم کا اختلاط، فرد کا نہیں بلکہ، معاشرہ کا جرم ہے۔ اس (جرم زنا) کی سزا معاشرہ کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اور ان پابندیوں میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا۔

مغرب کی جنسی بے باکیوں سے متاثر ہو کر، ہمارے ہاں کے نوجوان طبقہ میں بھی یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ مرد اور عورت کا جنسی تعلق ایک طبعی تقاضے کی تسکین یا افزائش نسل کے لئے ایک حیاتیاتی عمل BIOLOGICAL ACTION ہے اور بس۔ اس معاملہ کو لڑکی اور لڑکے کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور نکاح وغیرہ کی پابندی، محض قانونی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہونی چاہیئے، نہ کہ بالغ مرد اور عورت کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے۔ ان خیالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بھی (مغرب کی طرح)، جنسی نوضویت SEXUAL ANRCHY کی فضا

عام ہوتی جارہی ہے اور وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں [یعنی عفت وعصمت CHASTITY کے مطالبہ] کو غیر فطری جکڑ بندیاں قرار دیا جارہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں محض معاشرہ میں نظم وضبط قائم رکھنے کے لئے ہیں یا ان کا تعلق عالمِ انسانیت کے اجتماعی مصالح سے ہے؟ اگر ان کا مقصد محض معاشرتی نظم وضبط ہے تو بے شک معاشرہ کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ (اپنے مصالح کے پیشِ نظر) ان میں ردّ و بدل کرسکے۔ لیکن اگر ان کا تعلق انسانیت کے کسی بنیادی مسئلہ سے ہے تو پھر کسی فرد یا افراد کے کسی گروہ کو اس کا حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ، اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے، ان پابندیوں میں تبدیلی کرکے، انسانیت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچائے۔

ان پابندیوں کی مصلحت

قرآن نے جب زنا کو معاشرہ کا جرم قرار دیا ہے تو اس سے مطلب یہی ہے کہ اس کے نزدیک جنسی تعلق محض ایک انفرادی فعل نہیں بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس کا اثر اجتماعی انسانیت پر پڑتا ہے۔ دوسری طرف جب اس نے کہا کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ ...... هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ (۲۳/۱-۵) تو اس سے واضح الفاظ میں اعلان کردیا کہ عفت وعصمت کا، قوموں کی فلاح وبہبود سے گہرا تعلق ہے۔ جو قوم عصمت کی حفاظت نہیں کرتی وہ زندگی کے میدان میں فائز المرام PROSPEROUS نہیں ہوسکتی۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے کی صداقت کی شہادت کیا ہے؟ جو لوگ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کے ان تمام دعاوی کو سچا مانتے ہیں۔ لیکن سوال ان لوگوں کا نہیں۔ سوال تو ان کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اس دعوے کو بطور ایمان FAITH ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اس کے ثبوت میں علمی تائید اور شہادت چاہتے ہیں۔

قرآنی دعوے کی دلیل

ان لوگوں (بالخصوص ہمارے نوجوان طبقہ) کا یہ مطالبہ ایسا نہیں جسے ہم لاحول پڑھ کر ٹھکرا دیں اور انہیں ملحد و بے دین کہہ کر تیوریاں چڑھا لیں۔ قرآن اپنے ہر دعوے کی بنیاد علم وبصیرت پر رکھتا ہے اور اسے دلیل و برہان کی رُو سے منواتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی، قرآنی حقائق کھل کر سامنے آتے چلے جائیں گے۔ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳) "ہم انہیں انفس وآفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاآنکہ یہ چیز نکھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔" لہٰذا دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جنسی تعلقات کے متعلق جس قدر تحقیقات ہمارے زمانے میں ہو چکی ہیں وہ قرآن کے دعوے کی کس حد تک تائید کرتی ہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور وقت کا نازک ترین مسئلہ۔ اس لئے اس قابل کہ اس پر بڑی توجہ اور گہری فکر سے غور وخوض کیا جائے۔

غور و فکر

جنسیات کے متعلق ہمارے ہاں کوئی تحقیق نہیں ہوئی اس لئے اس کے نتائج کو سامنے لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ایک جنسیات ہی پر کیا موقوف ہے، زندگی کے اور کون سے شعبے ہیں جن کے متعلق ہمارے ہاں کوئی ریسرچ ہوئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قوم پر صدیوں سے سوچنا حرام ہو چکا ہو اور تقلیدِ کہن زندگی کی محمود روش قرار پا چکی ہو، ان میں فکری صلاحیتیں بہت کم باقی رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس مقصد کے لئے بھی مغرب کے محققین کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا۔ یورپ میں (دیگر شعبوں کی طرح) جنسیات نے بھی ایک مستقل

عُلمائے مغرب کی تحقیقات

سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے لئے وہاں تحقیقاتی ادارے قائم ہیں۔ علمائے عمرانیات SOCIOLOGISTS تہذیب کے مؤرّخ، علمائے جنسیات اور ماہرینِ علم تجزیۂ نفس PSYCHO ANALYSTS وغیرہ ہم نے اس موضوع پر کافی چھان بین کی ہے اور جنسیات سے متعلق لٹریچر خاصی مقدار میں شائع ہو چکا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کی تحقیقات کا بالعموم انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے دُور دراز علاقوں میں بسنے والے قدیم باشندوں PRIMITIVE TRIBES کے احوال وکوائف، بود وماند، رسوم ومعاشرت اور اجتماعی اعمال ومعتقدات کا مطالعہ کرتے اور اس طرح حاصل کردہ مسالہ DATA سے نتائج مستنبط کرتے ہیں[1]۔ اس مقصد

---

[1] واضح رہے کہ ان کا انداز، اس طریق سے مختلف ہے جو آجکل (بالخصوص) امریکہ میں رائج ہے اور جس کی رُو سے ایک خاص خطّہ یا طبقہ کے لوگوں کو سوال نامہ دے دیا جاتا ہے اور ان کے جوابات سے اعداد وشمار STATISTICS مہیا کر کے نتائج اخذ کر لئے جاتے ہیں اور ان کے نتائج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عالمگیر

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے۔ لئے انہیں جن صبر آزما اور مشقّت طلب مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر افریقہ کے صحراؤں، جنوبی امریکہ کے جنگلوں، قطبین کے برفانی میدانوں اور ہمالیہ کے پہاڑوں میں گذار دی۔ وہ وہاں کے وحشی قبائل میں جا کر رہے۔ انہی کی معاشرت اختیار کی۔ وہی کچھ کھایا جو وہ کھاتے تھے۔ وہی کچھ پہنا جو وہ پہنتے تھے، انہی کے ساتھ کبھی درختوں کے کھوکھلے تنوں میں، کبھی ان کی شاخوں کے اوپر، کبھی پہاڑوں کے غاروں میں اور کبھی درندوں کے بھٹوں میں زندگی بسر کی۔ بعض اوقات انہی میں شادیاں بھی کیں اور اسی طرح انہی میں گھل مل کر ان کی معاشرت اور معتقدات کا دقّتِ نظر سے مطالعہ کیا اور یوں ان کے متعلق براہِ راست معلومات فراہم کیں۔ ان محققین نے دنیا کے قبائل کی معاشرت اور معتقدات کے مطالعہ کے بعد جن موضوعات کے متعلق اصول متعیّن کئے ہیں ان میں جنسیات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے مرتّب کردہ نتائج ہمیں اس حقیقت تک پہنچاتے ہیں کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلق کا معاملہ شہوانی جذبہ کی تسکین تک محدود نہیں ہوتا۔ اس کا اثر بڑا دُور رس ہوتا ہے۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ کسی قوم کے تمدّن CULTURE کا اس سوال سے بڑا گہرا تعلق ہے کہ اس قوم نے جنسی تعلقات کو آزاد چھوڑ رکھا تھا یا اس پر پابندیاں لگا رکھی تھیں، اور اگر پابندیاں لگا رکھی تھیں تو وہ کس نوعیت کی تھیں۔ انہی محققین میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر J D UNWIN

ڈاکٹر اَنوِنْ

کا نام خاص شہرت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر اَنوِنْ نے دنیا کے مختلف حصّوں میں بسنے والے اسّی غیر مہذّب (قدیم) قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس نقطۂ نگاہ سے کیا ہے کہ انسانی زندگی میں جنسیات اور کلچر کا کیا تعلق ہے؟ اگر ان میں ایک قبیلہ جنوبی امریکہ کا ہے، تو دوسرا قطب شمالی کا۔ ایک آسٹریلیا کا ہے، تو دوسرا صحرائے افریقہ کا۔ اس کے بعد اس محقق نے سولہ مہذّب اقوام کی معاشرت کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے نتائجِ تحقیقات کو اپنی گراں بہا کتاب SEX AND CULTURE میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ ہے:

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) اور فطرتِ انسانی کے ترجمان ہیں۔ آجکل امریکہ میں KINSLEY کی قسم کے محقق اور اسی انداز سے جنسیات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ طریقِ کار کبھی عالمگیر UNIVERSAL نتائج تک نہیں پہنچا سکتا۔

دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل، سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے اس لیئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے. میری اس تحقیق کا ماحصل، اور اس سے مستنبط کردہ نتائج اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں.

اصل کتاب سے پہلے، دیباچہ میں لکھا ہے کہ

> اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے. ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بناء پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھی ہوں (x۱۷)

اسی کلیہ کو اس نے اصل کتاب میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے.

> کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لیے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے. (ص ۳۴۰)

آپ نے غور کیا کہ یہ محقق اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے؟ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جنسی تعلقات محض ایک حیوانی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دارومدار اسی جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے. حتیٰ کہ ڈاکٹر انون یہ بھی لکھتا ہے کہ:-

> اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہو گا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا. (۲۰۳)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

> جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں. (ص ۳۳۰)

اس لئے اگر کسی قوم میں تمدنی تبدیلی واقع ہو. یعنی اسے دنیا میں عروج حاصل ہو یا اس پر زوال

آجائے، تو اس عروج وزوال کے اسباب کے لئے دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس قوم نے سوسال پہلے اپنے ہاں جنسی تعلقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں. جیسی وہ تبدیلیاں ہوں گی اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے۔

سب سے پہلے تجرّد کی زندگی CELIBACY کو لو، جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسلکِ خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لئے اوّلین شرط قرار دیتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر

جبری تجرّد

انون کی تحقیق یہ ہے کہ جبری تجرّد COMPULSORY CELIBACY کے اثرات انسانی تمدّن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔ (ص ۸۴)

جبری تجرّد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقائد یا معاشرتی ضوابط میں شامل کردی جائے کہ تجرّد کی زندگی وجہ شرف و تقدّس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں. جیسے عیسائیوں کے ہاں NUNS اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں.

عیسائیت یا مسلکِ خانقاہیت میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تجرد کی زندگی ہی شرفِ انسانیت کی زندگی ہے، تو دوسری طرف آج کل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں کسی قسم کی بھی پابندی عائد کی جائے تو اس سے انسان کے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور اس سے خطرناک قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال یکسر غلط ہے. جنسی جذبات پر پابندیاں عائد کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں، انہیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے۔ (دیباچہ xiii)

اس تمہید کے بعد آگے چلو. ڈاکٹر انون نے قدیم غیر مہذب قبائل کی تمدّنی سطح کو تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے. وہ سب سے نچلے درجے کا نام ZOISTIC رکھتا ہے. اس سے اوپر

تین گروہ

MANISTIC کا درجہ ہے، اور سب سے اوپر DEISTIC کا درجہ. اس کے بعد وہ اسّی (۸۰) قبائل کی تمدّنی سطح کے مطالعہ کے بعد جن نتائج پر پہنچتا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں.

۱. جس گروہ نے کنوارپن PRE-NUPTIAL کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے

رکھی تھی وہ تمدّن کی پست ترین سطح پر تھے۔

۲. جن قبائل میں، زمانۂ قبل از نکاح میں، جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عائد تھیں وہ تمدّنی سطح کے درمیانی درجہ پر تھے اور

۳. تمدّن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت و بکارت CHASTITY کا شدّت سے تقاضا کرتے تھے اور زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے۔ (۳۲۵ ـ ۳۰۰)

اس کے بعد ڈاکٹر انون شادی کے بعد کے جنسی ضوابط سے بحث کرتا ہے۔ لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے وہ اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ

> شادی کے بعد کے ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کرسکتے جب تک شادی سے پہلے کی زندگی میں عفت و عصمت پر زور نہ دیا جائے۔ (۳۴۳)

اس مقصد کے لئے وہ شادی کو چار بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ یعنی

(۱) عورت اپنی ساری زندگی میں ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے اور مرد ساری زندگی میں ایک عورت کا خاوند رہے۔ ان کے رشتۂ نکاح کے منقطع ہونے کی کوئی شکل نہ ہو۔ بجز اس کے کہ عورت ناجائز فعل کی مرتکب ہو جائے۔ اس کا نام، اس کے نزدیک مطلق وحدتِ زوج ABSOLUTE MONOGAMY ہے۔

(۲) رشتۂ نکاح عمر بھر کے لئے نہ ہو بلکہ فریقین کی رضامندی سے منقطع بھی ہوسکتا ہے۔ اسے وہ ترمیم شدہ وحدتِ زوج MODIFIED MONOGAMY کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

(۳) عورت تو صرف ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے لیکن مرد کو اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھ سکے۔ اس کا نام اس کے نزدیک مطلق تعدد ازواج ABSOLUTE POLYGAMY ہے۔ اور

(۴) اگر مرد، دوسری عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرے (یعنی ایک سے زیادہ بیویاں کرلے) تو عورت بھی آزاد ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں چلی جائے۔ اسے وہ ترمیم شدہ تعددِ ازواج

MODIFIED POLYGAMY کہتا ہے۔

ڈاکٹر انون کا کہنا ہے کہ

> آج تک کوئی قوم شق (۱) کے "مطلق وحدتِ زوج" کے مسلک کو زیادہ طویل عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکی۔ (۳۴۴)

اس لئے کہ یہ شکل اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب معاشرہ میں عورت کی کوئی حیثیت تسلیم نہ کی جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ ہمیشہ اپنے خاوند کی مطیع و فرمانبردار لونڈی بن کر رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی معاشرہ میں ایسی صورت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی، کیونکہ عورت کی طرف سے اس کا ردِّ عمل ایسا شدید ہوتا ہے کہ وہ پھر معاشرہ کے تمام جنسی قیود کو توڑ کر "کامل آزادی" کا مطالبہ کر دیتی ہے۔ اور اس کامل آزادی کے معنی ہوتے ہیں جنسی فوضویت SEXUAL ANARCHY

> جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ (۳۴۵)

اس کے بعد ڈاکٹر انون نے کہا ہے کہ تاریخ اس وقت تک جن اقوام و قبائل کے حالات

بہترین تمدّن کی حامل قوم

محفوظ رکھ سکی ہے ان میں سب سے بہتر تمدّن کی حامل وہ قوم تھی جو شادی سے قبل جنسی اختلاط کی مطلقاً اجازت نہیں دیتی تھی اور شادی کے بعد شق (۲) کی ترمیم شدہ وحدتِ زوج کی پابند تھی۔ یعنی جن کا عام اصول یہ تھا کہ شادی کے بعد بھی جنسی تعلق صرف میاں بیوی میں رہے۔ رشتہ نکاح محکم و استوار ہو، لیکن ناقابلِ تنسیخ نہ ہو ـــــ بلکہ بعض حالات کے تحت منقطع بھی ہو سکتا ہے

یہ بعینہٖ وہ شکل ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنسی تعلقات پر اس قسم کی قیود و حدود عائد کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر انون نے، مختلف ماہرینِ علوم کی شہادات سے اہم نتائج مستنبط کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

> جنسی تعلقات کی حدبندی سے ایک قسم کا ذہنی اور عصبی تناؤ TENSION پیدا ہوتا ہے جس سے جذباتی توانائی میں ارتکاز COMPRESSION پیدا ہو جاتا ہے۔ (۳۱۳)

یہ مرتکز شدہ معاشرتی توانائی اپنی نمود کے مختلف راستے تلاش کرتی ہے۔ اس نفسیاتی عمل کو، ڈاکٹر فرائڈ کی اصطلاح میں کظامت SUBLIMATION کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ

> نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود اور پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیز محاسبۂ خویش کی صلاحیت بھی۔ (۳۱۷)

بہتر ہو کہ اس موقعہ پر خود فرائڈ کے الفاظ ہمارے سامنے آجائیں۔ وہ لکھتا ہے کہ

فرائڈ کی تحقیق

> ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوئی ہے کہ لوگوں نے اپنے قدیم جذبات کی تسکین میں ایثار و قربانی سے کام لیا ہے اور یہ عمارت دن بدن اوپر کو اٹھتی جا رہی ہے، کیونکہ ہر فرد اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے۔ ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ (جب ان کی بے باکانہ تسکین ہی مقصدِ زندگی نہ بن جائے تو) یہ اپنا رُخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں (جسے SUBLIMATION کہتے ہیں) اور اس طرح افراد کی فالتو توانائی جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر ان گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

تم نے دیکھ لیا کہ، فرائڈ کی تحقیق کے مطابق، اگر جنسی توانائیوں کو بے محل ضائع نہ کیا جائے تو یہ انسانی تہذیب و تمدن کے قصرِ حسین کی تعمیر میں کس قدر ممد و معاون بن جاتی ہیں[1]۔

---

[1] اس مقام پر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ فرائڈ نے جنسیات کے متعلق اپنی تحقیق اور فکر میں جس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں اور ان کے جو نقصان رساں نتائج مغربی معاشرہ میں نمودار ہو رہے ہیں وہ میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ لیکن میں اس وقت صرف فرائڈ کے اس خیال سے بحث کر رہا ہوں کہ جنسی توانائی کو اگر بیباک نہ ہونے دیا جائے تو یہ اپنا رُخ تعمیری مقاصد کی طرف موڑ لیتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

فرائڈ نے اس طریقِ عمل کا نام SUBLIMATION رکھا ہے. یہ علم تجزیۂ نفس PSYCHO-ANALYSIS کی ایک اہم اصطلاح ہے اور دورِ حاضر کی ایک گراں قدر نفسیاتی تحقیق. لیکن تم یہ سُن کر حیران ہو گے کہ انسانی ذہن نے جہاں اسے بیسویں صدی میں دریافت کیا ہے، قرآن نے چھٹی صدی عیسوی میں (جسے عام طور پر ازمنۂ مظلمہ DARK AGES کہا جاتا ہے) کس طرح اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا. سورہ آلِ عمران میں مومنین کی ایک صفت "الکاظمین الغیظ" بتائی گئی ہے (۳/۱۳۳)۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس لفظ کے بنیادی معنی کو سامنے لانا ضروری ہے. عرب ایک گرم اور خشک ملک ہے جہاں پانی کی اکثر قلّت رہتی ہے. وہ کرتے یہ تھے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کنوئیں کھودتے. ان میں کسی میں کم پانی نکلتا کسی میں زیادہ. پھر وہ ان کنوؤں کو آبدوز نالیوں SUBTERRANEAN CHANNELS کے ذریعے ایک دوسرے سے ملا دیتے. اس طرح جس کنوئیں میں پانی زیادہ ہوتا اس کا فالتو پانی دوسرے کنوئیں کی طرف منتقل ہو جاتا اور یوں تمام کنوؤں میں پانی کی تقسیم یکساں ہو جاتی. اس طریقِ عمل کو ان کے ہاں کظامت کہا جاتا تھا. لہذا کاظمین الغیظ کے معنی ہوئے وہ لوگ جو اپنی اس حرارت اور توانائی کو جو غصّے کی شکل میں باہر نکلنا چاہتی ہے، کسی دوسری طرف منتقل کر کے اس سے تعمیری نتائج کا کام لیں. یہی وہ حقیقت ہے جسے عصرِ حاضر کے ماہرین تجزیہ نفس نے SUBLIMATION سے تعبیر کیا ہے.

قرآنی کظامت

اب میں پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں. ڈاکٹر انون نے بتایا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوّتِ فکر و عمل اور محاسبۂ خویش کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے. اس کے برعکس

> جو قوم اپنے مرد اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں، ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں. چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا. وہ حیوانوں کی طرح بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے. نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لئے توانائی باقی نہ رہی.

اضمحلال قرآن کریم نے ایک جگہ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَلَا یَزْنُوْنَ وہ زنا کے قریب تک نہیں جاتے۔ اس لئے کہ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا (۲۵/۶۸) جو قوم ایسا کرتی ہے اسے اِثْمٌ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ عربی زبان میں اَثِمَةٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تھک کر مضمحل ہو جائے اور اس میں اتنی توانائی نہ رہے کہ وہ باقی قطار کے ساتھ چل سکے۔ اس لئے وہ ان سے پیچھے رہ جائے۔ تم غور کرو کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ کے اندر اس تمام حقیقت کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے جس تک دورِ حاضر کی تحقیق اس قدر تجربات کے بعد پہنچی ہے۔ یعنی یہ کہ جنسی جذبات کو آزادانہ چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مضمحل ہو جاتی ہے اور زندہ اقوام کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس میں وہ معاشرتی توانائیاں نہیں رہتیں جو قوموں کو تمدنی بلندیاں عطا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر اَنوِن نے یہ بھی کہا ہے کہ

> مردوں کی عصمت اسی صورت میں معاشرتی توانائی پیدا کر سکتی ہے جب عورتیں باعصمت ہوں اور ان کی عصمت، شادی سے قبل اور بعد دونوں زمانوں میں محفوظ رہے۔ (۳۲۳)

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، قرآن مردوں اور عورتوں دونوں کی عصمت پر یکساں زور دیتا ہے۔ وہ الْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ (وہ مرد جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہوں) کے ساتھ وَالْحٰفِظٰتِ (۳۳/۳۵) بھی کہتا ہے۔ یعنی وہ عورتیں جو اپنے دامنِ عفت کو داغدار نہ ہونے دیں۔ اور جرم زنا کی سزا بھی مرد و عورت دونوں کے لئے یکساں تجویز کرتا ہے۔ (۲۴/۲)۔

قرآن کی رُو سے جنسی اختلاط کی صرف ایک ہی صورت جائز ہے۔ یعنی نکاح۔ لہٰذا قبل از نکاح

قرآنی حدبندی جنسی اختلاط اور نکاح کے بعد عورت کا کسی دوسرے مرد سے، یا مرد کا کسی دوسری عورت سے، جنسی اختلاط (خواہ وہ تراضیٔ مابین ہی سے کیوں نہ ہو) زنا ہے۔ نکاح کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ "ہنگامی جنسی اختلاط کی رضامندی" نہیں ہوتی، بلکہ معاہدہ ہوتا ہے اس امر کا کہ ہم (میاں بیوی) ان تمام قیود و حدود اور حقوق و فرائض کے مطابق جو ہم پر قرآن نے عائد کی ہیں مستقل رفاقت کی زندگی بسر کریں گے۔ اسی سے

ایک اور حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر انون نے اپنے ہاں زنا کا لفظ استعمال نہیں کیا (اسے اس لفظ کے استعمال کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ وہ مذہبی یا اخلاقی بحث نہیں کر رہا بلکہ جنسی مسئلہ کے متعلق علمی اور نظری تحقیق کر رہا ہے۔ لہٰذا اس کا انداز سائنٹیفک ہونا چاہیئے تھا) اس نے اپنے ہاں جنسی اختلاط کے مواقع SEXUAL OPPORTUNITIES کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جس قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ ہوں گے وہ قوم تمدّنی سطح میں بہت پست ہوگی اور جس میں یہ مواقع کم از کم حد تک رکھے جائیں گے، وہ تمدّنی سطح کی بلندیوں تک پہنچ جائے گی۔ قرآن نے صرف زنا ہی کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ جنسی اختلاط کے مواقع کو کم سے کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ اس میں قبل از نکاح، جنسی اختلاط کے مواقع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ زنا ہے۔ نکاح کا معاہدہ، اس کے نزدیک عمر بھر کی رفاقت LIFE-LONG COMPANIONSHIP کا معاہدہ ہے۔ لہٰذا اس میں وقتی جنسی اختلاط کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا، خواہ وہ باہمی رضامندی ہی سے کیوں نہ ہو۔ پھر اس نے نکاح کو میثاقاً غلیظاً (پختہ عہد) کہا ہے (۴/۲۱)۔ بچوں کا کھیل نہیں کہا ہے کہ جب جی چاہا کھیل کھیل لیا اور جب طبیعت اکتا گئی تو اس مٹی کے گھروندے کو پامال کر دیا اور دوسرے وقت پھر نیا گھر بنا لیا۔ علاوہ بریں اس نے وحدتِ زوج MONOGAMY کو بطور اساسی اصول مقرّر کیا ہے (۴/۲۰) اور تعدّدِ ازواج کو محض ایک ہنگامی تمدّنی مشکل کے حل کے لئے، بطور عارضی علاج جائز قرار دیا ہے (۴/۳) اس کی بھی محض اجازت ہے حکم نہیں) شادی کی یہ (قریب قریب) وہی شکل ہے جسے انون نے مطلق وحدتِ زوج ABSOLUTE MONGAMY کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ میں نے "قریب قریب" اس لئے کہا ہے کہ ڈاکٹر انون کے نزدیک "مطلق وحدتِ زوج" میں شادی صرف اسی صورت میں منقطع ہو سکتی ہے جب عورت جنسی (اخلاقی) جرم کی مرتکب ہو جائے۔ لیکن قرآن نے نباہ نہ ہو سکنے کو بھی فسخ معاہدہ (طلاق) کی معقول اور جائز وجہ قرار دیا ہے۔ بہرحال، یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ وہ زمانہ قبل از نکاح میں جنسی اختلاط کے کسی ایک موقع کو بھی جائز قرار نہیں دیتا۔ اور نکاح کے بعد عام حالات میں صرف ایک جوڑے کو باہمدگر وابستہ رکھتا ہے۔ تنوع CHANGE کی خاطر تنوّع CHANGE کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن نے تو نکاح کی صورت میں بھی محصنین کے

ساتھ غیر مسافحین (۴/۲۴) کا اضافہ کیا ہے۔ حصن کے معنی ہیں محفوظ رکھنا اور سفح کے معنی ہیں پانی وغیرہ کا بہا دینا۔ لہٰذا جہاں اس حکم میں زنا سے ممانعت مقصود ہے وہاں اس سے یہ بھی متصوّر ہے کہ نکاح کا مقصد بھی شہوت رانی نہیں۔ اس سے نکاح کی تمام ذمہ داریوں کی حفاظت اور بقائے نسل کا تحفظ مقصود ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ صرف وہی قوم زندگی کی کامرانیوں سے بہرہ یاب (مفلح) ہو سکتی ہے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک لے جائے۔ اور یہ کم از کم مواقع بھی صرف معروف RECOGNISED طریق سے مہیا کئے جائیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ

> انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو جس کی لڑکیوں کی پرورش و تربیت "مطلق وحدتِ زوج" کی روایات میں نہ ہوئی ہو۔ نہ ہی تاریخ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود و قیود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اس کے باوجود وہ قوم اپنی تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو جب عقد نکاح مساوی حیثیت کے فریقین کا عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو۔ اور نہ میاں اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے آشنا ہو اور نہ ہی بیوی اپنے میاں کے علاوہ کسی مرد کی شناسا، تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم از کم حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس پر شاہد ہے کہ جن اقوام نے ایسی معاشرتی رسوم اختیار کر لی تھیں جو زندگی بھر کی جبری رفاقت کے قریب قریب پہنچ گئی ہوں (اس لئے کہ اس وقت تک زندگی بھر کی جبری رفاقت تک کوئی قوم بھی نہیں پہنچ سکی) اور جن اقوام نے جنسی اختلاط کے حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا تھا وہی اقوام تہذیب و تمدن کی اس بلندی تک پہنچ سکی تھیں جہاں تک انسانیت اس وقت تک پہنچ سکی ہے۔ (صـ۸۴ـ)

تم نے دیکھا کہ زمانے کی علمی شہادتیں کس طرح قرآنی حقائق کی تائید کرتی چلی جا رہی ہیں اور دنیا کس طرح (غیر شعوری طور پر خود بخود) قرآن کے قریب آتی جا رہی ہیں!

عربوں کی تاریخ

ڈاکٹر اَنوَن نے اپنی تحقیق کے دوران ضمناً مسلمانوں (عربوں) کی تاریخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں بتاتا ہے کہ قدیم عرب، قبل از نکاح عصمت و بکارت پر زور نہیں دیا کرتے تھے۔ بعد میں (اسلام کی تعلیم کے تحت) انہوں نے اس عصمت پر شدت سے زور دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے محدود ملک سے نکل کر گرد و نواح کی دنیا پر پھیل گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے حرم میں عورتوں کی بھرمار شروع کر دی تو ان کی فتوحات کی وسعتیں رُک گئیں۔ (صفحہ ۴۲۹)۔ اس کے بعد ڈاکٹر اَنوَن نے ایک اور تاریخی عنصر کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ قرآن نے یہود و نصاریٰ (اہل کتاب) کی لڑکیوں سے شادی کی اجازت کیوں دی تھی۔ ڈاکٹر اَنوَن کے اس اصول کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ کسی قوم کی تمدنی تعمیر میں عورت کی محفوظ توانائی کا بہت بڑا اثر ہے، بلکہ مردوں کی توانائی بھی اسی صورت میں تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے جب ان کی عورتیں باعصمت ہوں۔ ڈاکٹر اَنوَن کہتا ہے کہ جب عربوں کی فتوحات کا سلسلہ مصر میں جا کر رُک گیا تو انہوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی لڑکیوں سے شادیاں کیں۔ ان لڑکیوں کی تربیت اس ماحول میں ہوئی تھی جس میں جنسی ضبط پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کی مرتکز توانائیاں عربوں کی مزید وسعتوں اور تمدنی بلندیوں کا باعث بن گئیں۔ یہی کچھ مصر میں ہوا اور یہی کچھ اسپین میں (صفحہ ۴۲۹)۔ کسی کو ڈاکٹر اَنوَن کی تحقیق کے اس نتیجے سے اختلاف ہو یا اتفاق، لیکن یہ حقیقت بہرکیف اپنی جگہ پر غیر متنازعہ رہ جاتی ہے کہ اس محقق کے نزدیک، کسی قوم کی فتوحات کی وسعتوں اور تہذیب کی بلندیوں پر اس کی عورتوں کی عصمت و ضبط کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ اور یہی حقیقت قرآن نے بیان کی ہے جب اس نے زندگی کی کامرانیوں کے لئے مردوں اور عورتوں دونوں کے "محصن" (قلعہ بند) ہونے کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کا محصن ہونا جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم درجے تک لے آتا ہے (یعنی زمانہ قبل از نکاح میں مطلق عصمت، نکاح میں وحدتِ زوج MONOGAMY بطور اساسی اصول۔ اور نکاح کے بعد، میاں اور بیوی کا کسی غیر عورت اور مرد کے ساتھ اختلاط ناجائز)۔ لیکن جب کسی قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہو جائیں (جس کی شکل صرف زنا ہی نہیں بلکہ اس ہنگامی ضرورت کے بغیر جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے، بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں۔ طلاق کی رخصت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر

آزادانہ تبدیلیٔ ازواج[1] اور قرآن کے کھلے کھلے حکم کے خلاف لونڈیوں کی بھرمار سے سینکڑوں عورتوں سے اختلاط، یہ سب جنسی اختلاط کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانے کی شکلیں ہیں تو پھر اس

جنسیات میں اُلجھی ہوئی قوم کی حالت

قوم میں نہ تو آگے بڑھنے کی توانائیاں رہ جاتی ہیں اور نہ ہی اپنے تمدن کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنے کی صلاحیتیں. اس قسم کی قوم زندگی کی کس سطح پر پہنچ جاتی ہے، اس کے متعلق ڈاکٹر الوَن لکھتا ہے کہ

> اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی[2] وہ واقعات کے اسباب و علل CAUSES کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا رہا ہے اسے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں)......... وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں......... اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو. کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیّر العقول نظر آئیں اور کبھی دیگر اشیاء کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے. جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے. حتّٰی کہ اس

---

[1] رابرٹ برفا BRIFFAULT نے جنسیات کے متعلق ایک بڑی دقیع اور ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے THE MOTHER اس میں وہ ایک کرد کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے عمر بھر بیک وقت ایک ہی بیوی رکھی لیکن وہ (غالباً) چالیس کے قریب بیویاں بدل چکا تھا. یہ جنسی اختلاط کے متنوّع مواقع کی ایک مثال ہے. اس سے اور مثالوں کا بھی اندازہ لگا لیجئے.

[2] دیکھئے یہ الفاظ کس طرح ترجمہ ہیں قرآن کی اس آیت کا کہ لهم قلوب لا يفقهون بها ان کے پاس سمجھنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے. (۷/۱۷۹).

کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے (اس کے بعد ڈاکٹر الوَن نے ان توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر نیاز، گنڈہ تعویذ، اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ) اس قسم کے معتقدات، اس قوم میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد اُن پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ اور جب ان کی لاشوں کو نہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے، بلکہ حیوان ہوتے ہیں[1]۔

(صفحہ ۳۴۶ ـ ۳۴۵)

تم نے دیکھ لیا نقشہ اس سوسائٹی کا جس میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی صدیوں سے یہی حالت نہیں چلی آرہی اور کیا آج بھی ساری دنیا میں ہماری یہی حالت نہیں؟ کیا یہ نتیجہ نہیں جنسی اختلاط کے مواقع کی ان وسعتوں کا جو ہمارے خود ساختہ مذہبی تصورات نے عطا کر رکھی ہیں؟

جب ہماری قوم کی جنسی زندگی قرآنی سواحل میں گھری ہوئی تھی تو یہ ساری دنیا پر چھا گئی تھی۔ اور جب ملوکیت نے اسے بدلگام کر دیا اور شریعت کے نام پر وہ سب کچھ ہونے لگا جسے قرآن روکنے کے لئے آیا تھا تو ان کی ساری توانائیاں ضائع ہوگئیں۔ پھر ان میں نہ فکر کی صلاحیت رہی نہ عمل کی۔ اور یہی حالت اس وقت تک چلی جا رہی ہے۔ ان کے ممالک میں لونڈیاں آج تک سربازار بکتی ہیں[2]۔

ہمارا نوجوان طبقہ

یہ تو ہے ہمارے اس طبقہ کی حالت جسے قدامت پرست کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے نوجوانوں کا طبقہ ہے جنہوں نے مغرب

---

[1] یہ بھی قرآن ہی کی ایک آیت کا ترجمہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ یتمتعون و یاکلون کما تاکل الانعام (۴۷/۱۲) وہ سامانِ زیست سے اسی طرح فائدہ حاصل کرتے اور کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان۔ نیز (۷/۱۷۹)

[2] نوشتہ ۱۹۵۷ء۔

کی دیکھا دیکھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنا، انفرادی آزادی کو مقید کرنا ہے۔ اس لئے " ازمنۂ مظلمہ" کے ان اغلال و سلاسل کو جتنی جلدی توڑ دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ چنانچہ انہوں نے عملاً اسے توڑنا بھی شروع کر دیا ہے۔ ان آزادیوں سے وہ سوسائٹی متشکل ہوتی ہے جس کے متعلق انوِن لکھتا ہے کہ

> اس میں ہر لڑکی کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا جنسی کھیل کھیلنا چاہے کھیلتی پھرے اور جس نوجوان سے چاہے جنسی اختلاط قائم کرے۔ اس کے لئے فقط ان دونوں کی رضامندی کی شرط ہے۔ نہ لڑکی پر کسی قسم کی پابندی عائد ہوتی ہے نہ لڑکے پر .... بچپن ہی سے وہ ہر ایسا جنسی کھیل کھیلنے لگ جاتے ہیں جس میں انہی لذت ملتی ہو......... مختصراً یہ کہ وہ ایسی فضا میں رہتے ہیں جس میں جنسی حدود و قیود کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جس میں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جونہی جنسی خواہش بیدار ہوئی، اسے اسی وقت کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا۔ (۳۴۸)

اُس کا نتیجہ

یہی ہیں وہ جنسی آزادیاں جن کا متمنی ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن ان آزادیوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اسے خود ڈاکٹر انوِن کی زبان سے سُن لو۔ وہ کہتا ہے کہ

> لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جنسی پابندیوں کو بھی ہٹا دیا جائے اور قوم زندگی کی ان خوشگواریوں سے بھی متمتع ہوتی رہے جو ایک بلند تمدن کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ لیکن انسانی ہیئت تو کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ یہ دونوں آرزوئیں کبھی یک جا جمع نہیں ہو سکتیں۔ یہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ جو ریفارمر ان میں مفاہمت COMPROMISE کی کوشش کرتا ہے اس کی مثال اس احمق بچے کی سی ہے جو چاہتا ہے کہ وہ اپنے کیک کو کھا بھی لے اور پھر وہ سالم کا سالم باقی بھی بچ جائے۔ کوئی انسانی معاشرہ ہو، اسے ان دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہوگی۔ یا تو ان صلاحیتوں کو پائندہ رکھنے کی راہ جو اس کے تمدن کو بلند

کرتی ہیں اور یا جنسی آزادی کی راہ۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ جو قوم ان دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرتی ہے وہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے بھی زیادہ آگے نہیں لیجا سکتی۔

(۴۱۲)

بنا بریں،

کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کردیں اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کردیئے جائیں) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی۔ (۴۱۴)

پس چہ باید کرد

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کس طرح کی جائے جس میں جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک لے جایا جائے۔ اور پھر ایسی صورت پیدا کی جائے کہ جنسی مواقع کی یہ شکل مستقل طور پر قائم رہ سکے تاکہ اس طرح وہ قوم انسانیت کی صلاحیت بخش توانائیوں کی حامل بنتی چلی جائے۔ ڈاکٹر انون نے اپنی کتاب کا خاتمہ اسی سوال (اور اس کے جواب) پر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

تاریخ کے صفحات پر کوئی سوسائٹی ایسی نظر نہیں آتی جو اس کوشش میں کامیاب ہوگئی ہو کہ وہ جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدتِ مدید تک، کم از کم حد تک محدود رکھ سکی ہو۔ میں تاریخی شواہد سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کسی قوم نے ایسی صورت پیدا کرنی ہو تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کرے۔ (۴۳۱ - ۴۳۲)

تم نے غور کیا کہ اس محقق کی تحقیق کے مطابق اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کی بنیادی شرط کیا ہے؟ یہ کہ اس میں مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا ہو! آج اس معاشرہ میں جس میں ہم

مرد اور عورت کی مساوی حیثیت

صدیوں سے چلے آرہے ہیں، یہ کہنا کہ اسلام نے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ

عطا کیا تھا، شاید اپنی ہنسی اڑانے کے مترادف ہوگا. لیکن اس حقیقت کو کون چھپا سکتا ہے کہ قرآن نے یہ اعلان آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کیا تھا کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲/۲۲۸) قاعدے اور قانون کی رُو سے عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنے ان کے فرائض ہیں. لہٰذا قانون کی نگاہ میں مرد اور عورت دونوں کو مساوی درجہ حاصل ہے. اور ہمارے لئے کرنے کا کام فقط اتنا ہی ہے کہ اپنے معاشرے کو قرآنی خطوط پر متشکل کرلیں.

آخر میں ڈاکٹر انوِن لکھتا ہے کہ

> اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدّتِ مدید تک، بلکہ ابدالآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیقِ نو کرے. یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدّتِ مدید تک، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم از کم حد تک محدود رہیں. اس طرح اس معاشرہ کا رُخ ثقافتی اور تمدّنی ارتقار کی طرف مڑ جائے گا. اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک ——— کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آسکتا. (صفحہ ۴۳۲)

قرآن ایسے ہی معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے. اس کے لئے اس نے نہایت واضح قوانین دیئے ہیں. وہ عائلی زندگی کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ وہ جہاں صلوٰۃ و زکوٰۃ جیسے امور کے متعلق بالعموم اصولی قوانین دیتا ہے وہاں عائلی زندگی کے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات تک بھی خود ہی متعین کردیتا ہے.

ایک بنیادی حقیقت

لیکن اس ضمن میں ایک بنیادی حقیقت ایسی ہے جس کا آخر میں بیان کرنا نہایت ضروری ہے. عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جنسی جذبہ بھی بھوک، پیاس، نیند وغیرہ کی طرح ایک فطری جذبہ ہے جس کی تسکین نہایت ضروری ہے اور جس طرح

بھوک، پیاس وغیرہ کی اضطراری حالت میں عام قوانین کو ڈھیلا RELAX کردیا جاتا ہے اسی طرح جنسی قوانین کی بندشوں کو بھی ڈھیلا کر دینا چاہیئے۔ یہ تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھوک اور پیاس کی طرح جنسی جذبہ بھی ایک فطری جذبہ NATURAL INSTINCT ہے لیکن اس میں اور بھوک پیاس وغیرہ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اس فرق کو ایک مثال (بلکہ اپنے روزمرہ کے مشاہدہ) سے سمجھو۔ تم کسی کام میں منہمک بیٹھے ہو۔ تمہیں پیاس لگتی ہے۔ شروع میں تمہیں اس کا خیال نہیں آتا۔ وہ بڑھتی ہے تو اس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر تم پانی پی لیتے ہو تو فبہا، ورنہ اس کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ تمہارے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ اور اگر تمہیں کچھ دنوں کے لئے پانی نہ ملے تو اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت بھوک کی بھی ہے۔ اس سے تم نے دیکھ لیا کہ

(۱) بھوک، پیاس وغیرہ کا تقاضا از خود پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کسی کے خیال اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور

(۲) اگر ان تقاضوں کی تسکین نہ کی جائے تو کچھ وقت کے بعد اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو اضطراری حالت کہتے ہیں۔ اس حالت میں (جان بچانے کی خاطر) ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عام حالات میں حرام ہیں۔

خیال کا دخل

لیکن جنسی تقاضا کی کیفیت ان سے بالکل جُدا ہے۔ جنسی تقاضا کبھی نہیں اُبھرتا تاوقتیکہ ہم اس کا خیال نہ کریں۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ جنسی تقاضا کی بیداری اور نمود یکسر ہمارے خیالات سے وابستہ ہے۔ اگر ہمارا خیال اس طرف منتقل نہ ہو تو یہ تقاضا بیدار ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگر جنسی تقاضا کی تسکین نہ کی جائے تو اس سے موت واقع نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی "اضطراری حالت" کے لئے حرام کو حلال نہیں قرار دیا۔ بلکہ کہا یہ ہے کہ جس کے لئے نکاح ممکن نہ ہو وہ ضبطِ نفس سے کام لے۔ (۲۴/۳۳)

ضبطِ نفس

اور یہ ضبطِ نفس کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس لئے کہ جس تقاضا کی بیداری کا مدار انسان کے اپنے خیالات پر ہو، اس پر کنٹرول رکھنا انسان کے اپنے بس کی بات ہوتا ہے۔ وہ نہ خیالات کو طیور آوارہ بنائے، نہ توجہ اس طرف جائے۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ جس معاشرہ میں حالت

یہ ہو جائے کہ

صید خود صیاد را گوید بگیر

اس میں ایک فرد (بالخصوص نوجوان طبقہ) اپنے خیالات پر کس طرح کنٹرول رکھ سکے؟ یہ بات ایک حد تک درست ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن جرم کے سبب کی بیخ کنی پر زور دیتا ہے۔ وہ صرف ارتکابِ جرم کے بعد مجرم کو نہیں پکڑتا بلکہ ایسی فضا پیدا کرتا ہے جس میں ان جرائم کے ارتکاب کے مواقع کم از کم ہو جائیں۔ اس کے لئے وہ کہتا ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (۶/۱۵۲) تم فواحش کے قریب تک نہ جاؤ۔ یعنی فواحش تو ایک طرف جو اسباب و ذرائع فواحش تک لے جانے والے ہوں ان سے بھی مجتنب رہو۔ ان اسباب و ذرائع میں وہ بھی شامل ہیں جو بظاہر نظر آجاتے ہیں اور وہ بھی جو نگاہوں سے مخفی رہتے ہیں۔ یعنی دل میں گذرنے والے خیالات جو آہستہ آہستہ انسان کو فواحش تک لے جاتے ہیں۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹) وہ نگاہوں کی خیانت اور دل کی چوری (راز) تک سے واقف ہے۔ اس قسم کی روش کو تطہیرِ قلب و نگاہ کہتے ہیں۔ یعنی دل اور آنکھ کی پاکیزگی۔ اس مقصد کے لئے قرآن مردوں اور عورتوں کے اختلاط (میل جول) کے متعلق تفصیلی ہدایات دیتا ہے۔ تم ان امور کی تفصیل معلوم کرنا چاہتے ہو تو طاہرہ بیٹی سے وہ خطوط لے کر دیکھ لو جو میں نے اسے اس موضوع پر وقتاً فوقتاً لکھے ہیں[1]۔

بہرحال تم نے یہ دیکھ لیا سلیم! کہ مرد اور عورت کا جنسی اختلاط محض ایک طبعی فعل BIOLOGICAL ACTION نہیں جس کا تعلق صرف انسان کے جسم تک ہو۔ اس کا تعلق قوموں کی تہذیب و تمدن اور کلچر و ثقافت کے ساتھ بڑا گہرا اور بنیادی ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ ایسا نہیں جسے یونہی نظرانداز کر دیا جائے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم تمدن اور ثقافت میں ممتاز حیثیت حاصل کر لے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم جنسی تعلقات کو قرآن کی مقدر کردہ حدود کے اندر رکھیں یعنی ان آزادیوں کو بھی محدود کریں جو مغرب کی اندھی تقلید سے ہمارے جدت پسند طبقہ میں دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہیں، اور ان "شرعی اجازتوں" کو بھی حدود اللہ کا پابند بنائیں جو غلط (یعنی غیر قرآنی)

---

[1] یہ خطوط چھپ چکے ہیں۔

مذہب کی بناء پر ہمارے قدامت پسند معاشرہ میں صدیوں سے مروّج چلی آرہی ہیں. اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہمارے اُبھرنے اور آگے بڑھنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی. سنّت اللہ کسی کے لئے بدلا نہیں کرتی.

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

کچھ سمجھے سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ اچھا خدا حافظ.

والسّلام

پرویز

فروری ۱۹۵۷ء

سینتیسواں خط

قوموں کے عروج و زوال کا ابدی قانون

نہیں سلیم! تاریخ کا علم اور اس کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ عمیق ہے۔ تاریخ محض ماضی کے واقعات اور حوادث کا ریکارڈ نہیں۔ وہ صرف اتنا بتانے کے لئے نہیں کہ اکبر فلاں سال تخت پر بیٹھا اور فلاں سال مر گیا ـــــــــ وہ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ قومیں کس اصول کے تحت زندہ رہتی ہیں اور کس قانون کے تحت مرتی ہیں۔ وہ یہ بتاتی ہے کہ فلاں قوم نے اس قسم کی روشِ زندگی اختیار کی تو اس کا یہ نتیجہ نکلا اور فلاں قوم اس قسم کی نہج پر چلی تو اس کا انجام یہ ہوا۔ اسے سائنس آف ہسٹری یا فلسفۂ تاریخ کہتے ہیں اور تم یہ سُن کر متعجب ہو گے کہ تاریخ

سائنس آف ہسٹری

کو ایک سائنس یا فلسفہ کی حیثیت سے سب سے پہلے قرآن نے پیش کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ قوموں کی موت اور حیات یونہی اتفاقی طور پر واقع نہیں ہو جاتی۔ ان کا عروج و زوال اندھا دھند طریق پر ظہور میں نہیں آ جاتا۔ اس کے لئے خاص قانون اور اصول مقرر ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات کوئی خاص قوم یا گروہ کچھ قوت جمع کر لیتا ہے اور اس کے ذریعے وقتی طور پر اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن یہ ہنگامی حادثہ ہوتا ہے جو ایک شعلۂ مستعجل کی طرح فوراً بھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے۔ جسے قوموں کا عروج و زوال کہا جاتا ہے، وہ ارتقائی طور پر نمودار ہوتا ہے اور اسی طرح تدریجی طور پر سمٹ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے اور یہ سب کچھ ایک لگے بندھے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

یہاں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جب ہم کسی قوم کی موت کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اس قوم کی نسل سطحِ ارض سے مٹ گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایک نسل کی نسل طبعی طور پر PHYSICALLY دنیا سے مٹ جاتی ہے لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم کے افراد طبعی طور پر زندہ رہتے ہیں (اور ان کی نسل بھی آگے چلتی رہتی ہے) لیکن اس قوم کا شمار زندہ اقوام میں نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کسی قوم کی موت اور حیات سے مقصود کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ ہر قوم ایک خاص نظریۂ حیات، ایک خاص تصوّرِ زندگی، ایک خاص نقطۂ نگاہ کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصود اور جدّ وجہد کے لئے ایک خاص نصب العین ہوتا ہے۔ اس تصوّرِ حیات اور نظریۂ زندگی کو قرآن کی اصطلاح میں کلمہ اور دورِ حاضر کی اصطلاح میں (یوں سمجھو کہ) کلچر کہا جاتا ہے۔

قوموں کی موت

اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر قوم ایک خاص کلچر کی نمائندہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک قوم کی موت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ جس کلچر کی حامی تھی اس میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ زمانہ کے تصادمات ——— CHALLENGES کا مقابلہ کرسکتا۔ اس مقام پر اس نقطہ کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر ایک قوم کسی خاص زمانہ میں عروج پر رہے، اور اس کے بعد اس پر زوال آگیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ (۱) یا تو اس کلچر میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے سامنے ٹھہر سکتا اور یا (۲) کہ اس قوم نے اس پہلے کلچر کو چھوڑ کر کوئی اور کلچر اختیار کر لیا تھا جس میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ مختصراً یوں سمجھو کہ جس وقت کوئی قوم زوال پذیر ہوتی ہے اس وقت وہ کسی ایسے کلچر کی حامل ہوتی ہے جس میں زمانہ کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا میں، کلچر اور زمانہ کے تقاضوں میں، مسلسل کشمکش جاری رہتی ہے۔ جب تک ایک کلچر ان تقاضوں کا مقابلہ کرتا رہتا ہے اس کی حامل قوم زندہ رہتی ہے۔ جب زمانے کے تقاضے اس پر غالب آجاتے ہیں تو وہ قوم مصافِ زندگی میں پچھڑ جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو ایسے کلچر کی حامل ہوتی ہے جس میں ان تقاضوں کے سامنے ٹھہرنے کی سکت ہوتی ہے۔ اس قانون کو قرآن کی اصطلاح میں قانونِ استبدال و استخلافِ قومی LAW OF

SUBSTITUTION AND SUCCESSION OF NATIONS کہا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس طرح دنیا میں کوئی فرد مرنا نہیں چاہتا، اسی طرح کوئی قوم بھی مرنا نہیں چاہتی۔ وہ ہمیشہ زندہ اور برسرِ اقتدار رہنا چاہتی ہے۔ لیکن جس طرح کوئی فرد محض اس لئے زندہ نہیں رہ سکتا کہ اسے زندہ رہنے کی آرزو ہے (اسے زندہ رہنے کے لئے قانونِ حیات کے مطابق چلنا ضروری ہے) اسی طرح کوئی قوم بھی محض اپنی مقدس آرزوؤں اور حسین تمناؤں کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے زندہ رہنے کے لئے اس اٹل قانون کا اتباع کرنا ہوگا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب (صدرِ اوّل کے) مسلمانوں کا مقابلہ ان قوموں کے ساتھ ہوا جو ایسے کلچر کی حامل تھیں جن میں آگے چلنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی (انہیں اہلِ کتاب کہہ کر پکارا گیا ہے) تو قرآن نے انہیں واضح الفاظ میں بتا دیا کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم میں سے ہر فریق کی یہ دلی آرزو ہے کہ وہ اس کشمکش میں غالب آئے اور آگے بڑھ جائے، لیکن یاد رکھو۔ اس بات کا فیصلہ محض آرزوؤں پر مبنی نہیں۔ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ط اے جماعتِ مومنین! اس کا فیصلہ نہ تو ہماری آرزوؤں کے مطابق ہوگا اور نہ ہی تمہارے فریقِ مقابل (اہلِ کتاب) کی آرزوؤں کے مطابق۔ اس کا فیصلہ اس اٹل قانون کے مطابق ہوگا کہ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ جو قوم بھی ناہمواریاں پیدا کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ہوگی اس کی اس روش کے تباہ کن نتائج اس کے سامنے آکر رہیں گے۔ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۴/۱۲۳) اور ان نتائج وعواقب سے اسے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ بجز اس کے کہ وہ قانونِ خداوندی ہی کو اپنی مدافعت کے لئے سپر بنائے۔ یہ اس لئے کہ کائنات میں

قانون کی حکومت

لاقانونیت LAWLESSNESS اور دھاندلی نہیں۔ یہاں زندگی اور موت کا فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق علیٰ وجہ البصیرت ہوتا ہے۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ط (۸/۴۲) جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے ہلاک ہو۔ اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہے۔ یہاں نہ کسی کو زندگی مراعاتِ خسروانہ (بادشاہوں کی بخشش) کے طور پر ملتی ہے۔ نہ کسی کی موت انتقامِ شاہانہ (بادشاہوں کی برہمیٔ مزاج) کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہاں ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر ہے جس میں کسی کے لئے کوئی استثناء نہیں ہوتی۔

اس تمہید کے بعد سلیم! آگے بڑھو! نظریاتِ زندگی کی باہمی کشمکش کے متعلق ہمارے زمانے میں

ہیگل کا فلسفہ

ہیگل نے ایک فلسفہ پیش کیا جسے فلسفۂ تضادات کہتے ہیں. اس نے کہا کہ ایک نظریہ IDEA پیدا ہوتا ہے. وہ بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے. جب وہ شباب تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے ایک اور نظریہ اُبھرتا ہے جو پہلے نظریہ کی ضد ہوتا ہے. اب وہ سابقہ نظریہ مضمحل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور یہ نظریہ پروان چڑھنے لگتا ہے. آہستہ آہستہ، وہ پہلا نظریہ محو ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ یہ نیا نظریہ لے لیتا ہے. یہ نیا نظریہ اسی طرح بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے اور پھر اس کے اندر سے ایک نیا نظریہ ابھرتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے. ہیگل کا کہنا یہ ہے کہ نظریات کی یہ گردش دولابی (کہ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے) مسلسل اور پیہم جاری ہے. ہر اُبھرنے والے نظریہ کو کچھ وقت کے بعد مضمحل ہونا اور دوسرے نظریہ کے لئے جگہ خالی کرنا پڑتی ہے.

ہیگل کے بعد مارکس آیا. اس نے بھی ہیگل ہی کے فلسفہ کا اتباع کیا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ مارکس نے کہا ہے کہ یہ کشمکش، نظریات IDEAS میں نہیں ہوتی بلکہ نظامہائے حیات SYSTEMS میں ہوتی ہے. ایک دَور میں زندگی کا ایک نظام (مثلاً نظامِ سرمایہ داری) کارفرما ہوتا ہے. کچھ عرصہ کے بعد اس کے اندر سے ایک اور نظام پھوٹتا ہے جو اس پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے.

مارکس کا فلسفہ

یہ نظام اس سابقہ نظام کی جگہ لے لیتا ہے. اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے. اس فلسفہ کو DIALECTICS کہتے ہیں. یہ کشمکش تصوّرات میں ہو یا نظام ہائے حیات SYSTEMS میں، ایک چیز دونوں میں مشترک ہے. اور وہ یہ کہ (اس فلسفہ کی رُو سے) کوئی تصوّر یا نظام نہ ذاتی طور پر اچھا ہوتا ہے نہ بُرا. نہ ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت ہوتی ہے نہ فوقیت. یا یوں کہو کہ کسی تصوّر یا نظام میں ذاتی طور پر اس کی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ سکے یا اپنے متضاد نظریہ یا نظام پر ہمیشہ غالب رہ سکے. (غالب کے الفاظ میں) ہر نظریہ اور ہر نظام کی بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے. وہ اپنے سے پہلے نظریہ یا نظام کی جگہ لیتا ہے. کچھ عرصہ تک اس کا دَور دَورہ رہتا ہے اس کے بعد وہ یہ کہہ کر ختم ہو جاتا ہے کہ

میں اسی لئے بنا تھا کہ خدا مجھے بگاڑے

ہیگل اور مارکس کا خیال ہے کہ قوموں کی موت و حیات کا سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے. یہی وہ

چکر ہے جس کے مطابق کلچرز آتے اور جاتے ہیں۔ نہ کوئی کلچر بنیادی طور پر فنا آمادہ ہوتا ہے نہ بقا در آغوش۔ ہر ایک کی "موت کا ایک دن مقرر" ہوتا ہے۔ اسے نہ کوئی اس سے ایک دن زیادہ زندہ رکھ سکتا ہے، نہ اس سے ایک دن پہلے مار سکتا ہے۔

قرآن کا فلسفہ

اس کے برعکس، قرآن بھی کلچرز کے محو و ثبات کا ایک فلسفہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے کہ دنیا میں متضاد نظریات کی کشمکش جاری ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ سب نظریے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ ایک نظریہ ایسا ہوتا ہے جس میں بنیادی طور پر غالب آنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور اس کے برعکس دوسرا نظریہ وہ ہوتا ہے جس میں بنیادی طور پر اس کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ وہ اوّل الذکر نظریہ کو حق کہہ کر پکارتا ہے اور ثانی الذکر کو باطل سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن کا خدا کہتا ہے کہ ہم اپنے کائناتی قانون کی رُو سے کرتے یہ ہیں کہ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ حق کو باطل پر مارتے رہتے ہیں۔ ان کی باہم کشمکش رہتی ہے۔ فَيَدْمَغُهُ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق اس باطل کا بھیجا توڑ دیتا ہے۔ اس کا کچومر نکال دیتا ہے۔ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) اور وہ (باطل) بُری طرح شکست کھا کر بھاگ جاتا ہے اس لئے کہ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (۱۷/۸۱) باطل کی بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ وہ حق کے مقابلے میں ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ وہ بنا ہی ایسا ہے کہ جب حق کے سامنے آئے، مُنہ موڑ کر بھاگ جائے۔ لہٰذا جو قوم حق کے کلچر کی حامل ہوگی وہ ہمیشہ اس قوم پر غالب رہے گی جو باطل کے کلچر کی نمائندہ ہوگی۔ اور اس وقت تک غالب رہے گی جب تک وہ حق پر قائم ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ حق کا کلچر کچھ وقت کے بعد خود بخود مُرجھا کر گر پڑے اور باطل کا کلچر اس کی جگہ لے لے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ حق کی حامل قوم پر وہ غالب آجائے جو اس کلچر کے صحیح ہونے پر ایمان نہیں رکھتی۔ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (۴/۱۴۱)۔ حق اور باطل کی قرآنی اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے متعلق میں تمہیں اس سے پہلے کئی بار بتا چکا ہوں۔ مختصر الفاظ میں اسے دہرا دوں کہ حق اس نظریہ (کلمہ) کا نام ہے جو انسانیت کی بلند اور مستقل اقدار PERMANENT VALUES کا حامل ہے۔ جو حقیقت REALITY پر مبنی ہے۔ جس کے نتائج ہمیشہ تعمیری CONSTRUCTIVE ہوتے ہیں۔ جس کے سہارے کائنات

کی ہر شے اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی، اُبھرتی اور بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ حق ہے۔ اور جو کچھ اس کی ضد ہے وہ باطل ہے۔ یعنی تجربی نتائج کا حامل نظریۂ زندگی۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے تصوراتِ حیات یا نظامہائے زندگی یا کلچرز کی کشمکش کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ ہیگل یا مارکس کے فلسفہ کے کس قدر خلاف ہے؟ (یہی وہ بنیادی اختلاف ہے جو اسلام کو کمیونزم کی ضد قرار دیتا ہے)۔ وہ کہتا ہے کہ قوموں کی حیات و موت کے فیصلے اسی فلسفہ اور اسی قانون کی رُو سے ہوتے ہیں۔ یہی کلچرز کے محو و ثبات کا معیار ہے۔ قرآن نے اقوامِ سابقہ کی جس قدر داستانیں (یعنی تاریخی یادداشتیں) پیش کی ہیں ان سے مقصود یہی یہ بتانا ہے کہ فلاں قوم نے حق کی روش اختیار کی تو وہ کس طرح اس قوم پر غالب آ گئی جو باطل بدوش تھی۔ اور جب اس قوم نے جو حق پر تھی، حق کی روش کو چھوڑ دیا تو وہ کس طرح ذلیل و خوار ہو گئی۔ اس وقت مجھے اس کی فرصت نہیں سلیم! کہ میں ان تمام تاریخی نوشتوں کو اس نقطۂ نگاہ سے سامنے لا کر تمہیں بتاؤں کہ قرآن نے تاریخ کو کس طرح ایک فلسفہ کی حیثیت میں پیش کیا ہے۔ کبھی فرصت ملی تو یہ بھی ہو جائے گا۔[1] اس وقت میں صرف وہ چند ایک مقامات تمہارے سامنے لا سکوں گا جن میں قرآن نے اپنے اس اصولی قانون کی مختلف انداز سے وضاحت کی ہے۔ یا یوں کہو کہ جن میں وہ اس اصل الاصول کے مختلف گوشوں FACTS کو سامنے لاتا ہے۔ ان مقامات میں اس نے وضاحت سے بتایا ہے کہ قوموں کے استبدال و استخلاف کے قوانین کیا ہیں؟ کون سی قومیں مٹتی ہیں اور کون سی ان کی جگہ لیتی ہیں۔ ذرا غور سے سنو! یہ حقائق ایسے نہیں جنہیں سطحی طور پر دیکھ کر انسان آگے بڑھ جائے۔ ان کا تعلق خود ہماری (اجتماعی) موت اور حیات سے ہے۔ اور انہی مقامات سے یہ حقیقت بھی سامنے آ جائے گی کہ خود مسلمانوں کے زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کی بازآفرینی کی صورت کیا؟ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

سب سے پہلے قرآن یہ کہتا ہے کہ جو کلچر، انسانی زندگی کو حیوانی سطح ______

---

[1] سلسلۂ مطالب الفرقان میں یہ تمام تفاصیل آ گئی ہیں۔ (۱۹۸۴ء)

ANIMAL LEVEL ہی پر رکھتا ہے اسے کبھی ثبات و لبقا نصیب نہیں ہو سکتی۔ وہ کلچر

حیوانی سطح کی زندگی

باطل کا حامل ہے۔ قرآن کی رُو سے انسان اور حیوان میں اتنا ہی فرق نہیں کہ انسان، سلسلۂ ارتقا میں حیوان سے اگلی کڑی ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ انسان کی سطح پر پہنچ کر زندگی ایسے نئے امتیازات کی حامل ہو جاتی ہے جو حیوانی سطح پر قطعاً موجود نہیں ہوتے۔ انہی امتیازات کا نام شرفِ انسانیت ہے اور انہی کی نشوونما مقصودِ حیات۔ ہمارے دَور میں اس نظریۂ زندگی کو جو انسانی زندگی کو محض حیوانی زندگی کی ایک بڑھی ہوئی شکل قرار دیتا ہے مادی نظریۂ زندگی MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس نظریہ کی حامل قومیں خواہ کتنی ہی قوت اور ساز و سامان کیوں نہ جمع کر لیں، کامیاب و کامران نہیں ہو سکتیں۔ سورۂ محمدؐ میں ہے اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کیا ان لوگوں نے دنیا میں چل پھر کر دیکھا نہیں کہ ان قوموں کا انجام کیا ہوا جو ان سے پہلے گذر چکی ہیں؟ تم نے دیکھا سلیم! قرآن تاریخی نوشتوں کے مطالعہ پر کس قدر زور دیتا ہے اور اس مطالعہ کو کس طرح ایک سائنس کی حیثیت دیتا ہے۔ یعنی اس نے آگے چل کر جو اصول بیان کرنا ہے اس کی صداقت کے لئے وہ اقوامِ سابقہ کی تاریخ کو بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ ان اقوام کے متعلق وہ کہتا ہے کہ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ قانونِ خداوندی نے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے بعد ہے وَلِلْکٰفِرِیْنَ اَمْثَالُهَا اقوامِ سابقہ کی جس تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ محض ماضی کی داستانیں ہیں جنہیں قصے کہانیوں کی طرح دہرایا جا رہا ہے اور ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ چیز بطور اصول بیان کی جا رہی ہے کہ جن اقوام نے حق کی روش سے انکار کیا ان کا حشر یہ ہوا۔ لہٰذا اب بھی جو قوم اس قسم کی روش اختیار کرے گی اس کا انجام ایسا ہی ہوگا۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ یہ اس لئے کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے دھاندلی سے نہیں ہوتا۔ یہاں سب کچھ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ سو جو قوم خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے، اس کی اس روش کے نتائج اس کے پشت پناہ بن جاتے ہیں۔ لیکن جو قوم اس قانون سے انکار کر کے کوئی دوسری روش اختیار کرتی ہے تو اس کا

محافظ و کارساز کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک محکم اصول ہے جو شروع سے چلا آتا ہے اور آج بھی اسی طرح کارفرما ہے۔ اسی اصول کے مطابق اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ جو لوگ اس قانون کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں وہ شادکامیوں اور کامرانیوں کی سدا بہار جنتی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ جو لوگ اس قانون کی صداقت سے انکار کرتے ہیں ان کی زندگی حیوانی سطح پر ہوتی ہے جس میں مقصودِ حیات کھانا، پینا اور طبعی زندگی پوری کرکے مرجانا ہوتا ہے۔ اس روشِ زندگی اور نظریۂ حیات کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم بہت سی قوت اور جمعیت اکٹھی کرلیں گے تو ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ یہ ان کی خام خیالی ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْۤ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝ (۱۰-۱۳/۴۷) کتنی ہی قومیں ان سے پہلے ایسی گذر چکی ہیں جن کے پاس ان (موجودہ) لوگوں سے جنہوں نے اے رسولؐ! تجھے تیرے وطن سے نکال دیا ہے کہیں زیادہ قوت تھی۔ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ہلاک کر دیا اور ان کا کوئی ایسا حامی و مددگار نہ نکلا جو انہیں اس تباہی سے بچا سکتا۔ سو جب ان کا حشر یہ ہوا تو ان کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ غلط روش، سابقہ زمانہ میں تو تباہی و بربادی پر منتج ہو اور وہی روش اس زمانہ میں کامیابی و کامرانی عطا کردے۔

اس سے ہم نے دیکھ لیا سلیم! کہ جس تصورِ حیات کی رُو سے یہ سمجھ لیا جائے کہ انسانی زندگی محض حیوانوں کی طرح طبعی زندگی ہے اور اس کے سامنے خورد و نوش سے بلند کوئی مقصد نہیں اس تصور (کلچر) کو بقا اور دوام نصیب نہیں ہو سکتا اور جو معاشرہ ان خطوط پر متشکل ہو اس میں انسان کبھی امن و سکون کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ انسانی سطح پر زندگی کے معنی ہیں کہ انسان کے سامنے زندگی کی مستقل اقدار ہوں اور ان کا حصول اس کا نصب العین حیات۔ یہی وہ اقدار ہیں جن کے حصول سے انسان طبعی موت سے بھی مر نہیں سکتا بلکہ حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے۔

اب آگے بڑھو۔ قرآن نے دوسرا اصول یہ بتایا ہے کہ جس نظام میں حالت یہ ہو کہ معاشرہ

میں نچلا طبقہ دن رات محنت کر کے پیدا کرے اور اوپر کا طبقہ ان کی محنت پر مفت میں عیش اڑائے وہ نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا. حق پر مبنی نظام میں کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک (محنت کش) طبقہ کے خون کی رنگینی دوسرے (بیکار) طبقہ کی عشرت گاہوں کی تزئین و آرائش میں صرف ہو.

مترفین کا نظریہ زندگی

سورۃ انبیاء میں ہے. وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۝ کتنی ہی قومیں ایسی گزری ہیں کہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ان کی زیادتیوں کی وجہ سے تباہ کر دیا اور ان کی جگہ اور قوموں نے لے لی. چنانچہ ان کے ساتھ ہوا یہ کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ۝ جب انہوں نے محسوس کیا (یعنی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا) کہ عذاب سامنے آ رہا ہے تو وہ اس سے بھاگنے لگے.

موضوع کے تسلسل کا تقاضا ہے کہ اس سے اگلی آیت فوراً سامنے لے آئی جائے. لیکن اس آیت میں سلیم! ایک نکتہ ایسا آ گیا ہے جس کی وضاحت کے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا. غور سے سنو! آیت میں ہے. فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ جب انہوں نے محسوس کر لیا کہ ہمارا عذاب آ رہا ہے. اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب تو بہت پہلے سے آ رہا تھا لیکن وہ ابھی محسوس شکل میں ان کے سامنے نمودار نہیں ہوا تھا. وہ ان کے حواس SENSE PERCEPTION کی زد میں نہیں آیا تھا. وہ ابھی غیر مرئی شکل میں مرتب ہو رہا تھا. حقیقت یہ ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہونا تو اسی وقت شروع ہو جاتا ہے جب وہ عمل سرزد ہو. لیکن یہ نتیجہ اپنے ابتدائی مراحل میں غیر محسوس اور غیر مرئی ہوتا ہے اور انسان سمجھتا نہیں کہ اس کے عمل کا نتیجہ مرتب ہو رہا ہے. یہ بات اس کی سمجھ میں اس وقت آتی ہے جب وہ نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آ جاتا ہے. عمل کے ارتکاب اور اس کے نتیجہ کے محسوس شکل میں سامنے آنے کے درمیانی وقفہ کو اجل یا میعاد کہتے ہیں. اس کو مہلت کا وقفہ بھی کہا جاتا ہے (اس کی پوری تشریح ذرا آگے چل کر آئے گی). غلط نظام کی حامل قومیں' اپنی عقل و فکر اور تدبر و سیاست کی رُو سے ان تمام دروازوں، کھڑکیوں، روشندانوں اور رخنوں کو بند کر لیتی ہیں جن کے راستے (وہ سمجھتی ہیں کہ) تباہی آ سکتی ہے. اور جب اس طرح سے تباہی فوراً سامنے نہیں آتی تو وہ مطمئن ہو جاتی ہیں کہ ہمارا انتظام بڑا محکم اور FOOL-PROOF ہے. لیکن خدا کا قانون

ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج کو آہستہ آہستہ، بتدریج ان راستوں سے لے آتا ہے جو ان کے فہم و شعور میں بھی نہیں آسکتے۔ (سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (۷/۱۸۲) اور وہ اس وقت دیکھ پاتے ہیں جب وہ محسوس شکل میں ان کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ یہ مطلب ہے فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَا کا۔

بہر حال قرآن کہہ یہ رہا تھا کہ جب ان لوگوں کے سامنے ہمارا عذاب محسوس شکل میں آ گیا تو وہ لگے بھاگنے۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں آواز دی کہ لَا تَرْكُضُوْا مت بھاگو۔ کھڑے ہو جاؤ۔ رُکو۔ تھمو۔ تم بھاگ کر جا کہاں رہے ہو؟ وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ۔ رکو اور لوٹ کر وہیں چلو جہاں تم نے اپنے عیش و عشرت کے سامان جمع کر رکھے تھے اور غریبوں کی کمائی سے بڑے بڑے ذی شان محلات تعمیر کر رکھے تھے۔ چلو لوٹ کر وہیں چلو۔ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے یہ چیزیں دوسروں کی کمائی سے کیسے بنا لیں؛ تمہیں اس کا حق کیسے پہنچتا تھا؟

تاکہ تم سے پوچھا جائے

اس ٹکڑے پر ذرا غور کرو سلیم! کہ قرآن نے کیا بات کہہ دی ہے۔ غلط نظام میں اوپر کا طبقہ سمجھتا یہ ہے کہ ہم جو کچھ جی چاہے کریں، ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اوّل تو وہ اپنے آپ کو قانون کی زد سے باہر سمجھتے ہیں، وہ ایسی تدابیر اختیار کرتے رہتے ہیں جن سے وہ قانون کی گرفت میں آ ہی نہ سکیں۔ اور اگر کہیں ایسا ممکن نہ ہو تو وہ قانون ہی ایسا بنا لیتے ہیں جس کی رُو سے وہ سب کچھ جائز قرار پا جائے جو کچھ وہ کرتے ہیں (اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (۴/۳۷) چنانچہ نظامِ سرمایہ داری میں یہی کچھ ہوتا ہے کہ اوپر کا طبقہ اس قسم کے قوانین بنا لیتا ہے کہ وسائلِ پیداوار پر انفرادی ملکیت بے حد و نہایت UN-LIMITED جائز ہے۔ دوسری طرف وہ اربابِ شریعت کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے اور وہ فتوے دے دیتے ہیں کہ اس قسم کی ذاتی ملکیت پر حد بندی عائد کرنا مداخلت فی الدّین ہے۔ اس طرح یہ سب کچھ قانوناً اور شرعاً جائز قرار پا جاتا ہے اور اس کے متعلق ان سے کچھ پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان حیلوں اور بہانوں ان روباہ بازیوں اور دسیسہ کاریوں، ان خدا فریبیوں اور خود فراموشیوں سے تم خدا کے قانونِ

مکافات کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ ان سے تم اس "خطرے" سے محفوظ نہیں ہو سکتے کہ اگر کسی نے پوچھ لیا تو اس کا کیا جواب دیں گے۔ خدا کا قانون تو پائی پائی کا حساب لے لے گا۔ جب "تم جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے" (لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ) تو اس وقت لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (۱۰۲/۸) تم سے ہر نعمت کے متعلق پوچھا جائے گا کہ وہ کیسے حاصل کی گئی تھی اور کہاں صرف ہوئی تھی۔

اس وضاحت کے بعد پھر اصل آیت کی طرف لوٹو۔ قرآن کہتا ہے کہ جب ان قوموں کی طرف تباہی کا عذاب آیا۔ اور وہ اسے دیکھ کر بھاگنے لگے تو ہمارے قانون نے انہیں للکارا اور کہا کہ رُک جاؤ اور لوٹ کر اپنے عشرت کدوں کی طرف چلو تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ ان پر تمہارا کیا حق تھا۔ اس کے بعد سے قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝ اس کے جواب میں انہوں نے (بزبانِ حال کہا کہ) حقیقت یہ ہے کہ ہم واقعی زیادتی کیا کرتے تھے۔ دوسرے کے حق پر غاصبانہ قبضہ جما لیا کرتے تھے اور یہ تباہی اسی وجہ سے آئی ہے فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ ۝ لیکن اس وقت ان کے اس اعتراف اور اقرار سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ یہ کہتے رہے اور ہمارا قانون انہیں تباہ و برباد کرتا رہا تا آنکہ وہ ایسے ہو گئے جیسے کوئی کٹا ہوا کھیت یا بجھا ہوا انگارہ ہو۔

اس کے بعد سلیم! قرآن ایک ایسی بات کہتا ہے جو فکر و نظر کی پوری کائنات کو اپنی طرف مرکوز کر لیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کچھ یونہی ہنگامی طور پر نہیں ہوتا بلکہ ہمارے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوتا ہے جسے نتیجہ خیز بنانے کے لئے یہ ساری کائنات مصروفِ گردش ہے۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ۝ (۲۱/۱۱-۱۶) یہ کائنات اور یہ ارض و سما کا سلسلہ ہم نے یونہی کھیل تماشا کے طور پر نہیں بنا دیا۔ یہ عظیم کارگہ ایک خاص مقصد کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی عمل اپنا نتیجہ مرتب کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور اس کے ایک آیت بعد وہ آیت ہے جسے پہلے بھی درج کیا جا چکا ہے یعنی بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) یہ سلسلہ کائنات اس لئے سرگرمِ عمل ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں حق غالب رہے اور باطل کا سر کچلا جائے۔ لہذا قوموں کے عروج و زوال کے لئے جو قانون ہم

نے مقرر کیا ہے وہ نتیجہ خیز ہو کر رہتا ہے۔ اس کے راستے میں کوئی قوت مزاحم نہیں ہو سکتی۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے قوموں کی تباہی اور بربادی کے متعلق دوسرا اصول بیان کیا ہے؟ اس نے کہا ہے کہ جس نظام کی رُو سے ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی محنت پر عیش کی زندگی بسر کرے وہ نظام کبھی دیرپا نہیں ہو سکتا۔

تدبّر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

اب اور آگے بڑھو۔ نظامِ سرمایہ داری کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ایک طبقہ محنت کرتا ہے اور دوسرا طبقہ ان کی محنت پر مفت میں عیش اڑاتا ہے۔

اُمّتے بر اُمّتے دیگر چرد
دانہ ایں می کارد آں حاصل بُرد

دَولت سمیٹنے والے

اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک طبقہ دولت کو سمیٹ کر اپنے لئے مخصوص کئے جاتا ہے اور اسے نوعِ انسانی کی نشو و نما کے لئے کھُلا نہیں رکھتا۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے بُخل کہتے ہیں۔ قرآن کا کہنا یہ ہے کہ جو نظام بُخل کے نظریہ کو دلیلِ راہ بنائے اس کی حامل قوم کبھی زندہ و پائندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے مٹا دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ سورۃ محمدؐ میں ہے۔ هَآ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ سُن رکھو کہ تمہاری کیفیت کیا ہے؛ تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں کہا جاتا ہے کہ تم اپنا نظام ایسا رکھو جس میں تمہاری محنت کا ماحصل نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے اس طرح کھُلا رہے کہ تم اس کے معاوضے میں کسی سے کچھ لینے کے طلبگار نہ ہو۔ لیکن تم میں ایسی ذہنیت رکھنے والے پیدا ہو جاتے ہیں جو سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھو! وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ جو شخص دوسروں کو مال و دولت سے محروم رکھتا ہے وہ درحقیقت اپنی ذات کو سعادتوں اور کامرانیوں سے محروم رکھتا ہے۔ اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ اللہ تمہارے مال و دولت سے بے نیاز ہے اور تم اپنی نشو و نما کے لئے اس کے محتاج ہو۔ بہرحال اسے اچھی طرح سُن رکھو کہ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ

قَوْمًا غَيْرَكُمْ لا اگر تم نے حق کے نظام سے مُنہ موڑ کر غلط روش اختیار کر لی تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا۔ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْآ اَمْثَالَكُمْ ○ (۴۷/۳۸) اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔
تم نے غور کیا سلیم! کہ آیت کے آخری ٹکڑے میں قرآن نے کتنی گہری بات کہہ دی ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ قوموں کی ادلا بدلی یونہی اندھا دُھند نہیں ہو جاتی کہ ایک قوم مٹا دی جاتی ہے اور اس کی جگہ اس جیسی ایک اور قوم آجاتی ہے۔ اگر اس کی جگہ اس جیسی قوم نے آنا ہو تو پہلی قوم کو مٹایا ہی کیوں جائے؟ محض تبدیلی کی خاطر تبدیلی CHANGE FOR CHANGE SAKE می نسزد خدا سے را (اللہ کے شایانِ شان نہیں)۔ ایک قوم مٹتی ہی اس وقت ہے جب اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ لہٰذا اس کی جگہ وہی قوم آسکتی ہے جس میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو۔ یہاں گردشِ دولابی نہیں کہ ایک کلچر نے کچھ وقت کے بعد مٹنا ہے اور اس کی جگہ دوسرے کلچر نے لینی ہے خواہ یہ دوسرا کلچر اس پہلے کلچر جیسا یا اس سے بدتر ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں حق و باطل کی کشمکش ہے۔ مٹتی وہ قوم ہے جو حق پہ نہ رہے۔ اور اس کی جگہ آتی وہ قوم ہے جو اس کے مقابلہ میں حق پر ہو۔ یہ ہیں معنی ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْآ اَمْثَالَكُمْ کے۔ یعنی وہ قوم تمہارے جیسے کلچر کی حامل نہیں ہوگی۔

اس کے بعد قرآن ایک ایسی حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ نگہ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے، وجد و مسرت سے جھوم اٹھتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں قوموں کی موت و حیات کا ایک ایسا راز پوشیدہ ہے جس تک بہت کم نگاہیں پہنچتی ہیں۔ دنیا میں ہر پروگرام کے دو حصّے ہوتے ہیں۔ پہلا حصّہ پلان اور اسکیم کا حصّہ ہے۔ اس میں پروگرام کے مختلف پہلوؤں پر فکری طور پر غور کیا جاتا ہے۔ اس کے مَالَهُ وَمَا عَلَيه PROS & CONS کو سامنے لایا جاتا ہے۔ اس کی عملی تشکیل کے مختلف نقشے بنائے جاتے ہیں۔ اس پر پوری پوری بحث و تمحیص کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حصّہ محض لفظوں اور باتوں، کاغذوں اور لکیروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن اس پروگرام کی تکمیل کے لئے یہ ہوتا ہے نہایت ضروری۔ جب اس حصّہ کی تکمیل ہو جاتی ہے، تو پھر اس پروگرام کا عملی پہلو شروع ہو جاتا ہے اور جو چیزیں اس وقت تک باتوں اور لفظوں تک محدود تھیں وہ اب رفتہ رفتہ محسوس پیکروں میں سامنے آنے لگ جاتی ہیں۔ جو قوم اس طرح پروگرام بناتی اور انہیں تکمیل تک پہنچاتی ہے وہ کامیاب و کامران رہتی ہے لیکن اگر کوئی قوم ساری عمر اسکیمیں ہی بناتی رہے۔ تمام وقت سوچنے ہی میں صرف

محض باتیں بنانے والے

کردے. زندگی بھر باتیں ہی کرتی رہے اور عملاً ایک قدم نہ اٹھائے وہ قوم تباہ و برباد ہو کر رہتی ہے. خواہ اس کی فکر کتنی ہی ثریا بوس اور اس کی نگاہ کیسی ہی فلک رس کیوں نہ ہو. بالفاظِ دیگر قومیں محض فلسفے کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتیں. زندگی عمل سے بنتی ہے. فلسفہ، فکری صلاحیتوں کو جلا دیتا ہے تاکہ ان سے عمل کی راہیں روشن ہو جائیں. لیکن اگر کوئی قوم محض فلسفی بن کر رہ جائے اور عمل کے لئے کوئی قدم نہ اٹھائے تو اس کی مثال اس راہ گذر کی سی ہوگی جو راستہ چلنے کے لئے شمع تو روشن کرے لیکن اس شمع کو لے کر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا رہے. ظاہر ہے کہ یہ مسافر عمر بھر اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا اور اس کی لالٹین کا تیل بھی بیکار جلے گا. جو قومیں عمل سے بیگانہ ہو جائیں ان کے مفکر، مابعد الطبیعاتی مسائل METAPHYSI-CAL PROBLEMS کے حل کرنے میں دماغ سوزی کرتے رہتے ہیں اور ان کے لیڈر اسکیمیں بنانے میں مصروف اور بیانات دینے اور تقریریں کرنے میں مشغول رہتے ہیں. اور دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں. حالانکہ نہ ان مفکرین کی فکر، اور نہ ان لیڈروں کے الفاظ قوم کو تباہی سے بچا سکتے ہیں جو قومی زندگی کے عملی مسائل کی طرف سے آنکھیں بند کر کے نظری مباحث میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے' اس کی موت یقینی ہے. اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

قرآن نے اسے خَوض سے تعبیر کیا ہے. جس کے معنی ہیں بیکار باتوں میں الجھنا. یونہی نظری طور پر مسائل کی گہرائیوں میں اُترنا.

اب اس حقیقت کے دوسرے پہلو کو لو. زندگی کا تعلق بیشتر ان معاملات سے ہے جن کی کوئی نہ کوئی افادی حیثیت UTILITAREAN VALUE ہو. لیکن انسانی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ اسے کام کے ساتھ ساتھ اعصاب کے سکون کی بھی ضرورت ہے. فنونِ لطیفہ FINE ARTS کا زیادہ تعلق زندگی کے اس پہلو سے ہے. انسانی زندگی میں کام کی حیثیت اگر پٹرول کی ہے تو فنونِ لطیفہ کی حیثیت موبل آئل کی سی ہے. اس سے زندگی کے موٹر کے پرزے آپس میں رگڑ نہیں کھاتے. ان میں FRICTION نہیں پیدا ہوتی. لوچ اور لچک رہتی ہے. لیکن آپ سوچئے کہ اگر کسی موٹر میں

پٹرول کی جگہ بھی موبل آئل ہی ڈال دیا جائے تو وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکے گا۔ یہی حالت ان قوموں کی ہوتی ہے جو زندگی کے عملی پہلوؤں کو نظر انداز کردیں اور اپنی ساری توجہ فنونِ لطیفہ کی ترقی اور نشوونما پر مرکوز رکھیں۔ وہ قوم مصافِ زندگی میں دوسری قوموں کا مقابلہ کبھی نہیں کرسکتی۔ قرآن نے اسے لعب سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی کھیل تماشے کے ہیں۔

فنونِ لطیفہ

قرآن کہتا ہے کہ جو کلچر خوض اور لعب ہی کو مقصودِ حیات سمجھے اس کی حامل قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ سورۂ معارج میں ہے کہ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ہم اس پر قادر ہیں کہ (اس مخاطب قوم کی جگہ) ایک ایسی قوم کو لے آئیں جو ان سے بہتر ہو۔ یہ ہمیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتے۔ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۙ (۴۱-۴۲/ ۷۰) سو تو انہیں خوض و لعب میں مشغول رہنے دے۔ تاآنکہ وہ روزِ بد ان کے سامنے آجائے جس کے متعلق ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ آکر رہے گا۔

تاریخ کے اوراق پر یونان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس قوم کا حکمت و فلسفہ میں یہ عالم تھا کہ ان کے مفکرین کا شمار آج تک دنیائے فکر کی صفِ اول میں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فنونِ لطیفہ (مصوری، مجسمہ تراشی، موسیقی اور شاعری) میں بھی وہ جس مقام تک پہنچ چکے تھے، بہ ہیئت مجموعی اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ لیکن عملی اور افادی دنیا میں ان کی یہ حالت تھی کہ وہ ایک سوئی تک بھی اپنے ہاں تیار نہیں کرسکتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ قوم اس طرح نیچے گری کہ اسے پھر ابھرنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ ان کا بلند ترین فلسفہ اور لطیف ترین فنون انہیں اس تباہی سے قطعاً نہ بچا سکے۔ ان کی جگہ ان قوموں نے لے لی جو خَيْرًا مِّنْهُمْ (ان سے بہتر) تھیں۔ استبدال اور استخلافِ قومی کا یہ بھی ایک اہم قانون ہے جسے قرآن نے اس انداز سے پیش کیا ہے۔ اس کے بعد قرآن نے ایک ایسا قانون پیش کیا ہے جسے ان تمام قوانین کا اصل الاصول اور ان تمام اصولوں کا لبِ لباب کہنا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی مسلسل جدّوجہد کا نام ہے۔ مسلسل جدّوجہد، پیہم سعی و عمل، غیر منقطع تگ و تاز۔ اس کا نام ہے زندگی۔

جدّوجہد سے جی چرانے والے

گردشِ پیہم سے پختہ تر ہے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

جو قوم جس سانس میں جدّوجہد (جہاد) سے جی چراتی ہے اسی سانس میں اس پر موت طاری ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ موت درحقیقت نام ہی ترکِ جہاد کا ہے۔

مگر کوتاہئ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

قرآن نے اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ جو قوم جہادِ زندگی سے جی چراتی ہے تباہ و برباد ہوجاتی ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَا لَکُمۡ اِذَا قِیۡلَ لَکُمُ انۡفِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اثَّاقَلۡتُمۡ اِلَی الۡاَرۡضِ ؕ اے جماعتِ مومنین! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں باہر نکلو تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین گیر ہوجاتے ہیں۔ اَرَضِیۡتُمۡ بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا مِنَ الۡاٰخِرَۃِ ۚ کیا تم مستقبل کے مفاد کو چھوڑ کر مفادِ عاجلہ پر ریجھ گئے ہو؟ فَمَا مَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیۡلٌ ۝ اگر ایسا ہی ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ قریبی مفاد، مستقبل کے مفاد کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ اِلَّا تَنۡفِرُوۡا یُعَذِّبۡکُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۬ۙ اگر تم جہادِ زندگی کے لئے باہر نہ نکلے تو یاد رکھو تم پر سخت تباہی آجائے گی وَّ یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ اور خدا کا قانونِ مکافات تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے آئے گا۔ وَلَا تَضُرُّوۡهُ شَیۡـًٔا ؕ اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ وَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝ (۹/۳۸-۳۹) اللہ کا قانون نافذ العمل ہو کر رہتا ہے۔ اس میں اس کی قدرت ہے۔

ان مقامات میں تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ قرآن نے قوموں کے عروج و زوال اور ان کی موت و حیات کے لئے کیا قوانین و اصول بیان کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تم تاریخِ انسانیت پر غور کرو اور دیکھو کہ ہر قوم کی داستان کس طرح انہی قوانین کی صداقت کی شہادت بہم پہنچاتی ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جب پہلے یہی کچھ ہوتا رہا ہے تو اب بھی یہی کچھ ہوگا۔ وراثتِ ارض نہ آباؤ اجداد سے ترکہ میں مل سکتی ہے، نہ بخشش کے طور پر۔ اس کے لئے ایک اٹل قانون مقرر ہے۔ وہ قانون کیا ہے؟ اسے قرآن نے چند

الفاظ میں یوں سمٹا کر رکھ دیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں پہاڑ سما جائے۔ سورۂ انبیاء میں ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ ہم نے ہر آسمانی صحیفہ میں ضروری قوانین اور تاریخی یادداشتیں درج کر دینے کے بعد اس

صلاحیت بنیادی شرط ہے

اصل الاصول کو محکم طور پر بیان کر دیا ہے کہ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۝ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ زمین کے وارث وہی لوگ ہوسکتے ہیں جن میں اس کے لئے ضروری صلاحیت موجود ہو۔ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ۝ (۲۱/۱۰۵-۱۰۶) یہ قانون ایسا ہے جس میں ہر اس قوم کے لئے جو اپنی زندگی کو نظامِ خداوندی کے تابع رکھنا چاہے، ایک دُور رس حقیقت پوشیدہ ہے۔ اسی محکم اصول کے مطابق خود مسلمانوں سے کہہ دیا گیا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

استخلاف فی الارض

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ جو لوگ تم میں سے خدا کے قانون کی محکمیت پر یقین رکھ کر اس کے متعیّن فرمودہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے ان کے متعلق خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ انہیں زمین حکومت عطا کرے گا اور یہ چیز انہیں کسی خصوصی رعایت سے AS A SPECIAL FAVOUR نہیں ملے گی۔ یہ خدا کے اس اٹل قانون کی رُو سے ہوگا جس کے مطابق اقوامِ سابقہ کو بھی حکومت ملتی رہی ہے كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (جیسا کہ اس نے اقوامِ سابقہ کو حکومت عطا کی تھی) یہ اس لئے ہوگا کہ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ تاکہ وہ نظامِ زندگی (دین) جسے ان کے لئے تجویز کیا گیا ہے، متمکّن ہو جائے (اس سے واضح ہے سلیم! کہ حکومت کے بغیر دین متمکّن ESTABLISHED ہو نہیں سکتا)۔ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا تاکہ وہ ان کے خوف کو امن سے بدل دے۔ اس سے ہوگا یہ کہ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وہ صرف میرے قوانین ہی کی محکومیت اختیار کریں گے اور ان میں کسی اور کے قوانین کو شریک نہیں کریں گے۔ (اس سے یہ بھی واضح ہے کہ خدا کی عبادت سے مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنی حکومت میں ہی ادا ہو سکتی ہے۔ اگر عبادت سے مفہوم محض نماز روزہ کی ادائیگی ہو تو اس کے لئے اپنی حکومت کی ضرورت ہی نہیں۔ انہیں تو محکوم مسلمان بھی اس طرح ادا کرتے رہتے ہیں جس طرح

آزاد)۔ اس کے بعد ہے وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (۲۴/۵۵)
اور جس قوم نے اس قسم کے ایمان و عملِ صالح کے بعد پھر سے انکار کی راہ اختیار کر لی تو ان کے متعلق سمجھ لو کہ وہ سیدھے راستے سے پھر گئے۔ اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا (فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (۴۶/۳۵)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے قوموں کی موت اور حیات کے لئے ایک محکم قانون مقرر ہے۔ جو قوم اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے اسے زندگی کی توانائیاں مل جاتی ہیں جس کا نتیجہ عروج و اقبال ہوتا ہے۔ جو اس قانون کے خلاف زندگی بسر کرتی ہے اس کے حصّہ میں تباہیاں اور بربادیاں آجاتی ہیں۔ اللہ نے یہ قانون مقرر کر دیا اور انسان کو اس کا اختیار دے دیا کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرے۔ اگر وہ چاہے تو زندگی بخش اصولِ حیات اختیار کر لے۔ اگر چاہے تو فنا در آغوش راستہ پر چل پڑے۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ اس باب میں قرآن نے کس قدر واضح تعلیم دے دی ہے۔ لیکن تم حیران ہو گے کہ اسی قرآن کی حامل قوم (مسلمان) اب یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ یہاں اختیار و ارادہ کا سوال ہی نہیں۔ انسان مجبورِ محض واقع ہوا ہے۔ افراد کی طرح قوموں کی موت اور زندگی کا بھی ایک وقت مقرر ہے اور جب وہ وقت آجاتا ہے تو اس میں ایک ساعت کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ نہ کوئی قوم اپنی کوششوں سے اس مدت کو بڑھا سکتی ہے، نہ اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں سے اس میں کوئی کمی کر سکتی ہے۔ اور حیرت بالائے حیرت یہ کہ اپنے اس (یکسر غیر قرآنی عقیدہ) کی تائید میں سند بھی قرآن ہی سے پیش کرتی ہے۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ط (۲/۲۶)۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
"تن بہ تقدیر" ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس عقیدہ کی تائید میں قرآن کی جو آیت پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ○ (۷/۳۴) ہر قوم کے لئے ایک اجل ہے۔ جب ان کی اجل آجاتی ہے تو ایک ساعت کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہر عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اس وقفہ کی مدت یا میعاد کو اجل کہا جاتا ہے۔ اس اجل (ظہورِ نتائج کے وقت) سے پہلے پہلے اگر وہ قوم اپنی روش بدل لے تو وہ اپنی سابقہ غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچ سکتی ہے۔ لیکن جب وہ نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں تو پھر انہیں کوئی نہیں ٹال سکتا۔ مختلف اعمال کے لئے یہ مہلت کا وقفہ (اجل) مختلف ہوتا ہے (جس طرح مثلاً کیلا سال کے بعد پھل دے دیتا ہے اور کھجور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ چالیس سال کے بعد پھل لاتی ہے۔ یا مثلاً تھوڑی مقدار میں افیون کھانے سے SLOW POISONING ہوتی ہے اور ایک ہی بار زیادہ کھا لینے سے فوری موت واقع ہو جاتی ہے۔ جسے ہم موت کہتے ہیں وہ درحقیقت ظہورِ نتائج کا وقت ہوتا ہے۔ یہ نتائج بہت پہلے سے مرتب ہونا شروع ہو چکے ہوتے ہیں۔ ان کی نمود ایک خاص وقت پر جا کر ہوتی ہے اسے اجل کہتے ہیں) اور اس کے لئے بھی قانون مقرر ہے کہ فلاں قسم کے اعمال کے ظہور نتائج کے لئے کتنی مدت (اجل) درکار ہے اور فلاں قسم کے اعمال کے لئے کتنی۔ دیکھو! قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر نمایاں الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو، سورۃ اعراف میں ہے لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ (۷/۳۴) (ہر قوم کے لئے ایک اجل ہے) اور سورۃ رعد میں ہے لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸) (ہر اجل کے لئے ایک قانون مقرر ہے)۔ يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ۔ خدا کا یہی قانونِ مشیت ہے جس کی رُو سے قوموں کا محو و ثبات عمل میں آتا رہتا ہے۔ قومیں مٹتی رہتی ہیں اور ثابت و قائم رہتی ہیں۔ یہ قانونِ مشیت، انسانوں کا بنایا ہوا نہیں۔ یہ خدا کا کائناتی قانون ہے جس کی اصل و بنیاد (سرچشمہ ROOT) خود خدا کے پاس ہے۔ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ (۱۳/۳۹) لہٰذا کوئی اس میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ یہ انسانوں کی دسترس سے باہر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ قانون کیا ہے جس کی رُو سے قوموں کا محو و ثبات عمل میں آتا رہتا ہے۔ اس کے متعلق پھر دہرا دو یا يَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ۚ (۴۲/۲۴) خدا اپنے قانون کی رو سے باطل کو محو کرتا رہتا ہے حق کو محکم اور اٹل

ہر قوم کی اجل

بناتا ہے۔ ہر وہ کلچر مٹ جاتا ہے جو باطل پر مبنی ہو اور وہ باقی رہتا ہے جو حق پر استوار ہو۔

اگرچہ یہ اصول بالکل واضح طور پر سامنے آچکا ہے کہ وہ کون سا کلچر ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ کون سا جس کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر۔ لیکن قرآن تجریدی اصولوں ABSTRACT PRINCIPLES کو محسوس مثالوں CONCRETE EXAMPLES سے واضح کر دیتا ہے تاکہ ان کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو اور ان میں کوئی ابہام یا ایہام نہ رہے چنانچہ اس نے اس حقیقت کو بھی محسوس مثال کے ذریعے واضح کر دیا ہے کہ وہ کون سا کلچر یا نظام ہے جس میں دوام و استمرار کی صلاحیت ہوتی ہے۔ سورۂ رعد میں ہے اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا۔ اللہ بادلوں سے بارش برساتا ہے تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہنے شروع ہو جاتے ہیں۔ فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ تو یہ سیلاب زمین کے خس و خاشاک کو پرکاہ کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ یعنی پانی کی منفعت بخش نمی زمین میں جذب ہو جاتی ہے اور کوڑا کرکٹ جس میں نفع رسانی کی صلاحیت نہیں ہوتی نذرِ سیلاب ہو جاتا ہے۔

بقا کا محکم اصول

یہ پہلی مثال ہے۔ دوسری مثال ہے وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ سونے (یا کسی اور دھات) کو سنار اپنی کٹھالی میں ڈال کر تپاتا اور گلاتا ہے تاکہ اس سے زیور یا اور سامان بنائے، تو اس میں ملا ہوا کھوٹ، جھاگ کی طرح اوپر آجاتا ہے۔ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۬ؕ اسی طرح خدا کے قانون کے مطابق حق و باطل کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وہ کھوٹ جو جھاگ کی طرح اوپر آجاتا ہے، رائگاں چلا جاتا ہے۔ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ (اور جو چیز نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ؕ (۱۳/۱۷) اسی طرح اللہ، محسوس مثالوں کے ذریعے، مجرد حقائق کی وضاحت کرتا ہے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے بقاء و دوام کے لئے کیا قانون بتایا ہے؟ یہ قانون کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ اسی کلچر اور نظام میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو تمام نوعِ انسانی کی نفع رسانی کا موجب ہو۔ کسی خاص خاندان، خاص گروہ، خاص

پارٹی، خاص جماعت یا خاص قوم کی نفع رسانی کا موجب نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کی نفع رسانی کا موجب۔

میں سمجھتا ہوں سلیم! کہ یہ وہ اصول ہے جسے خورشید کی شعاعوں سے صفحۂ آسمان پر لکھ دینا چاہیئے تاکہ یہ حقیقت دنیا کی ہر قوم کے سامنے ہر وقت رہے کہ بقا کا ابدی قانون کیا ہے۔ مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ۔

ہماری بازآفرینی کی صورت؟

اس کے بعد تمہارا یہ سوال سامنے آتا ہے ذلّت و خواری کی جس پستی میں ہم (مسلمان) گر چکے ہیں، کیا ہمارے لئے اس سے نجات کی بھی کوئی صورت ہے یا ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہلاک ہو چکے ہیں۔ اور ہماری بازآفرینی کی کوئی صورت باقی نہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں! اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں دوبارہ زندگی مل سکتی ہے۔ تم پھر عروج تک پہنچ سکتے ہو۔ بشرطیکہ....... ہاں سلیم! یہ ٹکڑا بہت غور طلب ہے۔ بلکہ یہی تو اس ساری کہانی کی جان ہے۔ بشرطیکہ........ لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے چند چیزیں تمہیداً سامنے لانا ضروری ہیں۔

تم نے دیکھا ہے کہ قوموں کی موت اور حیات کے معنی ہیں مختلف کلچرز کا باہمی ٹکراؤ۔ قرآن نے مختلف کلچرز کو دو بنیادی شقوں CATEGORIES میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک کلچر وہ ہے جس میں ایک قوم قوانینِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ اسے قرآن نے صلوٰۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرا کلچر وہ ہے جس میں انسان خود اپنے خیالات اور خواہشات کا اتباع کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ اور ان کی متبع جماعتیں، صلوٰۃ کے کلچر کی حامل ہوتی ہیں جس کا نتیجہ ہر قسم کی شادکامی اور کامرانی ہوتا ہے۔ لیکن پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہو جاتے ہیں جو اس روشِ زندگی کو چھوڑ کر، دوسرا کلچر اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح یہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ سورۂ مریم میں مختلف انبیائے کرامؑ کے تذکارِ جلیلہ کے سلسلہ میں فرمایا کہ یہ وہ حضرات تھے جنہیں اللہ نے زندگی کی ہر قسم کی آسودگیوں اور خوشحالیوں سے نوازا (أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ) لیکن ان کے بعد۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا

اَلشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹/۵۹) ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہو گئے جنہوں نے صلوٰۃ کے نظام کو ضائع کر دیا اور اپنے خیالات اور خواہشات ہی کے پیچھے چل پڑے. سو ایسا کرنے والوں کی سرکشی کے نتائج ان کے سامنے آکر رہتے ہیں.

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظامِ صلوٰۃ کے قیام کا نتیجہ نعمائے زندگی سے سرفرازی اور اسے ترک کر دینے کا انجام ان آسودگیوں سے محرومی. اس اصول کے بعد مسلمانوں کی طرف آئیے! سورۂ فاطر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے اپنا آخری پیغام دے دیا اور حضورؐ کے بعد ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ ہم نے اپنے بندوں میں سے ایک منتخب قوم کو اس کتاب کا وارثؑ بنایا. یہ قوم اپنے اوّلین ایام میں اس نظام کو قائم کرنے میں پیش پیش رہی. پھر اگلا دَور آیا تو ان کی حالت بَین بَین کی سی ہو گئی. اور اس کے بعد یہ بالکل دوسرے راستے پر چل پڑے. فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ (۳۵/۳۲). ہم اس تیسرے دَور میں ہیں. اسی حقیقت کو قرآن نے سورۂ آلِ عمران میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے. اس میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی راہ کون سی ہے اور اسے حضرات انبیاء کرامؑ نے کس طرح اختیار کیا. اس کے بعد اس حقیقت کا اعلان ہے کہ فوز و فلاح اور سعادت و برکات کی یہی ایک راہ ہے. وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (۳/۸۵) جو قوم اس راہ کو چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرے گی تو اس کی یہ راہ قابلِ قبول نہیں ہو گی. اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ آخرالامر تباہ و برباد ہو جائے گی. اس کے بعد مسلمانوں کی تاریخ سامنے لائی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ بھلا سوچو کہ خدا اس قوم پر زندگی کی راہیں کس طرح کشادہ کر دے گا جس نے ایمان کے بعد کفر کی روش اختیار کر لی ہو وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۗ حالانکہ ان کی طرف خدا کا واضح ضابطۂ حیات آچکا تھا. اور وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے تھے کہ ان کے رسولؐ نے اس ضابطۂ حیات پر عمل پیرا ہو کر کس

طرح تعمیری نتائج پیدا کر دکھائے تھے. یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اس قوم نے کفر کی راہ اختیار کر لی. وَ اللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔ سو ایسی ظالم قوم کو خدا کس طرح سعادتوں کی راہ دکھائے! اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ اَنَّ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃَ اللّٰہِ وَ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ ان کی اس روش کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قوم ان تمام آسودگیوں سے محروم ہو گئی جو نظامِ خداوندی سے وابستگی سے حاصل ہوتی تھیں. اور ان تمام آسائشوں سے بھی محروم ہو گئی جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے ملتی تھیں. حتیٰ کہ ان کی ذلت و پستی کی وجہ سے دوسری قومیں بھی انہیں اپنے پاس نہیں آنے دیتیں اور دُور دُور رکھتی ہیں. لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ۔ اس بناء پر کہ انہوں نے اپنا نام مسلمان رکھ چھوڑا ہے' ان کی اس تباہی میں کسی طرح کمی واقع نہیں ہو سکتی. نہ ہی انہیں اس سے زیادہ مہلت مل سکتی تھی جتنی مہلت خدا کے قانونِ امہال و تدریج کی رُو سے ملا کرتی ہے.

اب سوال یہ ہے کہ کیا ان کی یہ محرومی ابدی اور یہ تباہی ہمیشہ کے لئے ہے یا اس سے رستگاری کی صورت ممکن ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ ممکن ہے. مندرجہ بالا آیات کے بعد ہے. اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ وَ اَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (۸۵ - ۳/۸۹) ہاں! اگر یہ اپنی اس روش کو چھوڑ کر پچھلے پاؤں مُڑ جائیں اور پھر اس مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے ان کا قدم غلط راستے پر پڑ گیا تھا. اور وہاں پہنچ کر پھر خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو جائیں تو خدا کا قانون اس تباہی و بربادی سے ان کی حفاظت بھی کر دے گا اور ان کی نشوونما کا پورا پورا سامان بھی مہیا کر دے گا. بس یہی ان کی بازآفرینی کی صورت ہے.

دیکھو سلیم! قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اس امت کو جو سرفرازیاں شروع میں نصیب ہوئی تھیں. وہ ان بیّنات (قرآن کے واضح قوانین) پر چلنے کا نتیجہ تھیں جو انہیں خدا کی طرف سے ملے تھے. پھر جب انہوں نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تو یہ ان تمام برکات سے محروم ہو گئے.

اور اب ان کی بازیابی کی صورت فقط ایک ہی ہے. اور وہ یہ کہ یہ پھر قرآن کے مطابق نظامِ زندگی متشکل کر لیں. اس کے سوا ان کی نشأۃِ ثانیہ کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی

خواہ یہ کچھ ہی کیوں نہ کرلیں۔

کیوں سلیم! بات آئی سمجھ میں!

اچھا خدا حافظ!

والسلام

جنوری ۱۹۵۷ء

پرویز

اڑتیسواں خط

فقط ایک بار دیکھا ہے.....!

ہاں سلیم! آسمان کی آنکھ نے ایک مرتبہ وہ دَور دیکھا ہے جب " زمین خدا کے نظامِ ربوبیت کے نُور سے جگمگا اُٹھی تھی " اور انسان نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ خوابِ زندگی کی تعبیر کیا ہے اور کاروانِ انسانیت کی منزلِ مقصود کون سی ہے؟ یہ دَور وہ تھا جب محمدؐ رسول اللہ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے ہاتھوں نظامِ خداوندی کا تختِ اجلال بچھایا گیا اور انسان نے عملاً محسوس کیا کہ حقیقی آزادی کہتے کسے ہیں! اس میں شبہ نہیں کہ اس دَور کا عرصہ بڑا مختصر تھا. اتنا مختصر جو تاریخ کے پیمانوں کے اعتبار سے آنکھ جھپکنے سے زیادہ نہیں کہلا سکتا لیکن اس ایجاز میں وہ تمام تفاصیل سمٹ کر آگئی تھیں جن سے زندگی مرتب ہوتی ہے. لیکن ہماری بدقسمتی یہ نہیں کہ اس دَور کی مدّت اس قدر مختصر تھی. بدقسمتی یہ ہے کہ اس دَور کی پوری پوری اور بلا آمیزش تاریخ ہمارے سامنے نہیں آئی. ہماری تاریخ اس دَور میں جاکر مرتب ہوئی جب خلافت، ملوکیت سے اور ربوبیتِ عامہ، مفاد پرستیوں سے بدل چکی تھی. جب قرآن جزدانوں میں بند ہو چکا تھا اور اسلام کی جگہ ان تصوّرات نے لے لی تھی جو یہودیوں کے ہیکلوں، عیسائیوں کی خانقاہوں اور مجوسیوں کے آتشکدوں میں تراشے گئے تھے. ظاہر ہے کہ جو تاریخ ان حالات میں مرتب ہوئی ہو اس میں اس دَور کی اصلی تصویر کس طرح سامنے آسکتی تھی جس دَور میں ان تمام تصوّرات کی بساط اُلٹ کر معاشرہ کی بنیادیں خالص قانونِ خداوندی پر رکھی گئی تھیں. اس دَور کا جس قدر حصّہ کہ قرآن نے اپنی دفتین میں محفوظ کر رکھا ہے حتمی اور یقینی کہلا

سکتا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے اس میں سے صرف وہ حصّہ قابلِ قبول قرار پا سکتا ہے جو قرآن کے خلاف نہ ہو۔ اس لئے کہ جو معاشرہ قائم ہی قرآن کے خطوط پر ہوا تھا اس میں قرآن کے خلاف کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ اس دَور کی تاریخ کے لئے قرآن کو بنیادی معیار قرار دیتا ہوں۔ تم نے "معراجِ انسانیت[1]" کو دیکھا ہے۔ اس میں نبیٔ اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ کے متعلق کتبِ سیر و روایات میں سے کافی کچھ موجود ہے، لیکن وہی جو قرآن کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ لہٰذا ہماری تاریخ میں قرآنی نظامِ ربوبیّت کا مکمّل نقشہ کہیں نہیں مل سکتا۔ اس لئے کہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے یہ تاریخ اس عہد میں مرتّب ہوئی تھی جب نظامِ ربوبیّت کی جگہ سرمایہ پرستی اور ملوکیت کے نظام نے لے لی تھی۔ اس وقت نظامِ ربوبیّت کا نقشہ سامنے لایا جاتا تو ہر شخص پکار اٹھتا کہ جو کچھ آج اسلام کے نام پر ہو رہا ہے اسے تو اسلامی نظام سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس طرح اس غلط نظام کے حاملین کے لئے بڑی مشکل کا سامنا ہو جاتا۔ لہٰذا جو تاریخ اُس دَور میں مرتّب ہوئی تھی اس میں اسلام کا نقشہ اسی قسم کا ہونا چاہیئے تھا جس پر اس دَور کا نظام پورا اترتا تاکہ لوگ سمجھ لیتے کہ جو کچھ آج ہو رہا ہے وہ اسلام کے خلاف نہیں۔ اس تاریخ میں البتہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ٹکڑے ایسے مل جاتے ہیں جن کی تابندگی نگاہوں میں چمک پیدا کر دیتی ہے۔ اور جو بیساختہ پکار اُٹھتے ہیں کہ ہم اس فردوسِ گم گشتہ کی حسین یادگار ہیں جس سے "آدم" نکالا گیا ہے۔ ان ٹکڑوں میں سے سلیم! چند ایک کو تم بھی وجہٴ نورانیّتِ قلب و نظر بنا لو۔ اس سے زیادہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔

حلقہ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گِل
آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما

ذرا سوچو سلیم! کہ وہ کون سی چیز ہے جس کی انسان کو سب سے زیادہ خواہش رہتی ہے۔ تم تاریخ کے اوراق کو اُلٹو۔ اقوامِ گذشتہ کے احوال و کوائف پر نظر ڈالو۔ دورِ حاضرہ کی مختلف تحریکوں کا مطالعہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ ایک ہی خلش ہے جس نے انسان کو شروع سے آج تک

---

[1] مبسوط تصنیف جس میں سیرت النبی اکرمؐ قرآن کی روشنی میں مرتّب کی گئی ہے۔

طلسم پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔ ایک ہی تڑپ ہے جس نے اس پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔ وہ خلش ہے حصول آزادی کی آرزو۔ وہ تڑپ ہے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی تمنا۔ انسان نے ہمیشہ آزادی کی دیوی کی پرستش کی ہے۔ اس کے لئے بڑے بڑے مندر بنائے ہیں۔ ہمیشہ اس کے چرنوں میں اپنی شردھا کے پھول چڑھائے ہیں۔ اس کے حضور اپنی عقیدت مندیوں کے گیت گائے ہیں۔ اس کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اس کے نام پر انسان نے اتنا خون بہایا ہے کہ اس کا عُشرِ عشیر بھی کسی اور جذبے کے حصے میں نہ آیا ہوگا۔ انسان نے اسے ہمیشہ اپنی ہر متاع سے عزیز سمجھا ہے۔ وہ اس کی حفاظت کی خاطر ہر وقت اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ جن لوگوں نے آزادی کے تحفظ کی خاطر قربانیاں کی ہیں انسان نے ان کی یادگاریں قائم کی ہیں۔ جو اس کے حصول یا استحکام کے لئے مرے ہیں انہیں ہمیشہ امر (غیر فانی) سمجھا ہے۔ یہی کچھ انسان شروع سے کرتا آیا ہے اور یہی کچھ انسان آج بھی کر رہا ہے۔ لیکن سلیم! تم یہ سُن کر حیران ہو گے کہ آزادی کی خاطر یہ کچھ کرنے والا انسان آج تک یہ متعین نہیں کر سکا کہ آزادی کسے کہتے ہیں۔ بظاہر یہ بات بڑی اعجوبہ سی دکھائی دے گی، لیکن اگر تم ذرا بنگاہِ تعمق غور کرو تو تم خود محسوس کرو گے کہ آزادی کی کوئی جامع تعریف DEFINITION فی الواقعہ سامنے نہیں آئی۔ جنہیں یہ دعوٰے ہے کہ ان کے ہاں بڑی آزادی ہے، وہاں بھی قدم قدم پر پابندیاں ہیں۔ پابندیوں کے بغیر انسان کی اجتماعی زندگی کا تصور ناممکن ہے۔ سو کو لاکھ "آزاد" کہیں، اس کی ہستی اور بقا کے لئے اس کا پابہ گِل ہونا ناگزیر ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھو سلیم! تو نظر آئے گا کہ انسانی معاشرہ کا بنیادی تقاضا آزادی نہیں، پابندی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان آزادی کی خاطر جان دے دیتا ہے۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ پابندی اور آزادی کے ان دو متضاد اور باہمدگر نقیض تقاضوں میں موافقت اور مطابقت کی صورت کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جو ہمیشہ سیاسی مفکرین کے لئے الجھاؤ کا باعث رہا ہے۔ چنانچہ ایک مدت کی ذہنی کشمکش کے بعد ہمارے زمانے کے مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آزادی کے معنی ہیں قانون کی اطاعت۔ یعنی انسان کی اطاعت نہیں۔ بلکہ قانون کی اطاعت۔

اگر سلیم! کوئی یہ پوچھے کہ وہ کون سی چیز ہے جو انسان کو دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی تھی اور اسے

صرف اسلام نے آکر دیا، تو اس کے جواب میں بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے انسان کو وہ آزادی عطا کی ہے جو اسے کسی اور جگہ سے نہیں مل سکتی تھی۔ اس نے رسول اللہ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَ یَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ (۷/۱۵۷) آپ کی تشریف آوری کا مقصد یہ ہے کہ انسانیت کے سر سے اس بوجھ کو اتار دیا جائے جس کے نیچے وہ دبی چلی آرہی تھی اور اسے ان زنجیروں سے آزاد کر دیا جائے جن میں وہ جکڑی ہوئی تھی۔ انسان کو انسانوں کی خود ساختہ، اور خود عائد کردہ قیود و سلاسل سے آزاد کرانا، یہ ہے قرآن کا مطلوب۔ اس کے ساتھ ہی سلیم! تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ قرآن نے اس سوال کو بھی لاینحل نہیں رہنے دیا کہ آزادی کسے کہتے ہیں؟ اس نے آج سے چودہ سو سال پہلے (جب دنیا آزادی کے تصور تک سے آشنا نہ تھی) اس کا اعلان کر دیا کہ آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ کسی انسان سے کسی دوسرے انسان کی اطاعت نہ کرائی جائے۔ ہر شخص قانون کی اطاعت کرے اور قانون بھی انسانوں کا خود ساختہ نہ ہو بلکہ خدا کی طرف سے عطا فرمودہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس باب میں یہاں تک کہہ دیا کہ اور تو اور خود رسول کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ وہ خود قانونِ خداوندی کی اطاعت کرے گا۔ اور دوسروں سے بھی اس قانون کی اطاعت کرائے گا۔

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَهُ اللّٰهُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ کُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَ لٰکِنۡ کُوۡنُوۡا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡکِتٰبَ وَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ ۙ

(۳/۷۸)

کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ خدا اسے کتاب و حکومت و نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم، قانونِ خداوندی کی نہیں بلکہ، میری اطاعت کرو۔ اسے صرف یہ کہنا چاہیئے کہ تم سب اللہ کے اس ضابطۂ قوانین کی رُو سے ربانی بن جاؤ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کی تعلیم کو تم اپنے دلوں پر نقش کرتے ہو۔

لیکن سلیم! کہنے کو تو یہ بڑا آسان ہے (اور آج ساری دنیا یہی کہتی ہے) کہ اطاعت صرف قانون کی ہونی چاہیئے۔ لیکن جب یہ چیز عمل میں آتی ہے تو پھر اس میں ایسی دشواری پیش آتی ہے کہ شاید

ہی کوئی مقام ایسا رہ جائے جہاں انسانوں کی اطاعت نہ ہوتی ہو، بلکہ اطاعت صرف قانون کی ہوتی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون کا نفاذ انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ اس لئے نام تو قانون کا ہوتا ہے لیکن درحقیقت حکومت ان انسانوں کی ہوتی ہے جو قانون کو نافذ کرتے اور اس کے مطابق فیصلے دیتے ہیں۔ لہٰذا انسانی آزادی میں سب سے بڑا (اور مشکل) مرحلہ یہ ہے کہ قانون کو نافذ کرنے والے، دوسروں سے اپنی اطاعت نہ کرائیں بلکہ قانون کی اطاعت کرائیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر سمجھو کہ انسان کو صحیح آزادی حاصل ہے۔ ورنہ آزادی صرف نام کی ہوگی۔ انسانوں پر حکومت دوسرے انسان ہی کر رہے ہوں گے۔ اور اسی کا نام محکومی اور غلامی ہے۔

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ صحیح آزادی کے لئے ضروری ہے کہ قانون کا نافذ کرنے والا اپنی ذات کو قانون سے الگ رکھے۔ قانون کے نفاذ میں اس کے ذاتی میلانات و عواطف کو کوئی دخل نہ ہو۔ وہ اپنی ذاتی حیثیت کو دوسرے انسانوں سے ذرا بھی ممتاز نہ ہونے دے۔ دوسرے انسانوں کو اس کا خیال تک بھی نہ آنے دے کہ یہ (قانون کا نافذ کرنے والا) ہم سے ذرا بھی اونچا ہے۔ یہ ہے وہ کام سلیم! جو محمد رسول اللہ والذین معہ نے کر کے دکھایا۔ جہاں قرآنِ کریم نے پہلی مرتبہ انسانوں کے سامنے آزادی کا صحیح تصوّر رکھا، وہاں قرآن کو نافذ کرنے والوں نے بھی پہلی بار دنیا کو یہ ثابت کر کے دکھایا کہ قانون کو نافذ کرنے والوں کو کس طرح اپنی ذاتی حیثیت کو قانون سے یکسر الگ رکھنا چاہیئے۔ وہ تھا قرآنِ کریم کا پیغام، اور یہ تھا قرآنِ کریم کو نافذ کرنے والوں کا عمل۔ وہ بھی بے مثل و بے نظیر اور یہ بھی بے مثل و بے نظیر۔ یہی ہے وہ نکتہ سلیم! جس کی وضاحت کے لئے میں ان حضرات کے تذکارِ جلیلہ سے چند بکھری ہوئی پنکھڑیاں وجہِ تزئینِ مکتوب بنانا چاہتا ہوں۔ انہیں غور سے دیکھو۔ بظاہر یہ چھوٹے چھوٹے واقعات نظر آئیں گے، لیکن ان چھوٹے چھوٹے واقعات میں تمہیں وہ اصولی نکتہ (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) جھلمل جھلمل کرتا نظر آجائے گا۔

پہلے ذرا رسول اللہ کے مقام کو سامنے لاؤ۔ ان کی سب سے بڑی اور مقدّم حیثیت تو یہ تھی کہ وہ خدا کے رسولؐ تھے جن پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا تھا (نہ ہو سکتا ہے)۔ کسی انسان کے لئے اس سے بڑھ کر عزّت اور عظمت کا مقام اور کون سا ہو سکتا ہے؟ نیز آپ ایک عظیم الشان مملکت کے صدرِ اعظم تھے۔ اس منصبِ امارت میں آپ کی حیثیت یہ تھی کہ آپؐ کے

فیصلے مرکزِ ملّت کے آخری فیصلے تھے، جن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہوسکتی تھی۔ یعنی آپؐ مملکت میں FINAL AUTHORITY کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ آپؐ کی ایک حیثیت بشریت کی بھی تھی۔ یہ سہ گونہ حیثیتیں اس ایک ذات میں مرکوز تھیں جس نے نوعِ انسانی کو سکھانا تھا کہ حقیقی آزادی کسے کہتے ہیں۔ یعنی یہ سکھانا تھا کہ اطاعت صرف قانون کی ہوسکتی ہے۔ قانون نافذ کرنے والا اپنی ذات کی اطاعت کسی سے نہیں کرا سکتا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ افرادِ ملّت کے دلوں پر اس حقیقت کو ثبت کر دیا جائے کہ قانون نافذ کرنے والا' اپنی ذاتی حیثیت میں' ان ہی جیسا انسان ہوتا ہے ـــــ اسے ان پر کوئی فوقیت اور افضلیت حاصل نہیں ہوتی۔ غور کرو کہ حضورؐ نے اس مشکل ترین منصب کو کس طرح نبھایا۔ اور اتنی بڑی بلندیوں پر ہونے کے باوجود' کس طرح قدم قدم پر اس کا خیال رکھا کہ کسی کو اس کا احساس تک نہ ہونے پائے کہ آپ ان میں سے نہیں ہیں۔

دیکھو سلیم! یہ ایک سلطنت کا فرمانروا ہے اور دیوار کے سائے تلے بیٹھا اپنا جوتا گانٹھ رہا ہے۔ ایک رفیق نے کہا کہ لائیے! جوتا میں گانٹھ دوں۔ تو ایک تبسمِ جنّت فروش سے فرمایا کہ نہیں! ہر شخص کو اپنا کام آپ کرنا چاہیئے۔

یہ دیکھو! مدینے کے گرد ایک حفاظتی خندق کھُد رہی ہے اور عام مسلمانوں کے ساتھ ان کا امیرِ مملکت بھی مزدوروں کی طرح کام کر رہا ہے' مسجد کی تعمیر ہو رہی ہے اور حضورؐ بھی مٹی اور گارا اٹھا کر لا رہے ہیں۔ جنگل میں کھانا پکانے کا وقت آ گیا ہے۔ کسی نے کوئی کام سنبھال لیا ہے اور کسی نے کوئی۔ وہ دیکھو! ایندھن کے لئے سوکھی لکڑیاں کون چن رہا ہے؟ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم!! جو لوگ کسی اپنی ضرورت یا امورِ مملکت کے ضمن میں مدینے سے باہر ہیں اور ان کے گھروں میں کوئی مرد نہیں' تو ان کے گھروں میں کام کاج خود حضورؐ جا کر کرتے ہیں۔ بکریوں کو چارہ ڈال رہے ہیں۔ اونٹنیوں کا دودھ دوھ رہے ہیں۔ ان کے لئے باہر سے پانی لا رہے ہیں۔

دوسرے قبائل کے نمائندے اور سلطنتوں کے وفود آتے ہیں۔ انہیں پہچاننے میں دقّت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا امیر المومنین' سلطنت کا فرماں روا' کون ہے۔ اس دقّت کے پیشِ نظر احباب نے مٹی کا ایک چبوترا بنا دیا' تاکہ آپ اس پر بیٹھا کریں۔ آپؐ نے دیکھا تو غصّے سے چہرہ تمتما اٹھا۔ اپنے پاؤں سے اس نشست کو گرا دیا اور کہا کہ تم بھی لگے ہو وہی امتیازات پیدا کرنے

جنہیں مٹانے کے لئے میں آیا ہوں. تم نے آج مٹی کا چبوترہ بنایا ہے' آنے والے اس کو تختِ سلطنت میں تبدیل کر دیں گے.

لوگ آپؐ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے تو انہیں ڈانٹ کر کہا کہ تم بھی لگے وہی کچھ کرنے جو قیصر و کسریٰ کے ہاں ہوتا ہے؟ کسی نے ایک مرتبہ خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا یا سیدنا! تو فرمایا کہ سیّد (آقا) صرف خدا کی ذات ہے. میں اس کا ایک بندہ ہوں.

کچھ لوگوں نے آپؐ کے وضو کا مستعمل پانی' فرطِ عقیدت سے اپنے چہرے پر ملنا چاہا تو آپؐ نے سختی سے روک دیا اور فرمایا کہ تم یہ کیا کرنے لگے؟ انہوں نے کہا کہ یہ اظہارِ محبت کا طریق ہے. آپؐ نے فرمایا کہ مجھ سے محبت ہے تو سچ بولا کرو. امانتوں کی حفاظت کیا کرو اور اپنے عہد و پیمان کا خیال رکھا کرو. یہ ہے سچی محبت اور حقیقی تعظیم!

کسی کے ہاں دعوت میں جا رہے تھے. چار آدمیوں کی دعوت تھی. راستے میں ایک اور آدمی یوں ہی ساتھ ہو لیا. آپؐ نے میزبان کے ہاں پہنچ کر اس سے کہا کہ یہ صاحب اس طرح میرے ساتھ آ گئے ہیں. اگر تم اجازت دو تو اسے کھانے پر ساتھ بٹھا لیا جائے' ورنہ رخصت کر دیا جائے.

سلیم! بظاہر یہ باتیں بڑی چھوٹی چھوٹی ہیں (اور میں نے دانستہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا انتخاب کیا ہے) لیکن ان کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہو تو آج کسی افسر' کسی مولوی صاحب' یا کسی پیر صاحب کی روزمرّہ کی زندگی میں ان ہی جیسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دیکھو. دونوں کا فرق نمایاں طور پر سامنے آ جائے گا. حقیقت یہ ہے کہ انسانی سیرت و کردار کا صحیح مطالعہ ہوتا ہی روزمرّہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہے. اب ذرا آگے بڑھو.

مقدمات سنتے تو فریقین سے کہہ دیتے کہ میں ایک انسان ہوں. میرا فیصلہ لامحالہ تمہارے بیانات ہی پر مبنی ہو گا. اس لئے اگر کسی نے غلط بیانی سے مجھ سے اپنے حق میں فیصلہ لے لیا تو اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ حقیقتِ حال کو خدا سے نہیں چھپا سکے گا. دیکھا سلیم! تم نے کہ حاکم ہونے کے ساتھ ہی کس طرح عوام کے دل سے اس اثر کو زائل کر دیا کہ حاکم' عام انسانوں سے کچھ الگ ہوتا ہے.

اسی قبیل سے ایک اور واقعہ ہے. عربوں میں یہ رواج چلا آ رہا تھا کہ وہ ایک خاص موسم میں نر کھجوروں کا گابھا مادہ کھجوروں میں لگاتے تھے جس سے پھل بہت اچھا آتا تھا. ایک مرتبہ آپؐ نے

ان سے کہا کہ گابھا یوں نہیں، یوں لگاؤ۔ انہوں نے اس کی تعمیل کی۔ لیکن ہوا یہ کہ اس سال کھجوروں میں پھل ہی نہ آیا۔ لوگ متعجب تھے کہ یہ کیا ہوا۔ آپ نے ان سے کسی توقف یا جھجک کے بغیر کہہ دیا کہ میرا اندازہ یہ تھا کہ ایسا کرنے سے پھل زیادہ آئے گا۔ لیکن نتیجہ نے بتا دیا کہ میرا اندازہ غلط تھا کہ ایسا کرنے سے پھل زیادہ آئے گا۔ ــــــــــــ اس لئے آئندہ تم سابقہ قاعدے کے مطابق ہی عمل کیا کرو۔

یہاں تک تو خیر قیاسات و آراء ہی کا سوال تھا۔ ایک صاحبِ اختیار کے لئے وہ مقام بڑا نازک ہوتا ہے جہاں اس کے ذاتی جذبات و مفادات درمیان میں آجائیں۔ ایسے مقامات میں اپنی ذات کو الگ رکھنا صحیح حریّت کا ثبوت دینا ہے۔ وہ دیکھو سلیم! جنگِ بدر کے قیدی رسیوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان میں حضورؐ کے چچا، عباس بھی ہیں۔ وہ سن رسیدہ ہیں اس لئے تکلیف سے کراہ رہے ہیں۔ ان کے کراہنے کی آواز سے آپ کے دل پر اثر ہوتا ہے۔ چہرے کی افسردگی، دل کی کیفیت کی غمّاز ہو جاتی ہے۔ رفقاء کی دقّتِ نظر اس اندرونی کشمکش کو بھانپ لیتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد چچا کے کراہنے کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا۔ عرض کیا کہ (حضرت) عباس کی رسّیاں ڈھیلی کر دی گئی ہیں۔ یہ سُن کر غصّے سے چہرہ تمتما اٹھا اور فرمایا کہ تم نے ان کی رسّیاں اس لئے ڈھیلی کر دیں کہ وہ میرے چچا ہیں؟ تم نے قانون کے مقابلے میں رشتہ داری کی رعایت ملحوظ رکھ لی؟ تم نے بہت بُرا کیا۔ یا تو تمام قیدیوں کی رسّیاں ڈھیلی کرو اور یا پھر عباس کی رسّیاں بھی اسی طرح کس کر باندھو!

اور آگے بڑھو سلیم! ان ہی قیدیوں میں آپ کے داماد (ابوالعاص) بھی تھے۔ مشورہ کیا گیا کہ ان قیدیوں کے ساتھ کیا کیا جائے (ابھی تک جنگی قیدیوں کے متعلق قرآن کا حکم نازل نہیں ہوا تھا جس میں کہا گیا ہے کہ جنگی قیدیوں کو یا تو زرِ فدیہ لے کر (یا تبادلہ میں) رہا کر دو، یا پھر احسان رکھ کر چھوڑ دو)۔ فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں قتل کر دیا جائے اور ہر قیدی کا رشتہ دار اسے خود اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔
سوچو سلیم! کہ یہ گھڑی کس قدر نازک تھی؟ بیٹی کا سہاگ لُٹ رہا ہے اور اسے خود اپنے ہاتھوں سے بیوہ بنایا جا رہا ہے۔ لیکن چونکہ قانون کا فیصلہ تھا اس لئے اس میں نہ کوئی تامّل ہوتا ہے نہ تردّد۔ نہ بیٹی کی محبّت عناں گیر ہوتی ہے، نہ اس کے مستقبل کے مصائب دامن کش۔ (یہ الگ بات ہے

کہ اسی مجلس مشاورت نے اپنے سابقہ فیصلہ پر نظرِ ثانی کر کے ان قیدیوں کو زرِ فدیہ لے کر رہا کر دینے کا فیصلہ کر دیا)۔

یہاں سلیم! ایک اور واقعہ سامنے آتا ہے جسے لکھتے وقت دل لرز جاتا ہے اور ہاتھ کانپ اٹھتے ہیں۔ ان قیدیوں کا زرِ فدیہ مانگا گیا۔ محمدؐ کی بیٹی (حضرت زینبؓ) نے اپنے خاوند کا زرِ فدیہ بھیجا۔ وہ زرِ فدیہ کیا تھا؟ کانچ کا ایک پرانا ہار۔ تمہیں معلوم ہے سلیم! یہ ہار کون سا تھا؟ برسوں پہلے جب رسول اللہ کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی ہے تو آپ نے وہ سادہ سا ہار بیوی کو شادی کے تحفے میں دیا تھا۔ اس کے بعد جب (حضرت) زینبؓ کی شادی ہوئی تو ماں نے بیٹی کو الوداع کرتے وقت وہی ہار اس کے گلے میں ڈال دیا اور آج وہی ہار بیٹی نے اپنے خاوند کی رہائی کے لئے بطور زرِ فدیہ بھیج دیا اور اس طرح تمام گذشتہ واقعات کی یاد محبوب باپ کے دل میں تازہ کر دی۔

ہار سامنے متاعِ فدیہ کے ڈھیر میں پڑا ہے اور رسول اللہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ اور گذری ہوئی داستانیں ایک ایک کر کے سینما کی فلم کی طرح نگاہوں کے سامنے چلی آ رہی ہیں۔ (حضرت) خدیجہؓ جیسی بیوی جس نے اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ ایسی مومنہ صادقہ ایسی جاں نثار بیوی۔ ایسی پیکرِ محبت و خلوص رفیقۂ حیات۔ پچیس سالہ عمر کی رفاقت کی زندگی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آتے گئے۔ دل میں جذبات کا طوفان امنڈا، اس کا ایک قطرہ ستارۂ صبحگاہی کی طرح سرِ مژگاں چمکا اور مقدس رخساروں پر زم زم بار و کوثر فروش ہو گیا۔ اس کانچ کے ہار کی قیمت ہی کیا تھی لیکن اس میں گذری ہوئی زندگی کی حسین و تابناک یادوں کی ایک کائنات سمٹی ہوئی تھی۔

وہ چار سو کھے ہوئے تنکے یوں تو کیا تھے مگر
قفس میں آ ہی گئی یاد آشیانے کی

دل میں جذبات کے تلاطم سے ایک حشر بپا تھا لیکن لب بند تھے۔ بحیثیت امیر المومنین آپ کو یہ حق حاصل تھا کہ اس زرِ فدیہ کی تقسیم جس طرح چاہتے کر دیتے۔ لیکن اس ہار کے ساتھ چونکہ اپنے ذاتی جذبات وابستہ تھے اس لئے آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی مرضی سے اسے خود لے لیں یا بیٹی کو واپس کر دیں۔ ہار اب ملت کی متاع تھا اور آپ اس کے امین تھے۔

کچھ سمجھتے ہو سلیم! ...... یہ کیا مقامات ہیں؟ اور سنو! فتح مکہ کے بعد مخالفین قریش ایک ایک کر کے سامنے پا بجولاں کھڑے ہیں. یہ وہ ہیں جنہوں نے آپ کی (نبوت کی) مکی زندگی کے تیرہ برس میں آپ کو اس قدر تکالیف بہم پہنچائیں جن کے تصور سے روح لرزتی ہے. پھر جب مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور پیہم لڑائیوں کا سلسلہ جاری رکھا. آج یہ سب مفتوح و مغلوب قیدیوں کی حیثیت سے سامنے کھڑے ہیں. رواج، قاعدے اور قانون کے مطابق ان کی سزا موت تھی. لیکن یہ اسلام لے آئے تو ساری تقصیریں معاف ہوگئیں. ان کا کوئی جرم باقی نہ رہا. حتیٰ کہ ان میں وحشی بھی تھا جس نے آپ کے عزیز چچا (حضرت حمزہؓ) کو نہایت درندگی سے شہید کر دیا تھا اور ابن اسود بھی جس نے آپؐ کی بیٹی (حضرت زینبؓ) کو نیزہ سے ایسی زخمی کیا تھا کہ آپ بمشکل جانبر ہو سکی تھیں لیکن جب آپؐ نے سب سے کہہ دیا کہ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْم (تمہارے سب جرم معاف ہیں) تو پھر اپنا ذاتی انتقام بھی باقی نہ رکھا اور اسے بھی معاف کر دیا.

تمہیں شاید معلوم ہے سلیم! کہ جب حضورؐ مکہ میں تھے تو قریش نے آپؐ کا اور آپؐ کے ساتھ آپؐ کے اہلِ خاندان کا اس طرح بائیکاٹ کر دیا تھا کہ آپ پر کھانے پینے کی چیزوں کے راستے بھی بند ہو گئے تھے. تین سال تک آپؐ اور آپؐ کے اہلِ خاندان اس جانکاہ مصیبت میں مبتلا رہے. جب آپؐ مدینہ تشریف لے گئے ہیں تو یمامہ کا رئیس مسلمان ہو گیا. اہلِ مکہ کا غلہ یمامہ سے آیا کرتا تھا. اس نے قریش کی اس حرکت کے جواب میں غلہ روک دیا. اور قریش لگے بھوکوں مرنے. آپؐ نے سنا تو یمامہ کے رئیس کو فوراً کہلا بھیجا کہ ہم نوعِ انسانی پر ربوبیت (پرورش) کے دروازے کھولنے کے لئے آئے ہیں. ان کا رزق بند کرنے کے لئے نہیں آئے. اس لئے غلہ کو مت روکو. قریش میں کوئی بھوکا نہ رہنے پائے.

غور کیا تم نے سلیم! کہ کس طرح ذاتی جذباتِ انتقام کو اصول و آئین سے یکسر الگ رکھا جاتا ہے اور کسی اصولی فیصلہ کو ان سے متاثر نہیں ہونے دیا جاتا ہے؟ یہی وہ حریت آموز تعلیم و تربیت تھی جس سے دست پروردگانِ نبوت میں صحیح آزادی کی رُوح پیدا ہو گئی تھی. اور ان کی کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ جس معاملے میں انہیں ذرا بھی اختلافِ رائے ہوتا تو وہ اپنی رائے کو بلا تامل و توقف پیش کر دیتے. اُدھر ان کہنے والوں کی جرأت کی یہ کیفیت تھی اور اُدھر اس سننے والے کی کشادہ نگہی اور وسعتِ

ظرف کا یہ عالم کہ کیا مجال جو اس اختلاف پر ذرا بھی پیشانی پر بل آنے پائے. جنگِ بدر کے موقع پر آپؐ نے لشکر کے لئے ایک مقام تجویز کیا. ایک رفیق (حضرت خبابؓ) نے پوچھا کہ یہ فیصلہ وحی کی رُو سے ہوا ہے یا آپؐ کی ذاتی رائے ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں! میں نے خود ہی ایسا سمجھا ہے. اس پر انہوں نے کہا کہ میں اس نواح کا رہنے والا ہوں. یہاں کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہوں. یہ مقام ہمارے لئے ٹھیک نہیں. ہمیں فلاں مقام پر جا کر ڈیرے ڈالنے چاہئیں. آپؐ نے فرمایا کہ یہ درست ہے تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو. تمہاری رائے زیادہ صائب ہے. اور اس کے بعد فوج کو کوچ کرنے کا حکم دے دے دیا.

یہ آزادی صرف آپؐ کے رفقائے کار تک ہی محدود نہ تھی. اس فضا میں ہر سانس لینے والے کا یہی عالم تھا. مدینہ میں ایک لونڈی تھی بریرہ نامی. وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر الگ ہو گئی. اس شخص کے کہنے پر آپؐ نے بریرہ سے کہا کہ تم اس کے پاس چلی جاؤ. ذرا فریقین کی پوزیشن کو سامنے رکھو سلیم! کہنے والے ہیں محمّد رسولؐ اللہ اسلامی مملکت کے واحد فرمانروا. مدینہ کے حاکم. امیر المومنین. اور کہا جا رہا ہے ایک لونڈی سے. کیا اس لونڈی کی جرأت ہو سکتی تھی کہ سامنے سے لب کشائی کر سکے؟ لیکن وہاں تو تربیت ہی ایسی کی گئی تھی کہ لونڈیاں تک اپنے مقامِ انسانیت سے واقف ہو چکی تھیں. بریرہ نے کہا کہ آپؐ کا یہ حکم وحی کی رُو سے ہے یا اپنا ذاتی ارشاد ہے. آپؐ نے فرمایا کہ یہ میری اپنی سفارش ہے. اس پر بریرہ نے کہا کہ پھر آپؐ معاف فرمائیے. میں اپنے معاملات کو بہتر سمجھتی ہوں. میں اس کے پاس رہنے کے لئے تیار نہیں. اور آپؐ تبسّم فشاں تشریف لے گئے.

اسی قبیل کا ہے سلیم! وہ نازک ترین واقعہ جسے قرآن نے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا. غور سے سنو کہ وہ کون سا واقعہ ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اسے ابدیت درکنار کر دیا گیا ہے.

حضرت خدیجہؓ کے پاس ایک لڑکا (غلام) تھا زید. انہوں نے وہ غلام حضورؐ کو دے دیا. آپؐ نے اسے غلامی سے آزاد کر دیا. اس کے بعد اسے وہ بلند مقام عطا فرمایا کہ وہ آپؐ کا مُنہ بولا بیٹا مشہور ہو گیا. غلامی کی پستیوں سے اٹھا کر یہ مقام بلند! سبحان اللہ!!

تیرے سنگِ دَر نے بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز میں
کہ ہزاروں عرش جھلک رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

لیکن (حضرت) زیدؓ کی رفعتِ مدارج یہیں تک پہنچ کر نہیں رُک گئی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھی۔ حضورؐ نے ان کی شادی بنو ہاشم کے گھرانے کی ممتاز ترین خاتونِ محترم، خود اپنی پھوپھی زاد بہن سے کردی۔

ایک غلام اور اس کی شادی قریش کے بلند ترین گھرانے کی لڑکی سے! سارے عرب میں اس کی مثال نہیں تھی۔ ان کی تاریخ اس سے ناآشنا تھی۔ سب نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ ہر جگہ اس کا چرچا ہوا۔ جگہ جگہ اس کی باتیں ہونے لگیں۔ لیکن آپؐ احترامِ آدمیت اور مساواتِ انسانی کے جس انقلابِ عظیم کو لے کر آئے تھے اس کے پیشِ نظر آپؐ کو عملی مثال قائم کرنی تھی۔ آپؐ نے یہ بتانا تھا کہ انسان کی پیدائش محض ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ اس کی بنا پر نہ کسی کو کوئی ADVANTAGEO-US PDSITION حاصل ہونی چاہیئے اور نہ اسے کسی قسم کا DISADVANTAGE ہونا چاہیئے۔

ان حالات میں یہ شادی ہوئی۔ لیکن سوءِ اتفاق دیکھئے کہ میاں بیوی میں ناموافقت ہوگئی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ حضرت زیدؓ نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔

بنو ہاشم کے گھرانے کی ممتاز ترین خاتون!

خود رسول اللہ کی پھوپھی زاد بہن!!

اس معاشرہ میں مروّج خیالات کے مطابق اس کے لئے یہی چیز کچھ کم "باعثِ ہتک" نہ تھی کہ اس کی شادی ایک غلام سے کردی گئی، کہ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ غلام اُسے طلاق دے رہا ہے!

تم سوچو سلیم! کہ اس سے رسول اللہ کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ یہ شادی سارے عرب کے رسم و رواج کے خلاف کی گئی تھی۔ خویش و اقارب کی مخالفت کے علی الرغم کی گئی تھی۔ مخالفت کرنے والے شروع ہی سے کہتے ہوں گے کہ یہ ایک انوکھی بات ہو رہی ہے۔ ایسا انمل جوڑ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا! تم ـــ دیکھ لینا کہ یہ رشتہ نبھ نہیں سکے گا۔

اب یہ تمام مخالفین چشم براہ ہوں گے کہ کس دن یہ ناطہ ٹوٹے اور ہم کہہ سکیں کہ..... کیوں! ہم نہ کہتے تھے؟ ان حالات میں رسول اللہ زیدؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا۔ زید! امسک علیک زوجک

اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔
یہ کہنے والا کون ہے سلیم!
وہ رسولؐ جس پر ایمان لانے سے زیدؓ کو شرفِ اسلام حاصل ہوا۔
وہ امیرؐ جس کی مملکت میں زیدؓ ایک رعیت کی حیثیت سے رہتے ہیں۔
وہ محسنِ اعظمؐ جس نے زیدؓ کو غلامی سے آزاد کیا۔
وہ جو زیدؓ کے لئے بمنزلہ باپ کے ہیں۔
وہ جنہوں نے زیدؓ کی شادی اتنے اونچے گھرانے میں کی اور اس طرح اسے سوسائٹی میں ایسا بلند مقام عطا کر دیا۔

یہ ہیں کہنے والے! اور کہا یہ ہے کہ زید! میری بہن کو طلاق مت دو۔ زیدؓ نے اس کے جواب میں کیا کہا؟ تم سوچتے ہو گے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں باقی تھی۔ لیکن اس کی گنجائش آج باقی نہیں۔ اس وقت باقی تھی۔ زیدؓ نے پوچھا کہ یہ خدا کا حکم ہے یا حضورؐ کی ذاتی سفارش ہے؟ اور جب معلوم ہوا کہ یہ آپؐ کی ذاتی سفارش ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر میاں بیوی کے معاملات کو میاں بیوی ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں، اپنے فیصلے کو بحال رکھا اور بیوی کو طلاق دے دی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کے لئے ذرا تصور میں لاؤ اپنے معاشرہ کو اور سوچو کہ ایسا حادثہ کہیں آج پیش آجائے تو اس کا انجام کیا ہو؟ آج اگر اس قسم کا واقعہ کسی ایسے شخص کے ساتھ پیش آجائے جس نے اس طلاق دینے والے پر کبھی کوئی احسان کیا ہو تو تم دیکھو گے کہ وہ کس طرح وہیں کھڑے کھڑے ہزار گالیاں سنا دیتا ہے اور پھر ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹتا ہے کہ "نمک حرام" احسان فراموش کمینہ، ذلیل! ہم نے اس پر اتنے احسانات کئے اور آج ہمیں ان کا بدلہ یہ مل رہا ہے۔ سچ کہہ گیا ہے سعدیؒ کہ

نکوئی با بداں کردن چناں است
کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

بچھو کی فطرت میں ڈھنگ مارنا ہوتا ہے۔ اس سے اور توقع ہی کیا کی جاسکتی تھی۔"
اور اگر کسی باپ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آجائے تو اسی وقت بیٹے کو گھر سے نکال دے اور

اسے جائیداد سے عاق کر دے اور کہہ دے کہ ساری عمر میرے سامنے نہ آنا اور مرنے کے بعد میرے جنازے کے ساتھ بھی نہ جانا۔ تم تو نوح (علیہ السلام) کے بیٹے ہو جس نے خاندانِ نبوّت کو داغ لگا دیا تھا۔

اور اگر کسی مذہبی پیشوا (مولوی صاحب یا پیر صاحب) کے ساتھ یہ کچھ ہو تو پھر اس غیظ و غضب کا اندازہ لگاؤ جس کا مظاہرہ ان کے مُنہ کی جھاگ اور گالیوں کی بوچھاڑ سے ہو رہا ہو گا۔ طلاق دینے والے پر "خدا کی رحمت اور رسولؐ کی شفاعت" سب حرام ہو جائے گی اور اسے سیدھا "جہنم رسید" کر دیا جائے گا۔

اور کہیں (خدا نکردہ) ایسا معاملہ کسی حاکم یا افسر کے ساتھ ہو جائے تو وہ آخرت کا بھی انتظار نہ کرے گا۔ اس ماتحت کو یہیں سیدھا جہنم پہنچا دے گا۔

لیکن اس محسنؐ، اُس باپؐ، اُس مذہبی رہنماؐ، اس حاکمؐ اور افسرؐ نے کیا کہا؟ کہا یہ کہ جب قانونِ خداوندی نے تمہیں اس کا اختیار دیا ہے تو اس میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔ اگر تمہارا فیصلہ یہی ہے تو اس میں کوئی بات وجہِ ناراضگی نہیں۔ بہت اچھا!

اور اس کے بعد (حضرت) زیدؓ عمر بھر اسی خوشگواریٔ تعلقات کے ساتھ حضورؐ کے پاس رہے۔ نہ باہمی روابط میں کوئی فرق آیا اور نہ ہی دلوں میں کوئی بُعد پیدا ہوا۔ (حضرت) اُسامہؓ اُن ہی (حضرت) زیدؓ کے بیٹے تھے جنہیں نبی اکرمؐ نے اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا جسے آپؐ نے آخری مرتبہ ترتیب دیا تھا اور جس میں بڑے سے بڑے جلیل القدر صحابہؓ بطور سپاہی کام کر رہے تھے۔

دیکھا سلیم! تم نے قانون کی اطاعت اور قانون نافذ کرنے والے کی ذاتی حیثیت میں کس طرح فرق کیا جا رہا ہے؟ یہ تھی صحیح حریت جس سے انسانیت لذّت یاب ہوئی تھی۔ کہو! تمہیں اس کی مثال کہیں اور بھی ملتی ہے؟ نظر دوڑا کر دیکھو تو سہی! نگاہ کس طرح کاشانۂ چمن میں خاسر و نامراد واپس آ جاتی ہے۔ ینقلب الیك البصر خاسئًا و هو حسیرٌ۔

اب اسی بساط کا ایک اور گوشہ سامنے لاؤ۔ نظامِ ربوبیت کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ سامانِ زیست (مال و دولت) میں اربابِ حل و عقد اور دیگر افرادِ مملکت میں کوئی فرق نہ ہو۔ اگر فرق ہو تو یہ کہ اس میں اربابِ حل و عقد کا حصّہ سب سے کم ہو۔ یہ باتیں تو تم نے سلیم! اکثر سنی

ہوں گی کہ نبیٔ اکرمؐ بڑی غریبی کی زندگی بسر فرمایا کرتے تھے۔ گھر میں کوئی ساز و سامان نہ تھا۔ کئی کئی دن چولہا گرم نہیں ہوا کرتا تھا۔ کپڑوں میں پیوند لگے ہوتے تھے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تمہارے محلے کی مسجد کے مولوی صاحب (میں ان کا نام بھولتا ہوں اس وقت، بھلا سا نام تھا، خیر!) ان تمام باتوں کو کس رقّت کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ وعظ میں خود بھی رویا کرتے تھے اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی رُلایا کرتے تھے۔ لیکن اصل چیز جس سے یہ اتنی بڑی حقیقت نہ صرف پیوندِ خاک ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ اسلام کے متعلق ایک نہایت خطرناک اور گمراہ کن تصوّر پیدا کر دیتی ہے وہ ہے جہاں ان کے وعظ کے مقطع کا بند آیا کرتا تھا۔ یعنی یہ کہ آپ کے سامنے دنیا اور آخرت دونوں کو پیش کیا گیا اور کہا گیا کہ ان میں سے ایک کو پسند کر لیجئے تو آپؐ نے آخرت کو پسند کر لیا اور دنیا کو چھوڑ دیا۔ تم نے دیکھا سلیمؔ! کہ یہ تصوّر کس قدر اسلام کے تصوّر کے خلاف ہے؟ یہ تصوّر، خالص عیسائیت کا خانقاہی تصوّر ہے جس میں زمین کی بادشاہت، قیصر کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے اور "آسمان کی بادشاہت" خدا کے مقرّب بندوں کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے۔ اسلام کا تصوّر، زمین اور آسمان (دنیا اور آخرت) دونوں کی بادشاہتیں حاصل کرنا ہے۔ نہ یہ کہ دنیا کفّار کے لئے چھوڑ دی جائے اور خود غریبی اور مفلسی کی زندگی بسر کر کے آخرت سنواری جائے۔ نبیٔ اکرمؐ کی "غریبی" کی وجہ یہ تھی کہ حضورؐ کی تمام عمر نظامِ ربوبیّت کے قیام میں گزری۔ اس نظام کی اوّلین کڑی یہ ہے کہ تمام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی (رزق) کی ذمّہ داری نظام اپنے سر لے لیتا ہے۔ اس کے لئے اس نظام کا مرکز (امیرِ ملّت) اپنے آپ کو سب سے پیچھے رکھتا ہے۔ یعنی وہ نہیں کھاتا جب تک اس کا اطمینان نہ ہو جائے کہ تمام افرادِ مملکت کا پیٹ بھر گیا ہے۔ وہ نہیں پہنتا جب تک یہ نہ دیکھ لے کہ ہر فرد کو کپڑا نصیب ہو گیا ہے جس کے سر پر اتنی بڑی ذمّہ داریاں ہوں وہ کس طرح مُرغ پلاؤ کھا سکتا ہے اور کیسے کمخواب و ابریشم پہن سکتا ہے؟ یہ تھی وجہ جس کی بناء پر رسولؐ اللہ اس عسرت کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ نہ یہ کہ آپؐ کو دُنیا سے نفرت تھی۔

نبیٔ اکرمؐ کے بعد، جب اس نظام کی ذمّہ داریاں حضرت ابوبکرؓ کے کندھوں پر آئی ہیں تو یہی کیفیت آپ کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ایک دن دیکھا کہ آپ کپڑے کی گٹھڑی سر پر اٹھائے بازار میں چلے جا رہے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ کپڑا بیچنے جا رہا ہوں تاکہ اپنی اور بیوی بچّوں کی روٹی کی

فکر کر لوں۔ انہوں نے کہا کہ اب آپ کا سارا وقت ملّت کی ملکیت ہے۔ اسے آپ اپنی ضروریات کے لئے صرف نہیں کر سکتے۔ آپ پورا وقت اُدھر دیجئے اور بیت المال میں سے اپنے گذارہ کے لئے لے لیجئے۔ بڑے تامّل اور توقف کے بعد آپ راضی ہوئے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ خلیفہ کو اپنے گزارے کے لئے کس قدر لینا چاہیئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے سوچ سوچ کر کہا کہ مدینے میں ایک مزدور کم از کم کیا کماتا ہے؟ جب معلوم ہوا تو فرمایا کہ بس! یہ ہے خلیفہ کا روزینہ۔ افرادِ مملکت میں سب سے کم آمدنی۔ اور جب پوچھا گیا کہ اس میں گزارہ کیسے ہوگا؟ تو فرمایا کہ اب خلیفہ خود کوشش کرے گا کہ مزدور کی اُجرت زیادہ ہو جائے یعنی اس کا معیارِ زندگی STANDARD OF LIVING بلند ہو جائے۔

تم نے حضرت ابو بکرؓ کا وہ واقعہ تو سُنا ہی ہوگا سلیم! کہ آپ نے ایک دن بیوی سے کہا کہ کوئی میٹھی چیز ہو تو کھانے کے ساتھ دے دو۔ جواب نفی میں ملا۔ چند دنوں کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ کھانے کے ساتھ آٹے کا حلوہ بھی ہے۔ پوچھا کہ اس دن تو تم نے نہ کر دی تھی۔ اب یہ میٹھا کہاں سے آگیا۔ جواب ملا کہ بیت المال سے راشن میں جس قدر آٹا آتا ہے' میں اس میں سے ایک مٹھی بھر آٹا ہر روز نکال لیا کرتی تھی۔ جب تھوڑا سا آٹا جمع ہو گیا تو میں نے اس کا میٹھا خرید لیا اور حلوہ پکا لیا۔ آپ اُٹھے اور جا کر راشن تقسیم کرنے والے سے کہا کہ ہمارے گھر میں جس قدر آٹا روز جاتا ہے اس میں سے ایک مٹھی کی کمی کر دو کیونکہ تجربہ نے بتایا ہے کہ ایک مٹھی کم آٹے میں بھی ہمارے گھر والوں کا گزارہ ہو جاتا ہے۔

یہ کچھ تھا جسے خلیفۃ المسلمین (یعنی نظامِ ربوبیت کے قیام کا ذمّہ دار) بیت المال میں سے اپنا حق سمجھا کرتا تھا۔ اور اس کے باوجود جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو بیٹے سے کہا کہ اب میں خدا کے سامنے جا رہا ہوں۔ معلوم نہیں کہ میں نے بیت المال سے جس قدر لیا ہے اس کے مطابق بندگانِ خدا کی خدمت بھی کر سکا ہوں یا نہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ یہ بوجھ اپنے سر پر نہ ہی لے کر جاؤں تو اچھا ہے۔ تم مکان کو بیچ دو اور جو کچھ میں نے بیت المال سے لیا ہے اسے بیت المال میں داخل کر دو۔

اک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب　　خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ سلسلہ اور بھی وسیع ہو گیا تھا۔ سلطنت کا رقبہ بائیس لاکھ مربع میل تھا۔ ایک عراق کی مال گذاری گیارہ کروڑ درہم سالانہ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی افرادِ مملکت کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی اور اسی نسبت سے ربوبیت کی ذمہ داریاں بھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اور بھی زیادہ محتاط ہو گئے تھے۔ ایک جوڑا کپڑے سردی کے لئے۔ ایک جوڑا گرمی کے لئے اور مزدور کی اُجرت کے مطابق روزینہ۔ ایک دن آپ گھر میں تھے۔ لوگ باہر انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد باہر آئے تو لوگوں نے شکایت کی کہ ہمیں انتظار کرنا پڑا۔ فرمایا کہ اس کا ذمہ دار یہ کُرتہ ہے۔ اسے دھو کر سکھانے کے لئے ڈال رکھا تھا۔ یہ سوکھتا نہیں تھا اور دوسرا کُرتہ تھا نہیں جسے پہن کر میں باہر آجاتا۔

بیمار ہو گئے تو دوائی کے لئے شہد کی ضرورت پڑی۔ شہد بیت المال میں موجود تھا لیکن اسے از خود کس طرح استعمال کر لیتے؟ مجلسِ مشاورت طلب کی اور ان کی اجازت سے شہد لیا۔

ایک دن (غالباً) مصر کا گورنر آیا۔ دیکھا تو آپ جَو کی روٹی کھا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ فرمایا کہ کیا ہمارے ہاں اتنا گیہوں آجاتا ہے کہ ہر فردِ مملکت کو گیہوں کی روٹی مل جائے؟ اس نے کہا کہ اتنا تو نہیں لیکن پھر بھی کافی گیہوں ہوتا ہے۔ آپ نے کہا کہ امیر المومنین اس وقت گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہے جب مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل جائے۔

ایک مرتبہ قحط پڑ گیا تو ارد گرد کی ساری آبادی سمٹ کر مدینے میں جمع ہو گئی۔ اس کا علاج کیا سوچا گیا؟ حکم دے دیا کہ مدینہ میں کوئی فرد اپنے گھر میں کھانا نہیں کھائے گا۔ نہ ہی کسی کے ہاں انفرادی طور پہ کچھ پکے گا۔ جو کچھ کسی کے پاس ہے سب ایک جگہ جمع ہو گا اور سب کو ان پناہ گزینوں کے ساتھ مل کر ایک دسترخوان پہ کھانا ہو گا۔ اس حکم کی تعمیل میں امیر المومنین کا گھرانہ پیش پیش تھا۔ مسلسل فاقوں اور موٹی جھوٹی روٹی کھانے سے آپ بیمار ہو گئے۔ گھی کی جگہ زیتون کے تیل کے استعمال سے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ گئی۔ رفقاء نے کئی مرتبہ کہا کہ آپ نسبتاً اچھی غذا کھایئے۔ ملّت کو آپ کی صحت کی بڑی ضرورت ہے۔ آپ یہ سنتے تو انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیتے کہ

خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست

اس باب میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دن دیکھا کہ آپ کا پوتا خربوزہ کھا رہا ہے۔ اپنے بیٹے (حضرت عبداللہؓ) کو بلایا اور کہا کہ مسلمانوں کے بچے روٹی کے ٹکڑے کو ترس رہے ہیں

اور عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے۔ اس کا کوئی جواب تمہارے پاس ہے؟ انہوں نے کہا کہ بچے کو صبح (عام بچوں کے ساتھ) جو کھجور کی گٹھلیاں ملی تھیں اس نے ان کے عوض ایک بدو لڑکے سے خربوزہ لے لیا تھا۔ یہ ہے حقیقت اس "میوہ خوری" کی، ورنہ عمرؓ کے گھر والوں کو بھی وہی کچھ مل رہا ہے جو قحط زدہ مسلمانوں کو ملتا ہے۔ یہ تھا احتیاط کا عالم اور اس کے باوجود احساسِ ذمہ داری کی یہ کیفیت کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے مطابق۔

> قحط کے زمانے میں حضرت عمرؓ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے مکان میں داخل ہوتے اور آخر شب تک نماز پڑھتے۔ پھر نکلتے اور پہاڑی راستوں پر گھومتے (تاکہ تمام لوگوں کی خبر گیری کر سکیں)۔ ایک رات میں نے انہیں یہ دعا کرتے سنا کہ اے اللہ! امتِ محمدیہ کی ہلاکت میرے ہاتھوں پر نہ کر۔

وہ لوگوں کے غم میں اس قدر نڈھال تھے کہ اسامہؓ بن زیدؓ کے بیان کے مطابق صحابہؓ کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اگر قحط رفع نہ ہوا تو عمرؓ مسلمانوں کی فکر میں مر جائیں گے۔

جیسا کہ تمہیں معلوم ہے سلیم! نظامِ ربوبیت میں تمام افرادِ مملکت کے رزق کی ذمہ داری نظام کے سر ہوتی ہے۔ اس لئے انتظام یہ تھا کہ ہر شخص کا وظیفہ مقرر ہوتا تھا جو اس کی ضروریات کی کفالت کرتا تھا۔ بچوں کا وظیفہ اس وقت شروع ہوتا تھا جب وہ دودھ پینا چھوڑ دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا قاعدہ تھا کہ رات کے وقت، جب سارا عالم سوتا تھا، وہ چپکے ہی چپکے گشت لگاتے تاکہ افرادِ مملکت کے حالات معلوم کر سکیں۔ ایک رات انہوں نے دیکھا کہ ایک خیمے سے بچے کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اس کی ماں اسے سلانے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ سوتا نہیں، روئے چلا جاتا ہے۔ جب بچے کو روتے روتے کافی وقت ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے آواز دے کر پوچھا کہ بچے کو کیا ہوا ہے، سوتا کیوں نہیں؟ عورت کو یہ معلوم نہ تھا کہ پوچھنے والا کون ہے؟ وہ غصے میں بھری بیٹھی تھی۔ جھنجھلا کر یوں بولی، جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ "ہوا ہے عمرؓ کا سر"۔ آپؓ نے کہا کہ بچے کے رونے میں عمر کہاں سے آ گیا؟ اس نے کہا کہ اس نے حکم دے رکھا ہے کہ بچوں کا وظیفہ دودھ چھوڑنے پر شروع ہو گا۔ میں بچے کا دودھ چھڑا رہی ہوں اور یہ بھوک سے روتا ہے۔ اس لئے سوتا نہیں۔

صبح کی نماز میں نمازیوں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ رو رہے ہیں اور روتے روتے ان کی گھگھی بندھ

گئی ہے۔ روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا اللہ! عمرؓ کو معاف کر دینا۔ معلوم اس کے اس غلط حکم نے کتنے بچوں کو بھوک سے تڑپا تڑپا کر مار ڈالا ہوگا۔ اس کے بعد اعلان کر دیا کہ بچوں کا وظیفہ یومِ پیدائش سے شروع ہو جایا کرے۔

احتیاط کا یہ عالم تھا کہ قیصر کی بیوی نے عطر کی چند شیشیاں "شاہِ عرب" (حضرت عمرؓ) کی بیگم صاحبہ کو بطور تحفہ بھیجیں۔ آپ نے وہ شیشیاں بیوی سے لے لیں اور فرمایا کہ یہ بیت المال میں داخل ہوں گی۔ اس لئے کہ قیصر کی بیوی نے یہ تحفہ تمہاری ذاتی حیثیت سے نہیں بھیجا بلکہ امیرالمومنین کی بیوی کی حیثیت سے بھیجا ہے، اس لئے تمہارا ان پر کوئی حق نہیں۔

ایک مرتبہ بیت المال میں کچھ مشک آئی جسے تقسیم کرنا تھا۔ بیوی نے کہا کہ لایئے میں تول کر الگ الگ حصے کر دوں۔ فرمایا کہ ہاں۔ تم اسے تولو گی تو جو مشک ترازو کے پلڑے میں لگی رہ جائے گی تم اسے اپنے کپڑوں پر ملو گی۔ میں اس "خیانت" کو گوارا نہیں کر سکتا۔

بیٹا مصر سے واپس مدینہ آرہا تھا۔ گورنر مصر نے کچھ روپیہ دیا کہ اسے بیت المال میں جمع کرا دینا۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں اس روپے سے راستے میں کچھ سامانِ تجارت خرید لوں اور مدینہ پہنچ کر اصل روپیہ بیت المال میں داخل کر دوں اور منافع خود رکھ لوں، تو اس میں حرج تو نہیں؟ گورنر نے اس کی اجازت دیدی۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے کہا کہ زرِ منافع بھی بیت المال میں داخل کرو۔ مجھے یقین ہے کہ گورنر نے تمہیں اس کی اجازت محض اس لئے دی تھی کہ تم عمرؓ کے بیٹے ہو۔ وہ ہر ایک کو اس کی اجازت کبھی نہ دیتا۔ اس لئے جو رعایت تمہیں عمرؓ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے ملی میں اسے جائز قرار نہیں دے سکتا۔ عمرؓ کے بیٹے اور ایک عام مسلمان میں کوئی　　فرق نہیں ہونا چاہیئے۔

ایک مرتبہ آپ کا بیٹا اپنا اونٹ، مملکت کی چراگاہ میں چراتا رہا۔ جب وہ موٹا تازہ ہو گیا تو نفع سے بیچ دیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے بیٹے کو ڈانٹا اور کہا کہ تمام زرِ منافع بیت المال میں داخل کر دو۔ تم نے ملّت کی چراگاہ میں اپنا اونٹ کس طرح چرالیا؟ بعض رفقاء نے کہا کہ گھاس تو چراگاہ کی تھی لیکن اس نے اونٹ چرانے میں جو محنت کی ہے اس کی کچھ اُجرت تو اسے ملنی چاہیئے۔ حضرت عمرؓ اس پر بھی راضی نہ تھے۔ لیکن مجلسِ مشاورت نے اسے اُجرت دلا دی۔

بیت المال کا اونٹ گم ہو گیا تو صحابہؓ نے دیکھا کہ آپ پریشان ہیں اور اس کی تلاش میں

اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ اطمینان سے بیٹھئے! اونٹ کی تلاش اور لوگ کر لیں گے۔ فرمایا کہ یہ تو اونٹ ہے، اگر بیت المال کے اونٹ کا ایک بال بھی میری غفلت سے ضائع ہو جائے تو اس کا بار براہِ راست میری گردن پر ہے۔ اس لئے گم گشتہ اونٹ کو مجھے خود ہی تلاش کرنا ہو گا۔ میں نے کیوں ایسا انتظام نہیں کیا کہ اونٹ گم نہ ہو۔ اس کا خمیازہ مجھے بھگتنا چاہیئے۔

جب آپ خود اتنی احتیاط برتتے تھے تو ظاہر ہے کہ عمّالِ حکومت کو کس قدر محتاط ہونا پڑتا ہو گا۔ آپ نے حکم دے رکھا تھا کہ صوبوں کے گورنر کبھی ترکی گھوڑوں پر سوار نہ ہوں، کیونکہ اس سے بُرے تمکنت آتی ہے۔ باریک کپڑے نہ پہنیں۔ چھنا ہوا آٹا نہ کھائیں اور اپنے مکانوں پر حاجب و دربان مقرّر نہ کریں تاکہ لوگوں کو براہِ راست ملنے میں دقّت نہ ہو۔ ایک گورنر (حضرت عباسؓ) کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں۔ انہیں مدینے میں واپس بلا لیا۔ ایک کمبل اوڑھنے کو دیا اور بکریاں دے دیں کہ انہیں چھ ماہ تک چراتے پھرو۔ اس سے کہ ا عیٰ[1] (چرواہے) بننے کے آداب آجائیں گے۔

"رعایا" کے حقوق کا یہاں تک خیال رہتا تھا کہ ایک نومسلم، ٹیکس کا روپیہ بیت المال میں داخل کرنے کیلئے لایا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تمہارے لئے حکومت نے کچھ کیا بھی ہے یا نہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میں ابھی ابھی مسلمان ہوا ہوں اس لئے ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی کہ میں حکومت سے کچھ لوں۔ آپ نے فرمایا! تو پھر حکومت کو بھی کچھ حق حاصل نہیں کہ تم سے کچھ لے جب تک حکومت تمہارے لئے کچھ نہ کرے، تم پر حکومت کا کچھ واجب نہیں آتا۔

غور کرو سلیم! کہ اس مختصر سے ٹکڑے میں کتنا عظیم الشان اصول پوشیدہ ہے۔

اور وہ واقعہ تو عام مشہور ہے کہ جب آپ شام کے سفر میں گئے ہیں تو سواری کا ایک اونٹ تھا جس پر آپ اور آپ کا ملازم باری باری سوار ہوتے تھے۔ جب عیسائی حکومت کے نمائندے استقبال کے لئے آئے ہیں تو حالت یہ تھی کہ ملازم اونٹ پر سوار تھا اور آپ اس کی مہار تھامے آگے آگے (ساربان کی حیثیت سے) چل رہے تھے۔

---

[1] نبیٔ اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہٖ تم میں سے ہر شخص راعی (چرواہا) ہے اور ہر ایک سے اس کے گلے (رعایا) کی بابت پوچھا جائے گا کہ اس کی نگہبانی کیسے کی تھی؟

کیسا حسین ہوگا سلیم! وہ کارواں جس میں رفقائے سفر اس قسم کے ہوں! تمہیں معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ نے "نیک آدمی" کی پہچان کے جو تین معیار بتائے تھے اس میں ایک یہ بھی تھا کہ اسے بہترین رفیقِ سفر ہونا چاہیئے۔ پورا واقعہ یوں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بیان کیا کہ فلاں شخص بڑا نیک ہے۔ آپ نے پوچھا کہ تمہیں کیسے معلوم ہے؟ اس نے کہا کہ وہ بڑا پکّا نمازی ہے۔ نہایت احتیاط سے روزے رکھتا ہے۔ آپ نے کہا کہ اس سے تمہیں یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ وہ بڑا نیک ہے؟ اس سے تو اتنا ہی معلوم ہوا کہ وہ بڑا نمازی ہے۔ بہت روزے رکھتا ہے۔ وہ شخص حیران تھا کہ اب کیا کہوں۔ آپ نے پوچھا کہ

(i) کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟
(ii) کیا تم نے کبھی اس سے معاملہ کیا ہے؟
(iii) کیا اس کے ساتھ کبھی اکٹھے سفر کیا ہے؟

اس نے ہر سوال کے جواب میں سر ہلا دیا، تو آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ پھر تم نے کیسے کہہ دیا کہ وہ بڑا نیک ہے۔ جو بات کہو سمجھ کر کہو۔ یہ کہو کہ وہ بڑا نمازی اور روزے دار ہے۔ یہ مت کہو کہ وہ بڑا نیک ہے۔

اسی شام کے سفر سے واپسی پر (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) وہ واقعہ پیش آیا تھا جس کی یاد سے ہمیشہ آپ کی آنکھوں میں آنسو آجایا کرتے تھے۔ ہوا یہ کہ کسی معروف سے جنگل میں رات کے لئے رُکے۔ حسبِ معمول اِدھر اُدھر گشت لگا رہے تھے تاکہ معلوم کرسکیں کہ وہاں کی حالت کیا ہے کہ ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ جا کر دیکھا تو اس میں ایک ضعیف بڑھیا بیٹھی ہے۔ پوچھا کہ مائی! تمہارا کیا حال ہے؟ اسے کیا معلوم تھا کہ پُرسشِ احوال کون کر رہا ہے۔ کہا کہ حال کیا ہے! خلیفہ کی باتیں تو بڑی سنتے ہیں لیکن کیفیت یہ ہے کہ اس نے آج تک پتہ ہی نہیں لیا کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ آپ نے کہا کہ تم نے اپنی حالت کی اطلاع خلیفہ تک پہنچائی تھی؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے کہا کہ پھر خلیفہ کو کیسے معلوم ہو جاتا کہ تم تکلیف میں ہو؟

سنو سلیم! کہ اس کے جواب میں اس بڑھیا نے کیا کہا۔ اس نے کہا کہ اگر خلیفہ اتنا انتظام نہیں کرسکتا کہ اپنی مملکت کے افراد کے حالات سے باخبر رہ سکے تو اسے خلافت چھوڑ کر الگ ہو جانا چاہیئے۔ وہ اس کا اہل نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ خاموش واپس آ گئے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس کے بعد ساری عمر یہ حالت رہی کہ اس واقعہ کو ہمیشہ باچشمِ پُرنم یاد کیا اور یہ کہا کہ عمرؓ کو اس بڑھیا نے سمجھایا کہ خلافت اور بادشاہت میں فرق کیا ہے[1]؟

یہی تھیں خلافت کی وہ ذمہ داریاں جن کے احساس سے کیفیت یہ تھی کہ جب آپ کے آخری وقت یہ تجویز پیش کی گئی کہ آپ کے بعد آپ کے بیٹے (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) کو خلیفہ منتخب کر لیا جائے تو آپ نے کہا کہ عمرؓ نے جو ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں، اگر خطاب کا گھرانہ ان ہی کی بازپرس سے سرخرو ہو جائے تو کیا کم ہے جو اس خاندان کے ایک اور فرد کو بھی اس بوجھ کے لئے چُن لیا جائے۔

یہ تھے سلیم! دست پروردگانِ ذاتِ رسالت مآبؐ جن کی تعلیم و تربیت اس طرح ہوئی تھی کہ وہ قرآنی نظام کے چلتے پھرتے نمونے بن گئے تھے۔ لیکن اس قسم کی تعلیم و تربیت ہو ہی اس نظام میں سکتی تھی جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا دستِ نگر نہ ہو۔ جس میں انسانی حریت کو وہ اذنِ بال کشائی عطا ہو کہ خدا کی عائد کردہ قیود کے سوا اور کوئی چیز اس کی راہ میں حائل نہ ہو۔ یہی وہ احساس تھا جس کی بنا پر حضرت عمرؓ جب ایک مرتبہ وادی ضبخان سے گذرے ہیں تو گھوڑے سے اُتر کر ننگی زمین پر سجدہ ریز ہو گئے۔ رفقائے سفر حیران تھے کہ یہ کون سا مقامِ سجدہ تھا! آپ نے سجدہ سے اُٹھ کر فرمایا کہ یہ وہ میدان ہے جس میں عمرؓ بچپن میں اونٹ چرایا کرتا تھا۔ باپ سخت تھا اس لئے کام بھی لیتا تھا اور پیٹتا بھی تھا۔ ایک وہ دن تھا اور ایک یہ دن ہے کہ عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں۔ اس احساس کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں بیساختہ بدرگاہِ ربّ العزت سجدہ ریز ہو گیا۔

تم نے اس فقرہ کو سُنا سلیم! کہ آج "عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں"۔ بس یہ ہے صحیح آزادی۔ یعنی انسان پر خدا کے قانون کے سوا کسی کا کوئی دباؤ نہ رہے۔ جب انسان کو ایسی آزادی نصیب ہو جائے تو اس کی تمام دبی ہوئی صلاحیتیں اس طرح اُبھرتی ہیں کہ وہ اقطار السمٰوٰت والارض (ارض و سما کی حدود) سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔ یہ تھا نتیجہ اس نظامِ ربوبیت کا جسے قرآن

---

[1] یہ اور اس قسم کے دیگر کوائف، پرویز صاحب کی کتاب "شاہکارِ رسالت" میں دیکھئے جہاں ان کی جزئیات متعیّن طور پر بیان کی گئی ہیں۔ (طلوعِ اسلام ٹرسٹ)

نے پیش کیا اور جو نبیؐ اکرمؐ کے ہاتھوں دنیا میں متشکل ہوا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں پروان چڑھا۔
اب تم پوچھو گے سلیم! کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کے بعد وہ کچھ ہوا جسے قرآن نے چند الفاظ میں (تمثیلی انداز میں) خود ہی بیان کر دیا ہے جب فرمایا کہ وَ اتۡلُ عَلَیۡہِمۡ نَبَاَ الَّذِیۡۤ اٰتَیۡنٰہُ اٰیٰتِنَا (۷/۱۷۵) انہیں اس شخص کی سرگذشت سناؤ جسے ہم نے اپنا ضابطۂ قوانین دیا (کہ اس کے مطابق نظامِ زندگی قائم کرے)۔ پھر اس نے کیا کیا؟ پہلے تو اس نظام کو قائم کیا اور اس کے بعد فَانۡسَلَخَ مِنۡہَا اسے الگ چھوڑ کر یوں نکل گیا جس طرح سانپ اپنی کینچلی میں سے باہر نکل جاتا ہے اور اس پر کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ وہ اس ضابطۂ خداوندی کو یوں چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ فَاَتۡبَعَہُ الشَّیۡطٰنُ تو شیطان نے اس کا پیچھا کیا اور اسے جا دبوچا۔ یہ تو نظامِ خداوندی کی محافظت تھی جس کی وجہ سے غیر خدائی قوتیں یا انسان کے انفرادی جذبات آگے نہیں بڑھتے تھے۔ جونہی مسلمان نے اس نظام کو چھوڑا، مفاد پرستیوں کی قوتوں نے اسے فوراً آگے بڑھ کر دبوچ لیا۔ (کیا کہا گیا ہے اصغر مرحوم! کہ)

مگر کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

اس کے بازو سمٹے اور صیاد نے آدبوچا۔ فَکَانَ مِنَ الۡغٰوِیۡنَ ۝ سو اس کے بعد یہ کہیں سے کہیں نکل گیا۔ وَ لَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰہُ بِہَا اگر وہ ہمارے قانونِ مشیت سے ہم آہنگ رہتا تو اسے ہم آسمان کی بلندیوں تک لے جاتے۔ وَ لٰکِنَّہٗۤ اَخۡلَدَ اِلَی الۡاَرۡضِ وَ اتَّبَعَ ہَوٰىہُ ۚ لیکن یہ اس ضابطے کو چھوڑ کر اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے پیچھے ہو لیا۔ تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آسمان کی بلندیوں کی طرف جانے کے بجائے یہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا کَمَثَلِ الۡکَلۡبِ ۚ پھر اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اس کا پیٹ تو بھر جاتا ہے، نیت کبھی نہیں بھرتی۔ اِنۡ تَحۡمِلۡ عَلَیۡہِ یَلۡہَثۡ اگر اسے کوئی دھتکار دے تو بھی زبان لٹکائے ہانپتا نظر آئے گا۔ اَوۡ تَتۡرُکۡہُ یَلۡہَثۡ ؕ اور اگر نہ دھتکارے تو بھی اس کی یہی حالت رہے گی۔ ہر وقت کھانے کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھے گا اور منہ سے رال ٹپکے گی۔ ذٰلِکَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ۚ بس یہی مثال سمجھو اس قوم کی جس نے ہمارے ضابطۂ قانون پر عمل پیرا ہونے کے بعد اسے چھوڑ دیا اور اس طرح اپنے عمل سے یہ ظاہر کیا کہ گویا (معاذ اللہ) یہ ضابطہ ہی غلط ہے۔ فَاقۡصُصِ الۡقَصَصَ لَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ۝ (۷/۱۷۶) تم ان لوگوں کو، جو ابھی تک اس

ضابطہ پر ایمان رکھنے کا دعوےٰ کرتے ہیں، یہ سرگذشت سناؤ۔ شاید یہ کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا کرلیں کہ

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

میں نے سلیم! گذشتہ پندرہ برس[1] میں یہی کوشش کی ہے کہ قوم کو اس کے اجڑے ہوئے کاشانوں کی درد بھری داستان سناتا رہوں تاکہ وہ کبھی سوچے کہ وہ کیا تھی اور کیا ہوگئی۔ جس دن اس نے اتنا سوچ لیا ایک بہت بڑا مرحلہ طے ہوجائے گا۔ اس کے بعد یہ سمجھنا آسان ہوجائے گا کہ ہم پھر ویسے کس طرح بن سکتے ہیں۔ جس چیز نے ہمیں وہ کچھ بنا دیا تھا وہ چیز ہمارے پاس آج بھی موجود ہے۔ اس پر ایک دفعہ تجربہ ہوچکا ہے اس لئے اس کے متعلق یہ تذبذب پیدا نہیں ہوسکتا کہ معلوم نہیں اس نظام کے کیا نتائج مرتب ہوں۔ قرآن کے نظام نے جو نتائج ایک بار پیدا کئے تھے وہی نتائج ہر بار پیدا ہوسکتے ہیں۔

یہ نظام کیا ہے؟ اس کی تفاصیل تمہیں "نظامِ ربوبیت" میں ملیں گی[2]۔

یہ خط تمہیں غالباً اس وقت ملے گا جب تم جہاز میں سوار ہوچکے ہوگے۔ اس کے بعد تمہیں اس وقت خط لکھوں گا جب تم یورپ سے واپس آجاؤ گے۔ لو خدا حافظ!

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

والسلام
پرویز

مئی ۱۹۵۳ء

[1] یہ ۱۹۵۳ء میں لکھا گیا تھا [2] یہ کتاب شائع ہوچکی ہے۔ (طلوعِ اسلام ٹرسٹ)

اُنتالیسواں خط

ہماری تاریخ میں کیا ہے؟

پچھلے خط میں تم نے سلیم! قرنِ اوّل سے متعلق وہ درخشندہ موتی دیکھے جو ہماری تاریخ کے اوراق پر مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں. لیکن افسوس کہ ہماری تاریخ انہی گہرہائے تابدار کا مجموعہ نہیں. اس میں ان کے ساتھ ایسے ایسے خزف ریزے بھی ہیں جنہیں اس مبارک زمانے کی طرف منسوب کرتے ہوئے شرم آتی ہے اور خجالت سے آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں. حقیقت یہ ہے کہ تاریخ بھی عجیب دو دھاری تلوار ہے. اگر کسی قوم کے پاس اس کی صحیح تاریخ موجود ہے تو وہ اپنے ماضی کے تجربات کے آئینہ میں اپنے حال کو درخشندہ اور مستقبل کو تابندہ بنا سکتی ہے. لیکن اگر اس کی تاریخ مسخ شدہ ہے تو وہ غلط فہمیوں اور خوش عقیدگیوں کی ایسی اندوہناک تاریکیوں میں گھری رہتی ہے جن سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے. ہمارے ساتھ یہی ہوا ہے. ہمارے زوال کے اسباب میں بنیادی عنصر ہماری غلط تاریخ ہے.

ہمارے پاس خدا کی کتاب ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے (اور علیٰ وجہ البصیرت اور مبنی علی الحقیقت ایمان) کہ وہ ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر زمانے میں ہماری صحیح رہنمائی کرنے کے لئے مکمل اور کافی ہے. اگر ہم اس کا اتباع کریں تو ہمیں اقوامِ عالم کی امامت مل سکتی ہے. یہ ظاہر ہے کہ قرآن کی راہنمائی ہمارے لئے اسی صورت میں نفع بخش ہو سکتی ہے جب ہم اسے سمجھیں. لیکن قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری

غلط تاریخ ہے۔ یہ بات شاید تمہارے نزدیک تعجب انگیز اور حیرت خیز ہو۔ لیکن جب حقائق تمہارے سامنے آئیں گے تو تم اس کی صداقت کو بلا تامل تسلیم کر لوگے۔ قبل اس کے کہ میں اس کی کچھ مثالیں

قرآن فہمی کے راستہ میں روک

تمہارے سامنے پیش کروں، تمہیداً یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تاریخ کس طرح قرآن کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ مثلاً قرآن کریم جس معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے اور اس کے افراد (جماعتِ مومنین) کی خصوصیات میں یہ بھی بتاتا ہے کہ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (۲/۳) جو کچھ انہیں خدا کی طرف سے سامانِ زیست ملتا ہے وہ اسے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ دوسرے مقام پر اس کھلا رکھنے یا دوسروں کو دے دینے کی تصریح ان الفاظ سے کر دی کہ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ اے رسولؐ! جماعتِ مومنین کے افراد تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم اپنے مال و دولت میں سے کس قدر دوسروں کو دیں؟ جواب میں کہا گیا ہے قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ ان آیات سے واضح ہے کہ قرآنی معاشرہ میں افرادِ معاشرہ اپنی محنت کی کمائی میں سے صرف اسی قدر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں جو ان کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس سے زائد قرآنی نظام (یا اسلامی مملکت) کے ہاں چلا جائے گا جو اسے نوعِ انسانی کی ربوبیت (پرورش) کے لئے صرف کرے گا۔ ان آیات کا مفہوم سمجھنے میں نہ کوئی دقت پیش آتی ہے نہ دشواری۔ نہ ان میں کوئی اِشکال ہے نہ اِغلاق۔ لیکن تم جب یہ آیات کسی کے سامنے پیش کرو، تو وہ جواب میں کہہ دیتا ہے کہ فلاں صحابیؓ کے پاس لاکھوں درہم و دینار تھے۔ فلاں کے پاس چاندی اور سونے کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ فلاں کے پاس کارواں در کارواں سامانِ تجارت رہتا تھا۔ اگر کوئی شخص ضرورت سے زائد دولت اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تو ان حضرات کے پاس اس قدر دولت کیوں رہتی تھی؟ اس کے بعد سلسلۂ کلام کچھ اس انداز کا ہوتا ہے۔

سوال:۔ فرمایئے! صحابہؓ کبار قرآن کو بہتر طور پر سمجھتے تھے یا آپ بہتر سمجھتے ہیں؟

جواب:۔ میں تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں صحابہ کبارؓ سے زیادہ قرآن سمجھتا ہوں۔

سوال:۔ کیا صحابہ کبارؓ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے یا ان کا عمل اس کے خلاف تھا؟

جواب:۔ معاذ اللہ! میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا عمل قرآن کے خلاف تھا۔ ان کی زندگی بالکل قرآن

کے مطابق تھی۔

سوال، جب ان کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ اور ان کے پاس اس قدر مال و دولت جمع رہتا تھا تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی رُو سے، زائد از ضرورت مال افراد کے پاس نہیں رہ سکتا۔

اس منطق کا تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ سننے والے بھی فریقِ مقابل کے ساتھ متفق ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سر ہلا کر کہہ دیتا ہے کہ "بات بالکل ٹھیک ہے۔ جب صحابہ کبارؓ کے پاس اس قدر مال و دولت تھا تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں دولت جمع کرنا جائز نہیں! کیا (معاذ اللہ) صحابہؓ کو اتنا قرآن بھی نہیں آتا تھا؟"

تم نے دیکھا کہ تاریخ کس طرح قرآن کے راستے میں آ کر کھڑی ہو گئی؟

تم یہ معلوم کر کے حیران ہو گے کہ ہمارا مروجہ اسلام تاریخ کا مرتب کردہ ہے اور اس کا بیشتر حصہ قرآن کے خلاف ہے۔ مروجہ اسلام کی کسی شق کے متعلق سند مانگئے۔ وہ سند تاریخ سے پیش کی جائے گی۔ اگر تم کہو کہ اس کی سند قرآن سے پیش کیجئے تو جواب میں کہہ دیا جائے گا کہ

نازک دلیل

> ہم رسول اللہ کی سیرتِ طیبہ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی سے اس کی سند پیش کر رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر دین میں سند اور کیا ہو سکتی ہے؟ قرآن کے سمجھنے کے لئے سیرتِ رسول اللہ اور صحابہ کبارؓ کی حیاتِ مقدسہ کا سامنے رکھنا لاینفک ہے۔ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

یہ جواب اس قدر مسکت ہے کہ اس کے بعد تم کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ تاریخ، دین کی سند بن گئی ہے اور قرآن کریم محض ایصالِ ثواب کے لئے رہ گیا ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ تاریخ کے کسی واقعہ کی تائید قرآن کی آیت سے مل جائے تو اس وقت قرآن کو بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جب تاریخ اور قرآن میں تضاد ہو تو سند تاریخ کو حاصل ہو گی، قرآن کو نہیں۔

تاریخ کی صحیح پوزیشن

جب تک ہم قرآن اور تاریخ کی صحیح صحیح پوزیشن کو نہیں سمجھتے اور انہیں اپنے اپنے مقام پر نہیں رکھتے، دین اپنی حقیقی شکل میں ہمارے سامنے نہیں آ سکتا۔ قرآن کا ایک ایک لفظ اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس

محفوظ ہے۔ اس میں شک اور شبہ کی کوئی گنجائش نہیں. جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے (خواہ وہ کتبِ احادیث میں ہو اور خواہ کتبِ سیر و آثار میں) اس کی پوزیشن یہ ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب نہ رسول اللہ نے مدوّن کرا کر اُمّت کو دی، نہ خلفائے راشدینؓ نے انہیں مرتّب کیا اور نہ ہی ان میں سے کوئی کتاب صحابہؓ کے زمانے میں مرتّب ہوئی۔ احادیث کا وہ مجموعہ جسے "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" کہا جاتا ہے (یعنی بخاری شریف) وہ رسول اللہ کی وفات کے قریب ڈھائی سو سال بعد مرتّب ہوا۔ اور تاریخ کی سب سے پہلی جامع کتاب جسے اُمّ التواریخ کہا جاتا ہے (یعنی تاریخ طبری) رسول اللہ کی وفات کے قریب تین سو سال بعد لکھی گئی۔ اس وقت بھی کوئی تحریری ریکارڈ نہیں تھا جن سے ان کتبِ احادیث و تاریخ کو مرتّب کیا گیا ہو۔ یہ یکسر ان باتوں پر مشتمل تھیں جو انہوں نے ہم عصر لوگوں کی زبان سے سنیں۔ یہ ہے ہماری تاریخ کی اوّلین کتابوں کی پوزیشن جن سے ہم سیرتِ رسول اللہ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی سے واقف ہوتے ہیں (واضح رہے کہ نبیِ اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کا بیشتر حصّہ اور صحابہ کبارؓ کی خصوصیاتِ کبریٰ خود قرآنِ کریم میں بھی مذکور ہیں۔ لیکن اس وقت ہم سیرت و آثار کے اس حصّے کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں جو کتبِ احادیث و سیر وغیرہ میں درج ہے)۔

قرآنِ کریم اور تاریخ کی جو پوزیشن اوپر بیان کی گئی ہے اس سے ہر صاحبِ بصیرت اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جب بھی قرآن کے کسی بیان اور عہدِ محمّد رسول اللہ والّذین معہٗ کی تاریخ کے کسی واقعہ میں تضاد نظر آئے تو قرآن کے بیان کو صحیح اور تاریخ کے واقعہ کو غلط قرار دینا چاہیئے۔ یہ ایک ایسی حقیقتِ باہرہ ہے جس کے لئے کسی دلیل و شہادت کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنی دلیل آپ ہے۔ اب رہے تاریخ کے وہ بیانات جن کے متعلق قرآن خاموش ہے۔ تو ایسی صورت میں بھی ہمارے لئے اصولِ کار واضح ہے۔ یعنی

قرآن اور تاریخ کا باہمی تعلق

(۱) ہمارا ایمان ہے (اور قرآن اس کی شہادت دیتا ہے) کہ نبیِ اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کی تعلیم کے مطابق تھی۔

(۲) لہٰذا اگر تاریخ میں نبیِ اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کے متعلق کوئی ایسی بات ملتی ہے جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے تو ہمیں بلا تأمّل کہہ دینا چاہیئے کہ تاریخ کا وہ بیان صحیح نہیں۔ اس طرح دین کا صحیح

تصور بھی قائم ہو جائے گا اور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی سیرتِ پاکیزہ اور حقیقی شکل میں ہمارے سامنے آجائے گی۔

جو کچھ میں نے (نظری طور پر) اُوپر کہا ہے وہ واضح انداز میں سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک تاریخ سے اس کی کوئی مثال نہ پیش کی جائے۔ عہدِ محمد رسول اللہ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کی تاریخ سے اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن چونکہ اس خط میں اس کی گنجائش نہیں (اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے)

ایک مثال

اس لئے میں اس ضمن میں صرف ایک واقعہ پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ یہ وہ واقعہ ہے جو اس وقت پیش آیا جب نبی اکرمؐ نے اس دنیا میں آخری سانس لیا اور ہنوز آپؐ کے جسدِ طیّب کو سپردِ خاک بھی نہیں کیا گیا۔ اور اس کا تعلق صحابہ کبارؓ کی اس پوری جماعت سے ہے جو اس وقت مدینہ میں موجود تھی۔

پہلے اس سلسلہ میں، قرآنِ کریم کی تعلیم کو سامنے لاؤ۔ قرآن کی بنیادی قدر اور غیر متبدّل اصول یہ ہے کہ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے ہر انسانی بچّہ کو، محض اس کے انسان

قرآن کے غیر متبدّل اُصول

ہونے کی جہت سے، واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ یعنی اس میں حسب و نسب، امیر، غریب، رنگ اور وطن، مذہب و ملّت کی کوئی تمیز نہیں۔

(۲) واجب التکریم ہر انسانی بچّہ ہے۔ اب رہا مختلف افراد کے مدارج کا تعیّن، سو اس کے لئے اصول یہ ہے کہ وَلِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹) ہر ایک کا درجہ اس کے کاموں کے مطابق متعیّن کیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر مدارج کا تعیّن، جوہرِ ذاتی اور اعمال کی بنا پر ہوگا۔ اس میں کبھی خاندان، قبیلہ، ذات گوت، رشتہ داری، امارت، غرضیکہ کسی اضافی نسبت کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔

(۳) اسی اصول کے مطابق، امّت میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوگا جو قوانینِ خداوندی کا سب سے زیادہ پابند ہوگا۔ جس کی سیرت و کردار سب سے زیادہ قرآن کے مطابق ہوں گے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳)

ان غیر متبدّل اصولوں کی رُو سے قرآن نے رنگ، نسل، خون، قبیلہ، ذات وغیرہ کے تمام

امتیازات ختم کر دیئے اور عزت و تکریم کا صرف ایک معیار باقی رکھا۔ یعنی جوہرِ ذاتی اور حُسنِ سیرت و کردار۔

اُمّت کا فریضہ

اب آگے بڑھو۔ نبیٔ اکرمؐ نے قرآنی اصولوں کے مطابق ایک معاشرہ متشکل کیا۔ ایک مملکت قائم کی جس کا مقصد دنیا میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" تھا۔ چونکہ اس نظام کو نبیٔ اکرمؐ کی زندگی تک ہی نہیں رہنا تھا۔ اسے مسلسل چلنا تھا۔ کیونکہ اسی کا نام دین تھا۔ اس لئے اس مقصد کے لئے پوری کی پوری اُمّت تیار کی گئی۔ اس اُمّت کے متعلق قرآن میں ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ...... (۳/۱۰۹) تم بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے تمہارا فریضۂ حیات امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

یہی وہ اُمّت تھی جسے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ قرآن میں ہے ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا...... (۳۵/۳۲) پھر ہم نے ان لوگوں کو اس کتاب کا وارث بنایا جنہیں اس مقصد جلیل کے لئے اپنے بندوں میں سے چنا تھا۔ یہ اُمّت (اس زمانے میں) مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھی جن کے پکے اور سچے ہونے کا سرٹیفکیٹ خود اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔ سورۂ انفال میں ہے۔

صحابہؓ کے فضائل

وَ الَّذِينَ آمَنُوا وَ هَاجَرُوا وَ جَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَ الَّذِينَ آوَوْا وَّ نَصَرُوا أُولٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَ رِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۸/۷۴﴾

اور جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اور جنہوں نے (انھیں) پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ یہ سب سچے اور پکے حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ہر قسم کی حفاظت اور عزت کا رزق ہے۔

دوسرے مقام پر ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت ڈال دی تھی۔ اور یہ وہ نعمت کبریٰ تھی جو ساری دنیا کی دولت خرچ کرنے پر بھی نہیں مل سکتی تھی (۸/۶۴) سورۂ توبہ میں ان کے متعلق ہے أُولٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۹/۸۸) یہی وہ لوگ

ہیں جن کے لئے ہر قسم کی بھلائیاں ہیں اور یہی ہیں جو کامیاب و کامران ہیں۔ سورۃ فتح میں خالقِ کائنات نے ان "پکے اور سچے مومنین" کی جس والہانہ انداز میں توصیف و تعریف کی ہے وہ ان حضرات رضی اللہ عنہم کی بلندیٔ مقام کی زندہ شہادت ہے۔ دیکھئے! کہنے والے نے کس طرح جھوم جھوم کر کہا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا٘ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۛۖۚ وَ مَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۛ۫ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــٴَـهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا۠ ۝ (۴۸/۲۹)

محمد رسول اللہ اور ان کے رفقاء کی جماعت بھی کیا عجیب جماعت ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں اور آپس میں بڑے نرم دل اور ہمدرد۔ تو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے جھک جاتے اور قوانینِ خداوندی کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بن جاتے ہیں لیکن وہ راہبوں کی جماعت نہیں۔ وہ خدا کے قانون کے مطابق سامانِ زیست کی طلب و جستجو میں بھی مصروفِ عمل رہتے ہیں اور زندگی کے ہر معاملہ میں قوانینِ الٰہیہ سے ہم رنگ و ہم آہنگ رہتے ہوئے اپنے اندر صفاتِ خداوندی منعکس کرتے ہیں۔ ان کے اندر ایمان و عملِ صالحہ سے سکون و طمانیت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کے یہ خصائص تورات میں بھی مذکور تھے اور انجیل میں بھی۔

انہوں نے جس طرح بتدریج اس نظامِ خداوندی کو قائم کیا ہے اس کی مثال یوں سمجھو جیسے عمدہ بیج سے شگوفہ نکلتا ہو تو پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے۔ پھر وہ مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر جب اس کے خوشوں میں دانے پڑنے

کا وقت آتا ہے تو وہ خود اپنی نالوں پر محکم اور استوار طریق سے کھڑی ہو جاتی ہے. کاشت کار جب اپنی محنت کو یوں ثمر بار ہوتے دیکھتا ہے تو وہ وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا ہے. لیکن یہی چیز اس کے دشمنوں کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے کا موجب بن جاتی ہے.

اس طرح اللہ ہر اس جماعت کو جو اس کے نظام کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھ کر، صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو، اس کا وعدہ دیتا ہے کہ ان کی کوششوں کا ننھا سا بیج تمام خطرات سے محفوظ رہے گا. اور ان کی کھیتی بہترین ثمرات کی حامل ہوگی.

یہ تھی وہ جماعت جس نے رسول اللہ کے مقدس ہاتھوں میں تربیت پائی تھی اور جس نے حضورؐ کے بعد قرآنی نظام کو آگے چلانا تھا. اس مقصد کے لئے ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) وہ اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے کریں.

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے سلیم! کہ

۱. قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ عزت و تکریم کا معیار ذاتی جوہر اور حسنِ عمل ہے، نہ کہ حسب و نسب اور رشتہ داری کے تعلقات.

۲. صحابہ کبارؓ پکے اور سچے مومن تھے. ان کی سیرت بہت بلند اور کردار بڑا پاکیزہ تھا. ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پیوست تھی.

۳. قرآنی نظام کو قائم رکھنا اور آگے چلانا امت کا اجتماعی فریضہ ہے. اس کے لئے وہ باہمی مشورہ سے اپنے میں سے بہترین فرد کو (جو معیارِ خداوندی پر پورا اُترے) منتخب کرکے رسولؐ کا جانشین بنائیں گے. اسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہتے ہیں.

امت کے لئے قرآن کے ان اصولوں پر عمل کرنے کا پہلا موقعہ، رسول اللہ کی وفات کے فوری بعد پیدا ہوگیا. یعنی خلیفہ کا انتخاب.

یہ تھی قرآن کی تعلیم اور قرآن کی رُو سے صحابہ کبارؓ (جماعتِ انصار و مہاجرین) کی خصوصیاتِ کبریٰ. اب دیکھو کہ تاریخ اس باب میں کیا بتاتی ہے.

خلافت کے متعلق حضرت عبّاسؓ اور حضرت علیؓ کے خیالات

بخاری (باب وفات النبیؐ) میں حضرت عبداللہ ابن عبّاس کی روایت سے حسب ذیل واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

اس بیماری میں جس میں آپؐ نے وفات فرمائی علیؓ ابن ابی طالب رسول اللہ صلعم کے پاس سے باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا۔ ابوالحسن! رسول اللہ صلعم نے کس حالت میں صبح فرمائی۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمدللہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ہے۔ تو عباس بن عبدالمطلبؓ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لے گئے اور ان سے کہنے لگے۔ خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہوگے۔ بخدا میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلعم کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہو جائے گا۔ میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبدالمطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں۔ چلو رسول اللہ صلعم کے پاس چلیں اور آپؐ سے دریافت کرلیں کہ آپ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہو گی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اور اگر ہمارے سوا دوسروں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا اور آپ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرما دیں گے (اس[1] پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہو سکتی ہے! عباسؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہوگا)۔ اس پر حضرت علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھ لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو آپ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسولؐ اللہ سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔ (صحیح بخاری باب وفات النبیؐ)

اس روایت سے ظاہر ہے سلیم! کہ ابھی حضورؐ کا انتقال بھی نہیں ہوا کہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ اور چچازاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ مطمئن تھے

---

[1] بین القوسین عبارت بخاری میں نہیں ہے مگر علامہ عینی نے مراسیل شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔

کہ خلافت کسی اور کے پاس نہیں جائے گی. لیکن حضرت عباسؓ کا اندازہ کچھ اور تھا. اس لئے وہ اس بارے میں نبیؐ اکرمؐ سے (خلافتِ حضرت علیؓ کے متعلق) توثیق کرا لینا چاہتے تھے. اس پر حضرت علیؓ نے جو جواب دیا ہے وہ قابلِ غور ہے. یعنی اگر ہم نے رسول اللہ سے دریافت کر لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو پھر ہمارے لئے کوئی گنجائش (CHANCE) نہیں رہے گی.

تم جانتے ہو سلیم! شیعہ حضرات کے ہاں عقیدہ ہے کہ جس طرح نبوّت خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے. اور اس میں انتخاب اور مشورہ کا کوئی سوال نہیں، اسی طرح خلافت بھی خدا کی طرف سے موہبت ہے. اس میں انتخاب وغیرہ کا کوئی سوال نہیں. امام، خدا کی طرف سے منصوص اور ماموٗر ہوتا ہے. یہ امامت حضرت علیؓ اور آپؐ کی اولاد میں، خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہے.

لیکن سُنّی حضرات کا یہ عقیدہ نہیں. ان کے نزدیک، خلیفہ اُمّت کے مشورہ سے منتخب ہوتا ہے. نہ ہی خلافت کوئی جائیداد ہے جو متوفّیٰ کے بعد اس کے رشتہ داروں کو بطور ترکہ مل سکتی ہے. یہ تصوّر کہ حکومت باپ کے بعد بیٹے کو ورثہ میں ملتی ہے، ملوکیّت ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا.

اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے تو.....

جو روایت اوپر درج کی گئی ہے وہ شیعہ حضرات کی نہیں. سنّیوں کی حدیث کی سب سے معتبر کتاب بخاری میں درج ہے. اب تم غور کرو کہ اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو رسول اللہ کے قریب ترین صحابہ (حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ) کے متعلق کیا تصوّر قائم ہوتا ہے؟ یہ تصوّر کہ وہ (معاذ اللہ) اسلام کے ابتدائی اور بنیادی اصول کو بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ خلافت بطور وراثت یا استحقاق نہیں ملتی. یہ معاملہ اُمّت کے باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے. پھر جو جواب حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے. اس سے ان کی سیرت و کردار پر جو زد پڑتی ہے وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں.

اب آگے بڑھو. نبیؐ اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے. چونکہ خلافت (جانشینیٔ رسولؐ) کا معاملہ امّت کے باہمی مشورہ سے طے ہونا تھا اس لئے حضورؐ نے اس کے متعلق وصیّت نہیں فرمائی تاکہ اُمّت کی آزادیٔ رائے پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہو جائے. چونکہ یہ معاملہ بہت اہم تھا. مرکزِ ملّت کے بغیر دین کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا. اس لئے اُمّت نے تجہیز و تکفین سے بھی پہلے اسے طے کر لینا

سقیفہ بنی ساعدہ کا اجتماع

ضروری سمجھا. تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع ہوا جس میں حضرت سعد بن عبادہؓ کو خلافت کا امیدوار قرار دیا گیا. ایک روایت کے مطابق وہاں یہ تجویز بھی سامنے لائی گئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے. اس وقت مہاجرین (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ) بھی وہاں پہنچ گئے. اس اجتماع کی جو روئیداد تاریخ میں بیان ہوئی ہے وہ قابلِ غور ہے. کہا گیا ہے کہ (انصار میں سے) حضرت حباب بن منذرؓ نے حسبِ ذیل تقریر فرمائی.

حضرت حبابؓ کی تقریر

اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں ہی میں رکھو تاکہ لوگ تمہارے مطیع رہیں. کسی شخص میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اُٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کر سکے. تم اہلِ عزت و ثروت ہو. تم تعداد اور تجربے کی بنا پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو. تم بہادر اور دلیر ہو. لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں. ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کر کے اپنا معاملہ خراب نہ کرو. یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں. زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم انہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم سے ہو اور ایک ان میں سے.

(محمد حسین ہیکل کی کتاب "ابوبکر صدیق اکبر" صفحہ ۱۰۷)

کچھ سمجھے سلیم! ہماری تاریخ کا یہ بیان اُن انصار (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے متعلق ہے جن کے مہاجرین کے ساتھ فدائیانہ تعلقات اور بے لوث ایثار کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے. (تاریخ کے بیان کے مطابق) ان کی طرف سے ان جذبات کا اظہار اس وقت ہو رہا ہے جب نبی اکرمؐ کی نعش مبارک بھی ہنوز آنکھوں کے سامنے ہے.

یہ تو رہا انصار کے متعلق. اب مہاجرین کی بابت سنو. (تاریخ بتاتی ہے کہ) اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے حسبِ ذیل تقریر فرمائی.

حضرت عمرؓ کی تقریر

ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں. اللہ کی قسم! عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے. جب

رسول اللہ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے جن میں رسول اللہ مبعوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائل ظاہرہ اور براہینِ قاطعہ ہوں گے۔ رسول اللہ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہلِ عشیرہ ہیں۔ اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو باطل کا پیرو کار، گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لئے تیار ہو۔

(ابوبکر صدیقؓ از ہیکل صفحہ ۱۰۸)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے انصار سے کہا۔

اے انصار! تم ہمت سے کام لو اور عمرؓ اور اس کے ساتھیوں کی بات نہ سنو۔ اگر تم نے اس وقت کمزوری دکھائی تو یہ سلطنت میں سے تمہارا حصّہ غصب کر لیں گے۔ اگر یہ تمہاری مخالفت کریں تو انہیں یہاں سے جلاوطن کر دو اور سلطنت پر خود قابض ہو جاؤ۔ کیونکہ اللہ کی قسم تمہیں اس کے سب سے زیادہ حق دار ہو۔ تمہاری ہی تلواروں کی بدولت اسلام کو شان و شوکت نصیب ہوئی ہے۔ اس لئے اس کی قدر و منزلت کا موجب تمہیں ہو۔ تمہیں اسلام کو پناہ دینے والے اور اس کی پشت پناہ ہو۔ اور اگر تم چاہو تو اسے اس کی شان و شوکت سے محروم بھی کر سکتے ہو۔ (ایضاً ۱۰۹ - ۱۰۸)

اندازِ گفتگو؟

حضرت عمرؓ نے یہ فقرہ سُنا تو کہا۔

اگر تم نے اس قسم کی کوشش کی تو اللہ تمہیں ہلاک کر ڈالے گا۔

(ایضاً ۱۰۹)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے کہا۔

ہمیں نہیں، اللہ تمہیں ہلاک کرے گا۔ (ایضاً ۱۰۹)

یہ ہے سلیم! ہماری تاریخ کے مطابق، ان صحابہؓ کے باہمی تعلقات کا نقشہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ

یہ سرٹیفکیٹ دیتا ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ. وہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور آپس میں بڑے ہمدرد تھے۔ وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ (۸/۶۴) ان کے دلوں میں خدا نے باہمی محبت اور الفت ڈال دی. وہ محبت اور الفت جو دنیا بھر کی دولت دے کر بھی خریدی نہیں جا سکتی تھی (۸/۶۴). ان صحابہؓ کے باہمی تعلقات اور اخلاق کے متعلق ہماری تاریخ یہ نقشہ پیش کرتی ہے۔

حضرت عمرؓ کی جو تقریر (تاریخ کے بیان کے مطابق) اُوپر درج کی گئی ہے اس میں انہوں نے اپنے (یعنی مہاجرین کے) حق خلافت کے متعلق یہ دلیل دی ہے کہ

> رسول اللہ کی جانشینی اور عمارت کے بارے میں ہم سے کون جھگڑ سکتا ہے جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہلِ عشیرہ (اہلِ خاندان) ہیں.

یہ دلیل قابلِ غور ہے. اس سے پیشتر تم دیکھ چکے ہو کہ تاریخ ہمیں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے متعلق یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ ان کے نزدیک خلافت حضورؐ کے قرابت داروں کو ورثہ میں ملنی چاہیئے تھی. اب حضرت عمرؓ کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی استحقاقِ خلافت کے لئے یہی دلیل دی کہ ہم رسول اللہ کے اہلِ خاندان ہیں. غور کرو کہ اس سے ہماری تاریخ ہمیں کہاں لے جانا چاہتی ہے؟

لیکن تاریخ یہیں تک نہیں رہتی. وہ ایک قدم آگے بڑھاتی ہے اور بتاتی ہے کہ جب معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کر گیا تو حضرت ابوبکرؓ اٹھے اور آپ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعوے یکسر بے بنیاد ہے. رسول اللہ نے فیصلہ کر دیا ہوا ہے کہ "الائمۃ من قریش" خلافت قریش میں رہے گی. اس پر انصار خاموش ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے۔

الْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ

یہ حدیث متفقہ طور پر صحیح مانی جاتی ہے. لیکن تم ذرا اس کی گہرائی میں جاؤ اور سوچو کہ یہ کبھی رسول اللہ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟ قرآن مسلسل و متواتر نسل اور خون کے امتیازات مٹا کر مساواتِ انسانیہ اور تکریم آدمیت کی تعلیم دیتا رہا. حضورؐ کی ساری زندگی اس بلند و برتر تعلیم کا عملی نمونہ رہی. کیا تم اس امر کا تصور بھی کر سکتے ہو کہ اس تعلیم کا حامل رسولؐ (معاذ اللہ) یہ فیصلہ کرے گا کہ حکومت میرے قبیلہ کے اندر رہے گی. یہ ایک روایت قرآن کی بنیادی تعلیم اور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو

باطل قرار دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ہماری تاریخ اس روایت کو رسولُ اللہ کی طرف منسوب کرتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار اور مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے حقِ خلافت کے لئے بطور دلیل پیش کیا ہے اسے سب نے تسلیم کر لیا۔ یعنی ہماری تاریخ، ایک ہی واقعہ میں خدا کے رسولؐ اور رسولؐ کے صحابہ کبارؓ کے متعلق نسل پرستی کا ایسا تصور پیدا کر جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآنِ کریم آیا تھا۔

رسولُ اللہ کی وفات کے فوری بعد، صحابہ کبارؓ (انصار و مہاجرین) کا جو پہلا اجتماع ہوا، اس میں (ہماری تاریخ کے مطابق) ان حضرات کے باہمی تعلقات، اندازِ گفتگو اور اسلوبِ دلائل کا نقشہ ہمارے سامنے آ گیا۔ اب اس سے آگے بڑھو۔ (امام) طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

دست و گریباں

سابقہ روایت کے سلسلہ سے عبداللہ بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ اب ہر طرف سے لوگ آ آ کر ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سعدؓ کو روند ڈالتے۔ اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ، ان کو نہ روندو۔ عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کرے، اس کو قتل کر دو۔ اور خود ان کے سرہانے آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی۔ عمرؓ نے کہا چھوڑو، اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے مُنہ میں ایک دانت نہ رہے گا۔ ابوبکرؓ نے کہا، عمرؓ! خاموش رہو۔ اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سودمند ہے۔ عمرؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑ دیا۔ سعدؓ نے کہا اگر مجھ میں اُٹھنے کی بھی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کی گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے، اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کر دیتا جو میری بات نہیں مانتے بلکہ میں ان کا اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھا کر لے چلو۔ ان کے آدمیوں نے ان کو اُٹھا کر ان کے گھر پہنچا دیا۔ چند روز ان سے تعارض کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے تم بھی آ کر بیعت کر لو۔ سعدؓ نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا

ترکش خالی نہ کردوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے خون سے رنگین نہ کرلوں اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے، وار نہ کرلوں۔ اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے نہ لڑلوں، ہرگز بیعت نہ کروں گا، خدا کی قسم اگر انسانوں کے ساتھ جن بھی تمہارے ساتھ ہو جائیں تب بھی، جب تک کہ میں اپنے معاملے کو اپنے رب کے سامنے پیش نہ کروں، بیعت نہیں کروں گا۔

(تاریخ طبری، جلد اوّل، حصہ چہارم، اُردو ترجمہ، شائع کردہ جامعہ عثمانیہ، ص۶۲)

معاذاللہ! اس سے ایک صفحہ آگے ہے۔

ضحاک بن خلیفہ سے مروی ہے امارت کے انتخاب کے موقع پر حباب بن المنذرؓ نے کھڑے ہو کر تلوار نکال لی اور کہا کہ میں ابھی اس کا تصفیہ کر دیتا ہوں۔ میں شیر ہوں اور شیر کی کھوہ میں ہوں اور شیر کا بیٹا ہوں۔ عمرؓ نے اس پر حملہ کیا۔ اس کے ہاتھ پر وار کیا۔ تلوار گر پڑی، عمرؓ نے اسے اُٹھا لیا اور پھر سعدؓ پر جھپٹے۔ اور لوگ بھی سعدؓ پر جھپٹے۔ ان سب نے باری باری آکر بیعت کی۔ سعدؓ نے بھی بیعت کی۔ اس وقت عہدِ جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔ ابوبکرؓ اس سے دُور رہے۔ جس وقت سعدؓ پر لوگ چڑھ گئے کسی نے کہا کہ تم لوگوں نے سعدؓ کو مار ڈالا۔ عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کر دے۔ وہ منافق ہے۔ عمرؓ کی تلوار کے سامنے ایک پتھر آگیا اور ان کی ضرب سے وہ قطع ہو گیا۔

سلیم! تم کلیجے پر ہاتھ رکھو اور اس فقرہ کو پھر پڑھو کہ

اس وقت عہدِ جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔ (معاذاللہ۔ معاذاللہ)۔

بہرحال، ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد، دوسرے امیدوار، حضرت سعدؓ کا کیا طرزِ عمل رہا؛ سنو!

اس کے بعد سعدؓ نہ ابوبکرؓ کی امامت میں نماز پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ حج میں بھی مناسک ان کے ساتھ ادا نہیں کرتے تھے۔ ابوبکرؓ کے انتقال

تک ان کی یہی روش رہی۔ (طبری، صفحہ ۸)

داڑھیاں نوچنا

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ سقیفہ کے تنازعے میں، حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی تھی۔ تاریخ طبری ہمیں بتاتی ہے کہ ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچنا (معاذ اللہ) ان حضرات کا معمول سا ہو گیا تھا۔ (چنانچہ طبری کی اسی جلد میں جس کے اقتباسات اوپر دیئے گئے ہیں) لکھا ہے کہ جب حضرت اسامہؓ کی امارتِ عساکر کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ میں اختلافِ رائے ہوا تو

> ابو بکرؓ جو بیٹھے ہوئے تھے غصے سے اچھل پڑے اور بڑھ کر انہوں نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی اور کہا۔ اے ابن الخطاب! اللہ تیری ماں کا برا کرے کہ تم مرجاتے۔ بھلا جس شخص کو رسول اللہ نے اس پر فائز کیا ہے تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اسے علیحدہ کردوں۔ (ایضاً صفحہ ۱۲)

یہ جملہ معترضہ تھا۔ اب پھر انتخابِ خلیفۂ اوّل کی تاریخی داستان کی طرف آؤ۔ اس تمام واقعہ میں حضرت علیؓ کا ابھی تک کہیں ذکر نہیں آیا۔ تم یقیناً یہ معلوم کرنے کے لئے مشوش ہو گے کہ جن بزرگوار (یعنی حضرت علیؓ) کے دل میں سب سے پہلے خلافت کا سوال پیدا ہوا تھا، حضرت ابو بکرؓ کے انتخاب پر ان کی طرف سے کیا ردِ عمل ہوا۔ تاریخ اس کے متعلق تفصیل سے بتاتی ہے۔ سنئے۔ محمد حسین ہیکل (مصری) اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

حضرت علیؓ کا ردِ عمل

> مہاجرین اور انصار کے چند افراد حضرت ابو بکرؓ کی بیعت میں شامل نہ تھے بلکہ ان کا میلان حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی طرف تھا۔ ان میں سے مشہور لوگ یہ تھے۔ عباسؓ بن عبد المطلب، فضل بن عباسؓ، زبیرؓ بن عوام، بن العاص، خالدؓ بن سعید، مقدادؓ بن عمرو، سلمان فارسیؓ، ابو ذر غفاریؓ، عمار بن یاسرؓ، براء بن عازبؓ، ابی بن کعبؓ۔ ابو بکرؓ نے عمرؓ، ابو عبیدہ بن جراحؓ، مغیرہ بن شعبہؓ سے ان لوگوں کے بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ عباسؓ بن عبد المطلب سے ملئے اور خلافت میں ان کا حصہ بھی رکھ دیجئے۔ جو ان کی اولاد کی طرف منتقل ہو جائے۔ اس طرح ان

کے اور ان کے بھتیجے علیؑ بن ابی طالب کے درمیان اختلاف واقع ہو جائے گا اور یہ بات آپ کو علیؑ کے مقابلہ میں فائدہ مند ثابت ہوگی۔

اس مشورے کے مطابق ابو بکرؓ عباسؓ سے ملے تو دونوں کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا۔ آپ رسولؐ اللہ کے چچا ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ خلافت میں آپ کا حصہ بھی موجود ہو جو آپ کے بعد آپ کی اولاد میں منتقل ہوتا رہے۔ لیکن عباس نے یہ پیشکش رد کر دی اور کہا کہ اگر خلافت ہمارا حق ہے تو ہم ادھوری خلافت لینے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ (ابو بکر ۱۱۹)

اس کے بعد ہیکل لکھتا ہے۔

ایک اور روایت میں، جس کا یعقوبی اور بعض دیگر مورخین نے بھی ذکر کیا ہے، مذکور ہے کہ مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت حضرت علیؑ کی بیعت کرنے کے ارادے سے حضرت فاطمہ الزہرہؑ بنتِ رسولؐ اللہ کے گھر میں جمع ہوئی۔ ان میں خالد بن سعیدؓ بھی تھے۔ خالدؓ نے حضرت علیؑ سے کہا۔

اللہ کی قسم! رسولؐ اللہ کی جانشینی کے لئے آپ سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں۔ اس لئے آپ ہماری بیعت قبول کیجئے۔

جب حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس اجتماع کی خبر ملی تو وہ چند لوگوں کو لے کر حضرت فاطمہؑ کے گھر پہنچے اور اس پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؑ تلوار ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلے۔ سب سے پہلے ان کی مڈبھیڑ حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تلوار توڑ ڈالی اور وہ دوسرے لوگوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہو گئے۔ اس پر حضرت فاطمہؑ گھر سے باہر آئیں اور کہا۔

"یا تو تم میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ اللہ کی قسم میں اپنے سر کے بال نوچ لوں گی۔ اور تمہارے خلاف اللہ سے مدد طلب کر دوں گی۔" حضرت فاطمہؑ کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر سب لوگ گھر سے باہر نکل گئے۔

کچھ روز تک تو مذکورہ بالا اصحاب بیعت سے انکار کرتے رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ

یکے بعد دیگرے سب نے بیعت کر لی. سوائے حضرت علیؓ کے جنہوں نے چھ سات مہینے تک بیعت نہ کی. مگر حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد انہوں نے بھی بیعت کر لی.
ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے چالیس روز بعد بیعت کر لی تھی. ایک اور روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارادہ کر لیا تھا کہ بنو ہاشم حضرت فاطمہؓ کے گھر میں خفیہ مجالس منعقد کرنے سے باز نہ آئے تو وہ ایندھن جمع کر کے گھر کو آگ لگا دیں گے. (ایضاً صفحہ ۱۲۰)

اس وقت تک جو کچھ سامنے آیا ہے اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت علیؓ نے اپنے مؤقف کی تائید میں دلیل کیا پیش کی تھی. اب وہ دلیل سنو! ہیکل لکھتا ہے.

حضرت علیؓ کی دلیل

حضرت علیؓ اور دیگر بنی ہاشم کے بیعت نہ کرنے سے متعلق مشہور ترین روایت وہ ہے جو ابنِ قتیبہ نے اپنی کتاب "الامامۃ والسیاسۃ" میں درج کی ہے. وہ یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے بعد حضرت عمرؓ چند لوگوں کو ساتھ لے کر بنی ہاشم کے پاس گئے جو اس وقت حضرت علیؓ کے گھر جمع تھے تاکہ ان سے بھی بیعت کا مطالبہ کریں. لیکن سب لوگوں نے حضرت عمرؓ کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا. زبیرؓ بن عوام تو تلوار ہاتھ میں لے کر حضرت عمرؓ کے مقابلہ کے لئے باہر نکل آئے. یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا.

"زبیرؓ کو پکڑ لو!"

لوگوں نے زبیر کو پکڑ کر تلوار ان کے ہاتھ سے چھین لی. اس پر مجبوراً زبیرؓ نے جا کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی. حضرت علیؓ سے بھی بیعت کرنے کا مطالبہ کیا گیا. لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور کہا. میں تمہاری بیعت نہ کروں گا کیونکہ میں تم سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں اور تمہیں میری بیعت کرنی چاہیئے تھی. تم نے یہ کہہ کر انصار کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم رسولؐ اللہ کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے قریبی عزیز ہی خلافت کے حقدار ہیں. اس اصول کے مطابق تمہیں

چاہیئے تھا کہ خلافت ہمارے حوالے کرتے مگر تم نے اہل بیت سے چھین کر خلافت غصب کر لی۔ کیا تم نے انصار کے سامنے یہ دلیل پیش نہ کی تھی کہ ہم خلافت کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ رسولؐ اللہ ہم میں سے تھے۔ اس لیئے تم ہماری اطاعت قبول کرو اور خلافت ہمارے حوالے کر دو؟ وہی دلیل جو تم نے انصار کے مقابلے میں دی تھی اب میں تمہارے مقابلے میں پیش کرتا ہوں۔ ہم تم سے زیادہ رسولؐ اللہ کے قریبی عزیز ہیں۔ اس لیئے خلافت ہمارا حق ہے۔ اگر تم میں ذرہ برابر ایمان ہے تو ہم سے انصاف کر کے خلافت ہمارے حوالے کرو۔ لیکن اگر تمہیں ظالم بننا پسند ہے تو جو تمہارا جی چاہے کرو تمہیں اختیار ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۲)

تم نے غور کیا سلیم! کہ تاریخ نے جو دلیل حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی طرف منسوب کی تھی (کہ خلافت قریش میں رہے گی اور ہم رسولؐ اللہ کے اہلِ خاندان ہیں) اسے (تاریخ نے) کس سادگی سے حضرت علیؓ کی طرف لوٹایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دلیل کے بعد، سنّی حضرات کا موقف اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ ان سے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں بن پڑ سکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ (تاریخ نے) یہ دلیل اولاً حضرات شیخینؓ (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ) کی طرف کیوں منسوب کی تھی۔

بہرحال، حضرت علیؓ کے اس جواب پر حضرت عمرؓ نے کہا۔ میں اس وقت تک آپ کو نہ چھوڑوں گا جب تک آپ بیعت نہ کریں گے۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۲)

سرگرمیاں

اس کے بعد" حضرت علیؓ اس وقت تیزی میں آ گئے اور کہنے لگے کہ عمرؓ تم شوق سے دودھ دوہو جس میں تمہارا بھی حصّہ ہے۔ آج تم اس لئے خلافت ابوبکرؓ کی حمایت کر رہے ہو کہ کل کو خلافت تمہارے پاس لوٹ آئے گی۔ لیکن میں کبھی ان کی بیعت نہ کروں گا۔"

حضرت ابوبکرؓ کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے اور درشت کلامی تک نوبت نہ آ جائے۔ انہوں نے کہا۔ " علیؓ اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں بھی تمہیں مجبور نہیں کرتا۔"

اس پر ابو عبیدہ بن جراحؓ حضرت علیؓ کی طرف متوجّہ ہوئے اور نہایت نرمی

سے کہا۔" بھتیجے! تم ابھی کم عمر ہو اور یہ لوگ بزرگ ہیں۔ نہ تمہیں ان جیسا تجربہ حاصل ہے اور نہ تم ان کی طرح جہاندیدہ ہو۔ اگر قوم میں کوئی شخص رسولؐ اللہ کی جانشینی کے فرائض صحیح طور پر بجالا سکتا اور خلافت کا بوجھ کما حقہٗ اٹھا سکتا ہے تو وہ صرف ابوبکرؓ ہیں اس لئے تم ان کی خلافت قبول کر لو۔ اگر تم نے لمبی عمر پائی تو یقیناً اپنے علم و فضل، دینی رُتبے، فہم و ذکار، سابقیتِ اسلام، حسب و نسب اور رسولؐ اللہ کی دامادی کا شرف حاصل ہونے کے باعث تمہی خلافت کے مستحق ٹھہرو گے۔"

یہ سُن کر حضرت علیؑ کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ غصے سے بولے" اللہ اللہ! اے گروہِ مہاجرین! تم رسولؐ اللہ کی حکومت کو آپؐ کے گھر سے نکال کر اپنے گھروں میں داخل نہ کرو۔ آپ کے اہلِ بیت کو ان کے صحیح مقام پر سرفراز کرو۔ اور ان کا حق انہیں دو۔ اے مہاجرین! اللہ کی قسم! ہمیں خلافت اور حکومت کے مستحق ہیں کیونکہ ہم اہلِ بیت ہیں۔ ہم اس وقت تک اس کے حق دار ہیں جب تک ہم ہیں اللہ کی کتاب کا قاری، دین کا فقیہہ، رسولؐ اللہ کی سنّت کا عالم، رعایا کی ضرورت سے واقف، ان کی تکالیف کو دُور کرنے والا اور ان سے مساوات کا سلوک کرنے والا قائم ہے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ ہم میں ان صفات کا حامل موجود ہے، اس لئے اپنی خواہشات کی پیروی کر کے اللہ کے راستے سے گمراہی اختیار نہ کرو۔ اور حق کے راستے سے دُور نہ چلے جاؤ۔" راویوں کے بیان کے مطابق بشیر بن سعدؓ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ جب انہوں نے حضرت علیؑ کی یہ باتیں سنیں تو کہا۔" اے علیؑ! اگر یہ باتیں جو اس وقت تم نے کہیں ہیں۔ انصار کا گروہ ابوبکرؓ کی بیعت سے پہلے سُن لیتا تو وہ لوگ تمہارے سوا کسی کی بیعت نہ کرتے۔"

اس گفتگو کے بعد حضرت علیؑ طیش میں بپھرے ہوئے گھر چلے گئے۔ جب رات ہوئی تو وہ حضرت فاطمہؑ کو لے کر باہر آئے اور انہیں ایک خچر پر بٹھا کر

انصار کے پاس لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ گھر گھر جاتیں اور ان سے حضرت علیؑ کی مدد کرنے کی درخواست کرتیں۔ لیکن ہر جگہ سے انہیں یہی جواب ملتا۔

"اے بنتِ رسولؐ اللہ! ہم ابو بکرؓ کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے خاوند بیعت سے قبل ہمارے پاس آتے تو ہم ضرور ان کی بیعت کر لیتے۔"

یہ سن کر حضرت علیؓ غصہ میں آ کر جواب دیتے۔ "کیا میں رسولؐ اللہ کی نعش کو بلا تجہیز و تکفین چھوڑ دیتا اور باہر نکل کر آپ کی جانشینی کے متعلق لڑتا جھگڑتا پھرتا؟"

حضرت فاطمہؓ بھی کہتیں۔ "ابوالحسن (علیؓ) نے وہی کیا جو ان کے لئے مناسب تھا۔ باقی ان لوگوں نے جو کچھ کیا اللہ ان سے ضرور اس کا حساب لے گا اور باز پرس کرے گا۔" (ایضاً ۲۵-۱۲۲)

ہیکل نے ان واقعات کو مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے۔ اس باب میں بخاری میں حسب ذیل روایت آئی ہے۔

بخاری کی حدیث

حضرت فاطمہؓ، نبی صلعم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے شوہر علیؓ نے رات کو ان کو دفن کر دیا اور ان کے انتقال کی ابو بکرؓ کو اطلاع نہیں دی۔ بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی۔ اور جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؓ کا ایک خاص وقار رہا۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کرنے کی خواہش کی۔ ان چھ ماہ تک انہوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ

---

[1] بعینہٖ اسی سند کے ساتھ ابن جریر طبری نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس کے ساتھ اضافہ کیا ہے۔ "معمر کہتے ہیں کہ کسی نے ابن شہاب زہری سے پوچھا کہ کیا حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک ابو بکرؓ کی بیعت نہیں کی تو زہری نے جواب دیا کہ نہیں نہ حضرت علیؓ نے بیعت کی اور نہ ہی بنو ہاشم میں سے کسی اور نے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

انہوں نے ابو بکرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیے مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ آئے۔ حضرت علیؓ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "نہیں خدا کی قسم آپ ان کے ہاں تنہا نہیں جا سکیں گے۔" اس پر حضرت صدیقؓ نے کہا۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ میرا کیا کرلیں گے۔ خدا کی قسم میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ صدیق اکبر تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ[1] نے خطبہ پڑھا اور فرمایا۔" ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ خدا نے آپ کو عطا کیا ہے اسے پہچانتے ہیں اور کسی بھلائی پر جو حق تعالیٰ آپ کو عطا فرمائے ہم حسد نہیں کرتے لیکن تم نے امرِ خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ رسولؐ اللہ سے ہماری قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصّہ ہے۔"[2]

ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ابو بکر صدیقؓ منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا، اور بیعت سے علیؓ کے تخلف کی صورت کو بیان کیا اور جو عذر انہوں نے بیان کیا تھا اسے پیش کیا۔ پھر مغفرت کی دُعا مانگی۔ اور اس کے بعد، حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابو بکرؓ کے حقِ عظمت کو بیان کیا اور کہا کہ اب تک انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ ابو بکرؓ سے کسی حسد کی بنا پر نہیں کیا اور نہ اس فضیلت سے انکار کی بنا پر جو خدا نے انہیں دی ہے بلکہ ہم سمجھتے تھے کہ امرِ خلافت میں ہمارا حصّہ ہے اور ابو بکرؓ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ لہٰذا ہم اپنے دلوں میں ناراض

(سابقہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) بیعت کی۔ حتّٰی کہ چھ ماہ بعد حضرت علیؓ نے بیعت کرلی تو بنو ہاشم نے بھی بیعت کر لی۔
(ابن جریر طبری، جلد اوّل، حصّہ سوم، اردو ترجمہ، جامعہ عثمانیہ، صـ۵۹۶)

[1] ابن جریر کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے اس موقع پر تمام بنو ہاشم کو اپنے ہاں جمع کر لیا تھا۔ (ایضاً)

[2] ابن جریر طبری نے یہاں یہ الفاظ نقل کئے ہیں ولکنا کنا نری ان لنا فی ھذا الامر حقا فاستبددتم به علینا ہم یہ سمجھتے تھے کہ امرِ خلافت ہمارا حق ہے اور تم نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ (ایضاً)

تھے۔　　(صحیح بخاری، کتاب المغازی)

بخاری کی اس روایت میں چند باتیں بڑی غور طلب ہیں۔ مثلاً

(۱) حضرت علیؓ حضرت ابو بکرؓ سے اس قدر ناراض تھے کہ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کی اطلاع تک نہیں دی اور چپکے ہی چپکے انہیں رات کو دفن کر دیا۔

(۲) جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں، حضرت علیؓ نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت نہ کی لیکن ان کی وفات کے فوری بعد انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کی نظروں میں ان کا پہلا سا وقار باقی نہیں رہا اس لئے انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کر لی جائے۔

(۳) حضرت علیؓ نے اپنے حقِ خلافت کے لئے یہ دلیل دی کہ وہ رسولؐ اللہ کے قرابت دار ہیں۔ تم سوچو سلیم! کہ تاریخ کے اس بیان کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے حضرت علیؓ کے متعلق کیا تصوّر قائم ہوتا ہے؟

تاریخ کے اس بیان کے مطابق حضرت علیؓ نے یہ بھی کہا کہ جن لوگوں نے انہیں خلافت سے محروم رکھا ہے انہوں نے غصب اور استبداد سے کام لیا ہے۔ یہی وہ "جرم" ہے جس کی بناء پر شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ نبیٔ اکرمؐ کی وفات کے بعد، بجز چند اصحاب (جنھوں نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی) باقی سب (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔

صحابہؓ کا ارتداد؟

اس کے متعلق سنی حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ عقیدہ تعصب پر مبنی ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب کہ خود ان کی (حدیث کی) معتبر ترین) کتاب بخاری میں حسبِ ذیل روایت موجود ہے۔

> حضرت ابنِ عباسؓ آنحضرتؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا، برہنہ بدن، بغیر ختنہ کئے حشر کئے جاؤ گے۔ آپ نے یہ آیت پڑھی
>
> كَمَا بَدَاْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ
>
> اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیمؑ ہیں۔ اور اس دن میرے چند صحابہؓ بائیں جانب (یعنی جہنم کی طرف) لئے جا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا یہ تو میرے صحابہؓ ہیں۔ پھر اللہ فرمائے گا یہ لوگ اپنے پچھلے دین

پر لوٹ گئے تھے[1]۔ جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے۔ پس میں کہوں گا
جیسا کہ نیک بندے (یعنی عیسیٰؑ) نے کہا تھا وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ
فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۚ (۵/۱۱۷)
(بخاری کتاب الانبیاء، ترجمہ شائع کردہ نور محمد تاجر کتب
کراچی، جلد دوم، صفحہ ۱۴۹)

سوچو سلیم! کہ بخاری کی اس حدیث کی رُو سے بات کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی ہے؟ یہ وہ صحابہؓ ہیں جن کے متعلق قرآن شہادت دیتا ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (۸/۷۴) "یہی لوگ ہیں جو حقیقی مومن ہیں"۔ اگر ان مومنین کے ایمان کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اُدھر رسول اللہؐ نے آنکھیں بند کیں اور ادھر یہ (معاذ اللہ) ایمان سے پھر گئے، تو بہ دیگراں چہ رسد؟ اور اگر کوئی معترض یہ کہہ دے (اور کہنے والے کہتے ہی ہیں) کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"۔ تو سوچئے کہ (ان روایات کی رُو سے) خود نبیِ اکرمؐ کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور سامنے آتا ہے؟

اس مقام پر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ جس تاریخ کی یہ کیفیت ہے اس کی اس قسم کی روایات کو مسترد کیوں نہ کر دیا جائے؟ ایسا کرنے میں کون سا امر مانع ہے؟ یہ بات بڑی معقول ہے اور ایسا کرنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہماری تاریخ کو تاریخ کے مقام

تاریخ دین بن چکی ہے

سے اٹھا کر دین بنا لیا گیا ہے۔ ان احادیث کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے، رسول اللہؐ کو بذریعہ وحیٔ خفی ملی تھیں۔ اس لئے یہ قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل ہیں (مثلهٗ معهٗ)۔ اتنا ہی نہیں۔ ان کے متعلق یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو قرآن کو منسوخ سمجھو اور حدیث کو برقرار رکھو۔ کراچی کے ایک ادارہ "تحقیقِ حق" کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا ہے جس کا نام ہے "فتنۂ انکارِ حدیث"۔ اس کے مصنف ہیں "علامہ حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی"۔ وہ اس پمفلٹ میں لکھتے ہیں۔

---

[1] بخاری کے اصلی الفاظ "مرتدین علیٰ اعقابھم" ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ کے کیا معنی ہیں نبیؐ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تو کتاب اللہ کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ" کے معنی صرف کتاب اللہ نہیں ہے۔ بلکہ "ما انزل اللہ" کتاب اللہ بھی ہے اور حدیثِ رسول اللہ بھی۔ (صفحہ ۲۰)

حدیث، قرآن کو منسوخ کر دیتی ہے

اس کے بعد لکھتے ہیں رہی یہ بات کہ قولِ رسولؐ قرآن کے خلاف ہو تو وہ بھی حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ (۲/۱۸۰)

.... تمہارے اوپر والدین کی وصیّت فرض ہے اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جبکہ اسے موت آئے۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ لا وصیۃ للوارث۔ وارث کے لئے وصیّت نہیں۔ اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیّت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسولؐ قرآن کی آیت کے خلاف حجّت اور موجبِ عمل رہا۔ (صفحہ ۸۰)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

اب اگر کہا جائے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسولؐ اللہ کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسولؐ کا قول قرآن کو فسخ کر دے! تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ رسولؐ اللہ کا قول اس کا اپنا قول نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے۔ جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسولؐ کا قول بھی خدا کا قول ہے اور جس طرح قرآن کی ایک آیت قرآن کی دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قولِ رسولؐ) دوسرے قول (یعنی قرآن) کو منسوخ کر دیتا ہے۔ (ص۵۶)

میں نے کہا تھا کہ ہمیں چاہیئے کہ ہم قرنِ اوّل (عہدِ محمدؐ رسولؐ اللہ والذین معہٗ) کی تاریخ[1] کے ذخیرہ کو

---

[1] جیساکہ میں نے شروع میں لکھا ہے، قرنِ اوّل کی تاریخ کا کچھ حصّہ کتبِ احادیث میں ہے اور کچھ حصّہ کتبِ

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

قرآن کی روشنی میں پرکھ لیں. جو باتیں قرآن کے مطابق ہیں انہیں صحیح تسلیم کرلیا جائے. جو اس کے خلاف جائیں انہیں مسترد کردیا جائے. اس کے جواب میں حافظ ایوب صاحب نے فرمایا.

قرآن اور احادیث میں اختلاف ہو سکتا ہے

جس طرح خدا کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ عقل کے مطابق ہو، بالکل اسی طرح نبیؐ کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو. اس لئے کہ نبی کا قول بھی قول اللہ ہے اور قرآن بھی قول اللہ ہے اور اللہ کے دونوں قول ہیں. قرآن بھی اور حدیثِ رسولؐ بھی. تو اللہ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں تنوّع نہ ہو. جس طرح اس کے ایک فعل کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسرے فعل کے مطابق ہو۔ ایک طرف پہاڑ کی چوٹی فلک تک پہنچ رہی ہے. دوسری طرف کھڈ کی گہرائی تحت الثریٰ تک پہنچ رہی ہے. جس طرح اس کے ایک فعل کا دوسرے فعل کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے. اسی طرح اس کے ایک قول کا (یعنی حدیثِ رسولؐ کا) اس کے دوسرے قول (یعنی قرآن) کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے. (۵۱)

ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے.

يَكْثُرُ لَكُمُ الْاَحَادِيْثُ مِنْ بَعْدِيْ فَاِذَا رُوِيَ عَنِّي حَدِيْثٌ فَاعْرِضُوْهُ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ فَمَا وَافَقَ فَاقْبَلُوْهُ وَمَا

(سابقہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) سیر و آثار میں. لیکن کتبِ احادیث کو قرآن کے ہم پایہ بلکہ قرآن کا ناسخ ماننے والوں پر یہ بات بھی گراں گزرتی ہے کہ حدیث کو تاریخ کہہ دیا جائے. حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ واقعہ خلافت اوّل کے متعلق بخاری کی جو احادیث سابقہ صفحات میں درج کی گئی ہیں وہ اگر تاریخی بیانات نہیں تو اور کیا ہیں. پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ خود امام بخاری نے اپنی اس کتاب (مجموعۂ احادیث) کا نام "الجامع الصحیح المسند المختصر من امورِ رسول اللہ وایامہ" رکھا تھا. (بحوالہ "تدوینِ حدیث" مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم). اس سے واضح ہے کہ خود امام بخاری کے نزدیک ان کی کتاب تاریخ کی کتاب تھی.

خَالَفَ فَرُدُّوْہُ۔ (بحوالہ کتاب التوضیح والتلویح ۴۸۰)

یعنی رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "میرے بعد تم سے بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی. سو جب کوئی حدیث میری طرف سے روایت کی جائے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو۔ جو اس کے موافق ہو اسے قبول کر لو۔ جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دو۔" اس حدیث کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہ قرآن کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ نبی اکرمؐ کا کوئی ارشادِ گرامی قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ ان حضرات کی طرف سے اس کا کیا جواب ملا؟ جماعت اہلحدیث کے ترجمان ماہنامہ "رحیق" نے اپنی اپریل ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں لکھا۔

حدیث کو قرآن کے مطابق ہونا چاہیئے یہ عقیدہ ملحدوں کا ہے

اس حدیث کو ملحدین نے وضع کیا تھا۔ اور ملحدین کے خیالات کی خوشہ چینی بکواس ازم کے یہ ممبران کر رہے ہیں۔ امام خطابیؒ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں۔ وَضَعَهُ الزَّنَادِقَةُ الَّذِيْنَ مَقْصُوْدُهُمْ اِفْسَادُ الدِّيْنِ وَيَدْفَعُهُ قَوْلُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ اُوْتِيْتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ۔

(ظفر الامانی علی مختصر الجرجانی ۲۶۷)

یعنی یہ روایت ان زندیقوں اور حدیث دشمنوں کی خود ساختہ حدیث ہے جن کا مقصد احادیث کو رد کر دینے سے دینی نظام کا فاسد و باطل کر دینا ہے۔ اور اس حدیث کا بطلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے خود ہو جاتا ہے جس میں ارشاد ہے کہ میں قرآن دیا گیا ہوں اور قرآن کے مانند بھی دیا گیا ہوں. پس "حدیث" ہی قرآن کے مانند ہے. کیونکہ دوسری روایت میں تشریح ہے کہ "قرآن کے مانند" کا نام "حدیث" ہے. وہ روایت یہ ہے اَلَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَصِلُ اِلَيْهِ عَنِّى الْحَدِيْثُ فَيَقُوْلُ لَا نَجِدُ هٰذَا الْحُكْمَ فِى الْقُرْاٰنِ اَلَا وَاِنِّيْ اُوْتِيْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ۔ (ظفر الامانی صفحہ ۲۶۷)

دوسری حدیث کے یہ الفاظ ہیں۔ لَيُوشِكُ الرَّجُلُ مُتَّكِئًا عَلٰى أَرِيْكَتِهٖ يُحَدِّثُ بِحَدِيْثِيْ فَيَقُوْلُ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللّٰهِ الْحَدِيْثُ

(دارمی صفحہ ۱۴۰، جلد اوّل، طبع مصر)

اس قسم کی روایات الکفایہ (ص ۹۔۱۰) میں خطیبؒ نے ذکر کی ہیں جن میں صاف تصریح ہے کہ حدیث کو ردّ نہ کرو۔ مجھے قرآن کی طرح اور اس کی مانند" حدیث" بھی دی گئی ہے۔ امام خطابیؒ کی طرح امام شافعیؒ، امام المحدثین عبدالرحمٰنؒ ابن مہدی وغیرہ نے بھی اس حدیث کو زندیقوں کا وضع کردہ لکھا ہے۔ امام بیہقیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ جو روایت سنّتِ نبویہؐ کو قرآن پر پیش کرنے کی خاطر بنالی گئی ہے وہ باطل ہے۔ علّامہ ہیثمیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں ایک راوی متروک منکرالحدیث ہے۔

(مجمع الزوائد جلد اوّل ص۶۸)

یعنی یہ مسلک کہ جو کچھ قرآن کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھو۔ جو اس کے خلاف ہو، اسے غلط قرار دو، (ان حضرات کے نزدیک) ملحدین اور زنادقہ کا وضع کردہ ہے!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

گذشتہ اوراق میں جو اقتباسات تمہاری نظروں سے گذرے ہیں، ان سے سلیم! یہ حقیقت تمہارے سامنے آچکی ہے کہ ہماری کتبِ احادیث و سیر و آثار میں ایسی باتیں موجود ہیں جو

(۱) قرآنِ کریم کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف ہیں۔
(۲) جن سے نبیٔ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر حرف آتا ہے۔
(۳) جن سے صحابہ کبارؓ کی سیرت و کردار مطعون ہو جاتے ہیں۔
(۴) جو علم و عقل کے بھی خلاف ہیں۔

یہ ہوا کیسے؟

اس کے بعد تمہارے دل میں لازماً یہ سوال اُبھرے گا کہ (الف) اس قسم کی باتیں ان کتابوں میں آ کیسے گئیں؟

(ب) ہزار برس سے یہ متواتر آگے منتقل کیسے ہوتی رہیں۔ یعنی لوگوں نے اس قسم کی باتوں کو ان کتابوں

سے خارج کیوں نہ کر دیا ؟ اور

(ج) آج بھی ہمارا قدامت پرست طبقہ ان باتوں کو صحیح ماننے اور صحیح منوانے پر اس قدر مُصر کیوں ہے ؟

یہ سوالات ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو ذرا بھی عقل و بصیرت سے کام لے اور ان امور پر غور و فکر کرے۔ جہاں تک پہلی دو شقوں کا تعلق ہے (یعنی اس قسم کی باتیں ہمارے لٹریچر میں آ کیسے گئیں۔ اور قوم نے انہیں ان کتابوں سے خارج کیوں نہ کر دیا ؟) اس کے متعلق تفصیلی بحث کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مناسب موقعہ وہ ہے جب ہم اپنی پوری تاریخ کا از سرِ نَو جائزہ لیں اور اس کے ایک ایک گوشے کے متعلق ریسرچ کریں[1]۔ ظاہر ہے کہ خط میں اس کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ میں سرِدست صرف اس نکتہ کو پیش کروں گا کہ آج بھی اس قسم کی باتوں کو صحیح ماننے اور صحیح منوانے پر اس قدر زور کیوں دیا جا رہا ہے ؛ اس نکتہ کی وضاحت ایک واقعہ سے ہو جائے گی۔ اسے غور سے سنو۔ لیکن اس سے پہلے تمہیداً چند الفاظ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میرا تعلق نہ کسی فرقے سے ہے، نہ پارٹی سے، نہ ہی مجھے شخصیتوں سے واسطہ ہوا کرتا ہے۔ اس لئے تم نے دیکھا ہوگا کہ میں نے تمہارے خطوط کے جواب میں اشخاص کے متعلق بہت کم باتیں لکھی ہیں۔ لیکن بعض اوقات واقعات ایسے سامنے آجاتے ہیں جن میں اشخاصِ متعلقہ کا ذکر کئے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ اس واقعہ میں بھی مجبوری درپیش ہے جس کی وجہ سے مجھے نام لینا پڑ گیا ہے۔ تو اب اس واقعہ کو سنو۔

کوئی دو برس اُدھر کی بات ہے کہ جماعت اسلامی کے اربابِ بست و کشاد کا ایک حلقہ جماعت سے الگ ہو گیا۔ ان الگ ہونے والے حضرات نے اپنی علیحدگی کی وجوہات میں ایک بڑی وجہ یہ بتائی تھی کہ جماعت کے دعوتی اور اشاعتی دَور میں جن اصولوں کو دین کی محکم اساس کے طور پر پیش کیا جاتا تھا نظام کے عملی قیام کے وقت ان سے انحراف کیا جا رہا ہے[2]۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتراض بڑا وقیع اور یہ جرم بڑا سنگین تھا۔ لیکن جماعت اسلامی کے امیر[3] نے اس کے جواب میں

---

[1] اس کا مختصر سا ذکر کتاب "شاہکارِ رسالت" کے آخری باب میں آگیا ہے۔ (۱۹۸۰ء)

[2] ان تفاصیل کیلئے المنیر لائل پور بابت ۳۱ جنوری ۱۹۵۸ء اور طلوعِ اسلام بابت مارچ و جولائی ۱۹۵۸ء دیکھو۔

[3] سید ابوالاعلیٰ مودودی (جواب مرحوم ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۴ء)

ایسا معاذ اللہ رسول اللہؐ نے بھی کیا تھا!

کہا کہ میں نے یہ کون سا انوکھا کام کیا ہے (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خود نبی اکرمؐ نے اسلام کے اشاعتی دَور میں جو اصول بیان فرمائے تھے اس کے عملی قیام کے وقت ان میں لچک پیدا کر لی تھی۔ مثلاً

> اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآنِ مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْش امام قریش میں سے ہوں۔
>
> ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

تم نے سوچا سلیم! کہ اس وضعی روایت سے جو ہماری کتبِ تاریخ میں درج ہے (اور جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) امیر جماعت اسلامی نے کس طرح فائدہ اٹھایا؟ ظاہر ہے کہ اگر معاملہ صرف قرآن تک رہتا اور دین میں اس کو سند مانا جاتا تو ان صاحب کو اپنی روش کی تائید میں کوئی دلیل و سند نہ مل سکتی۔ لیکن چونکہ تاریخ کو (قرآن کے برابر بلکہ اس سے بھی افضل) سند مان لیا گیا ہے اور اس میں ہر قسم کا رطب و یابس مسالہ موجود ہے۔ اس لئے اس سے ہر شخص کو اس کے ہر فیصلے اور عمل کی سند مل سکتی ہے۔

جماعت سے الگ ہونے والوں نے اس کے جواب میں کہا۔

> غور فرمایئے۔ اگر یہ طریقِ کار خدا کے آخری نبیؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ اور اگر اسلامی تحریک اس اسوۂ حسنہ کے مطابق اس طریق کار کو اپنا معمول بناتی ہے اور

ہر کوئی ایسی جماعت جو اقامتِ دین کی علمبردار ہو وہ اس اصول کو بطور فلسفہ اور عقیدہ کے طے کر لیتی ہے کہ اسلامی نظام کے دعوتی اور اشاعتی دَور میں جو اصول بیان کئے جائیں اور جن لوگوں کو جمع کیا جائے۔ جب اسلامی نظام کو عملاً قائم کرنے کا وقت آئے گا تو اس تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ توحید و رسالت ایسے اساسی اصولوں کے علاوہ، تحریک کے مفاد کے لئے جس اصول میں ضروری خیال کرے استثناء پیدا کرلے۔ اس پر عمل کرنے سے اپنی جماعت کو روک دے۔ جو ضمانت اس تحریک نے عوام کو اپنے ابتدائی دَور میں دی ہو اس میں سے جس جزو کو وہ دین کی مصلحت کے لئے مضر خیال کرے ساقط کر دے (جیسا کہ مبیّنہ مثال میں حضورؐ نے مساوات اور حقِ خلافت ایسے اصول اور ضمانت پر صحابہؓ کو عمل کرنے سے روک دیا تھا) تو اس اسلامی تحریک اور اقامتِ دین کی جدّوجہد، اور ان طالع آزما سیاستدانوں کی تحریکات کے مابین کیا فرق باقی رہ جائے گا جو حصولِ اقتدار سے پہلے نہایت پاکیزہ اصول بیان کرتے ہیں۔ بہت حسین وعدے عوام سے کرتے ہیں اور انہی اصولوں اور وعدوں کی بنیاد پر وہ لوگوں کی حمایت و تائید حاصل کرتے ہیں۔ جب انہیں اقتدار حاصل ہوجاتا ہے تو وہ اقتدار کو قائم رکھنے کی عملی مشکلات سے مجبور ہو کر ان وعدوں اور اصولوں کی خلاف ورزی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جھوٹ بولنا بھی جائز ہے

اس پر امیر جماعت اسلامی ایک قدم اور آگے بڑھے اور فرمایا کہ اقامتِ دین جیسے اہم مقصد کے حصول کے لئے اصولوں میں لچک اور استثناء تو ایک طرف، اس کے لئے جھوٹ بولنا بھی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا۔

> راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے

وجوب تک کا فتوےٰ دیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن، مئی ۱۹۵۸ء)

تم حیران ہوگے سلیم! کہ ان صاحب نے ایسا کہنے کی جرأت کیسے کرلی اور اس کی تائید میں ان کے پاس کون سی سند ہوسکتی تھی؟ لیکن جس تاریخ سے انہوں نے پہلی سند پیش کی تھی اسی سے انہیں اس کی سند بھی مل گئی۔

حدیث سے اس کا ثبوت

چنانچہ انہوں نے "جھوٹ کے وجوب" میں دو تین حدیثیں نقل کر دیں، جن میں سے ایک یہ تھی کہ

> اسماء بنت یزید نبیٔ اکرمؐ سے روایت کرتی ہیں کہ جھوٹ جائز نہیں ہے مگر تین چیزوں میں۔ مرد کی بات عورت سے تاکہ وہ اسے راضی کرے۔ جنگ اور اصلاح بین الناس۔ (ترمذی)

اس کے بعد انہوں نے (معاذ اللہ) نبیٔ اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے بھی اس کی مثالیں پیش کر دیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

> اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمدؐ بن مسلم کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظِ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔
>
> (بخاری)

اُمید ہے اس سے یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی کہ یہ حضرات تاریخ کے اس قسم کے بیانات اور واقعات کو (جن کا خلافِ قرآن اور غلط ہونا بدیہیات میں سے ہے) سچا اور دین میں سند تسلیم کرانے پر کیوں زور دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے) اگر سند قرآن رہے اور اس اصول کو تسلیم کرلیا جائے کہ قرنِ اوّل کی تاریخ کا جو بیان قرآن کے خلاف ہے وہ غلط ہے، تو کسی کو اپنی فریب کاریوں اور کذب تراشیوں کے لئے دینی سند نہیں مل سکتی۔ ایسا اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب اس قسم کے تاریخی بیانات کو دین میں سند تسلیم کرالیا جائے اور پھر انہیں اپنے فیصلوں کی تائید میں پیش کر دیا جائے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ اس طبقہ کے تمام افراد

اسی جذبہ کے تحت ان باتوں کو صحیح مانتے اور صحیح منواتے ہیں۔ ان میں بیشتر حصہ ان افراد پر مشتمل ہے جو ان باتوں کو نیک نیتی سے سچا مانتا ہے[1]۔ یہ اس لئے کہ صدیوں کی تقلید سے ان میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ ان کے نزدیک دین کے معاملات میں غور و فکر سے کام لینا جائز نہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے وہی صحیح ہے۔ اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ یہ حضرات اس تاریخ کی حفاظت و ترویج کو عین دینی خدمت سمجھتے ہیں۔ مفاد پرست طبقہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس نے اس قسم کی باتیں وضع کرکے انہیں ابتداءً ہماری تاریخ میں شامل کیا تھا۔ یہی اسے صدیوں سے مسلسل و متوارث آگے بڑھائے چلا آرہا ہے اور یہی آج اس کے تحفظ کا سب سے بڑا علمبردار بن کر سامنے آتا ہے۔

اسلام اور نظامِ سرمایہ داری

اس کی ایک مثال سنو! شروع میں بتایا جا چکا ہے کہ قرآن نے جس نظام کو الدّین کہا ہے اس میں فاضلہ دولت کسی کے پاس جمع نہیں رہتی۔ وہ نوعِ انسانی کی بہبود کے لئے اُمّت (یا نظام) کی تحویل میں چلی جاتی ہے۔ اس باب میں قرآن کی تعلیم ایسی واضح، بیّن اور صاف ہے کہ اس میں کسی قسم کی تاویل و تعبیر کی گنجائش نہیں۔ ظاہر ہے کہ عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) میں قرآن کی اسی تعلیم پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن اس کے بعد جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور سرمایہ دارانہ نظام ہجوم کرکے آگیا تو اس کی ضرورت پڑی کہ اس کی تائید اور جواز کے لئے سندیں وضع کی جائیں۔ یہ اسناد قرآن سے تو مل نہیں سکتی تھیں کیونکہ اس میں تغیّر و تبدّل اور حک و اضافہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے لئے تاریخ کا چور دروازہ ہی کام دے سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کام لیا اور اس قسم کی روایات وضع کیں جن سے سرمایہ داری، زمینداری اور جاگیرداری کا نظام عین مطابق سنّتِ رسول اللہ و سنّتِ صحابہؓ قرار پا جائے۔

مشکوٰۃ کی ایک حدیث

مثلاً ایک روایت ہے:۔

۱؎ کسی مسلک کو نیک نیتی سے ماننا اس مسلک کی صداقت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ کتنے بُت پرست ہیں جو نہایت نیک نیتی سے بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن اس سے بُت پرستی حق و صداقت کا مسلک قرار نہیں پا سکتی۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۹/۳۴) "جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسولؐ! تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کردے"۔ تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دُور کردوں گا۔ پس عمرؓ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کردے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سُنکر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ میں تم کو ایک ایسی بہترین چیز کا پتہ نہ دوں جس کو انسان جمع کرکے خوش ہو۔ اور وہ چیز نیک بخت عورت ہے۔ اس کی طرف مرد دیکھے تو اس کا دل خوش ہو اور جب مرد اس کو کوئی حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور جب وہ غائب ہو تو اس کے مال و اولاد کی حفاظت کرے۔ (ابوداؤد)

(مشکوٰۃ، جلد اوّل، اُردو ترجمہ، صفحہ ۳۰۹)

یہ روایت زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ وضع کردہ ہے۔ یہ کبھی تصوّر میں بھی آسکتا ہے کہ خدا کا ایک حکم ہو اور صحابہؓ پر وہ گراں گزرے؟ پھر ان میں سے (کوئی اور بھی نہیں) حضرت عمرؓ اس حکم کو بدلوانے کے لئے رسولؐ اللہ کے پاس جائیں۔ اور رسولؐ اللہ خدا کے اس حکم کو یوں بدل دیں کہ اگر تم اڑھائی فیصد سالانہ ادا کردو تو تمہیں اجازت ہے کہ سونے چاندی کے ڈھیر جمع کرتے رہو۔ روایت کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ بعد کے دَور کی وضع کردہ ہے۔ لیکن چونکہ اس سے سرمایہ دارانہ نظام کا تحفّظ ہوتا ہے اس لئے مفاد پرست گروہ اسے صحیح ترین حدیث قرار دے کر برابر آگے بڑھائے لارہا ہے۔ اسی قسم کی روایات ہیں جو آج بھی سرمایہ داری، زمینداری اور جاگیرداری کی تائید میں بڑھ چڑھ کر پیش کی جاتی ہیں۔

اور جب کوئی یہ کہے کہ یہ چیزیں قرآن کے خلاف ہیں تو اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسولؐ اللہ اور صحابہ کبارؓ زیادہ سمجھتے تھے!

چونکہ اس خط میں پوری تاریخ کا استقصاء مقصود نہیں اس لئے میں انہی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ تم ان واقعات کو پھر سے سامنے لاؤ۔ جو خلیفۂ اوّل کے انتخاب کے ضمن میں ہماری کتبِ احادیث و آثار میں بیان ہوئے ہیں اور پھر سوچو کہ اگر اس تاریخ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو دنیا میں اسلام اور متبعینِ اسلام کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے؟

پس چہ باید کرد؟ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ اس کا جواب آسان ہے یعنی:

(۱) ہمارا ایمان ہے کہ قرآنِ کریم خدا کی کتاب ہے جو حرفاً حرفاً اپنی حقیقی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

(۲) رسولؐ اللہ اور آپؐ کے صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ لہٰذا

(۳) اگر اس دَور کی تاریخ میں ہمیں کوئی بات ایسی ملے جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہو تو ہمیں بلا تأمل کہہ دینا چاہیئے کہ تاریخ کا وہ بیان غلط ہے۔ خواہ وہ حدیث کے کسی مجموعہ میں ہو یا کسی اور کتاب میں۔

(۴) مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں ہمیں قرنِ اوّل کی تاریخ کو از سرِ نو مرتب کرنا چاہیئے۔ اس تاریخ سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ اس دَور میں قرآن کریم پر اس طرح عمل ہوا تھا۔

(۵) اس دَور کے بعد قرآنی نظام باقی نہیں رہا تھا، اس لئے اس وقت سے آج تک کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ نہ اسلام کی صحیح تعبیر کہلا سکتی ہے، نہ ہمارے لئے دلیل اور حجت بن سکتی ہے۔ نہ ہی ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان لوگوں کی مدافعت میں اپنا وقت اور توانائیاں صرف کریں۔ ان کے متعلق ہم اس سے زیادہ ماننے کے مکلف نہیں کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۲/۱۴۱) "یہ وہ لوگ ہیں جو گزر چکے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا اس کا نتیجہ ان کے لئے تھا۔ تم جو کچھ کرو گے اس کا نتیجہ تمہارے لئے ہوگا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا؟"

(۶) جہاں تک قرآنِ کریم کے سمجھنے کا تعلق ہے وہ اپنے سے باہر تاریخ کا محتاج نہیں۔ اسے ہر زمانہ میں براہِ راست سمجھا جا سکتا ہے۔ دین میں سند اور حجت قرآن ہے۔ اور یہی ہمارے لئے غلط اور صحیح، حق اور باطل کا معیار ہے۔ جو اس کے مطابق ہے وہ حق ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔

جب تک ہم اس مسلک پر عمل پیرا نہیں ہوتے، دین ہمارے سامنے نہیں آسکتا۔ سمجھے سلیم! کہ تاریخ کی صحیح پوزیشن کیا ہے اور اس کے متعلق صحیح مسلک کیا؟

اچھا خدا حافظ۔

والسّلام

پرویز

جون ۱۹۵۹ء

چالیسواں خط

اِسلامک آئیڈیالوجی کیا ہے؟

سلیم میاں! تمہارے سوال کا سیدھا جواب تو یہ تھا کہ میں نے اس موضوع پر جو کچھ آج تک لکھا ہے اسے غور سے پڑھو اور جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں یا جو مزید وضاحت چاہتے ہو، وہ مجھ سے پوچھ لو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم اتنی محنت کبھی نہیں کرو گے اور جو خلش تمہارے دل میں پیدا ہو رہی ہے وہ ویسی کی ویسی رہ جائے گی۔ بلکہ اس کی شدت اور بھی بڑھ جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں تمہارا خاص قصور بھی نہیں "خلاصوں" کی مدد سے امتحان پاس کرنے کی عادت نے ہمارے نوجوانوں کو اس قدر سہل انگار بنا دیا ہے کہ وہ خود محنت کر کے کسی بات کی تہہ تک پہنچنے کے عادی نہیں رہے۔ وہ چاہتے یہ ہیں کہ سب کچھ پکا پکایا ان کے سامنے آجائے۔ لہٰذا مجھے تمہارے سوال کا جواب دینا ہی ہوگا۔ اسے غور سے پڑھنا اور سنبھال کر رکھنا۔ میں اس موضوع پر جو کچھ برسوں سے لکھتا چلا آیا ہوں اسے اس کا خلاصہ SUMMARY سمجھو۔

تمہارا سوال یہ ہے کہ اسلامک آئیڈیالوجی ISLAMIC IDEOLOGY کسے کہتے ہیں؟

آئیڈیالوجی کے معنی

لیکن میں اگر تم سے پوچھوں کہ (اسلامک آئیڈیالوجی تو خیر بعد کی چیز ہے تم بتاؤ کہ) خود "آئیڈیالوجی" کے کیا معنی ہیں؟ تو مجھے یقین ہے کہ تم بغلیں جھانکنے لگ جاؤ گے۔ فلسفہ کی زبان میں آئیڈیالوجی کہتے ہیں SCIENCE OF IDEAS کو۔ یعنی علم کی وہ شاخ جس کا تعلق IDEAS سے ہے۔ اب اگر تم پوچھو کہ IDEA کسے

کہتے ہیں تو اس کا جواب ایک خط میں نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایک فنی مسئلہ ہے اور بڑی مشکل اصطلاح جس کی تاریخ اور تشریح کے لئے طویل فرصت چاہیئے۔ تم ان فلسفیانہ موشگافیوں کو چھوڑ دو اور سیدھے سادھے لفظوں میں یوں سمجھو کہ

وہ بنیادی تصورات CONCEPTS جن پر کسی نظام SYSTEM کی عمارت استوار ہو، اس نظام کی آئیڈیالوجی کہلاتے ہیں۔

لہذا اسلامک آئیڈیالوجی کے معنی ہوں گے وہ بنیادی تصورات جن پر اسلامی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

اب تم پوچھو گے کہ میں اسلام کے ساتھ لفظ "نظام" کیوں لایا ہوں؟ نظام کے معنی ہوتے ہیں (اس زبان میں جسے تم آسانی سے سمجھ لیتے ہو) سسٹم SYSTEM یا ORDER۔ لہذا "اسلامی نظام" کے معنی ہوں گے ISLAMIC SYSTEM یا ISLAMIC ORDER۔ اسی کو اسلامی طریق زندگی ISLAMIC WAY OF LIFE کہا جاتا ہے۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ اسلام کے ساتھ لفظ نظام کیوں لایا جاتا ہے؟

میں تمہیں اس سے پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں کہ اسلام، مذہب RELIGION نہیں، الدّین ہے۔ قرآنِ کریم میں "مذہب" کا لفظ تک نہیں آیا۔ اس نے اسلام کو "الدّین" کہہ کر پکارا ہے۔ مذہب RELIGION اور الدّین میں فرق کیا ہے۔ اسے سمجھ لینے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے ساتھ لفظ "نظام" کیوں لایا گیا ہے۔

مذہب اور دین میں فرق

مذہب یا RELIGION کا بنیادی تصور یہ ہے کہ خدا (یعنی کوئی ایسی ہستی جسے انسان اپنے ذہن میں خدا تصور کر لے) کائنات سے کہیں الگ بیٹھا ہے۔ اس کی کیفیت ایک بادشاہ (یا ڈکٹیٹر) کی سی ہے۔ جب بادشاہ کسی سے ناراض ہو جائے تو وہ شخص عتاب میں آ جاتا ہے۔ اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ ان مصیبتوں سے بچنے کا طریق صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ کی خوشنودی حاصل کر لی جائے۔ اس کے لئے اس کی حمد و ستائش کے قصیدے پڑھنے چاہئیں، اس کی خوشامد کرنی چاہیئے۔ اس کے حضور نذرانے پیش کرنے چاہئیں۔ جو اس کے مقرب ہوں،

ان سے اس تک سفارشیں پہنچانی چاہئیں۔ جب اس طرح بادشاہ کو خوش کر لیا جائے تو پھر نہ صرف وہ مصیبتیں ٹل جاتی ہیں بلکہ انعام و اکرام بھی ملتا ہے۔ وہ جاگیریں بخش دیتا ہے۔ اپنا مقرّب بنا لیتا ہے۔ جاہ و منصب عطا کر دیتا ہے۔ چونکہ ذہنِ انسانی کے تراشیدہ خدا کا تصوّر "بادشاہ" کا سا ہوتا ہے اس لئے "خدا کے پرستار" اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک بادشاہ کی رضا جوئی حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ اسے مذہبی مراسم یا پوجا پاٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ ظاہر ہے سلیم! کہ خدا کے اس تصوّر کے تحت کسی نظام کی ضرورت ہی لاحق نہیں رہتی۔ اس میں ایک فرد کا "اپنے خدا" کے ساتھ پرائیویٹ تعلق ہوتا ہے۔ وہ فرد، تنہائی میں بیٹھ کر، اپنی مصیبتوں کے ازالے اور بخشش کے حصول کے لئے خدا سے منت سماجت کرتا ہے اور وہاں سے فارغ ہو کر دنیا کے دھندوں میں لگ جاتا ہے۔

اسے مذہب یا RELIGION کہتے ہیں۔ یہ انسانوں کے اپنے ذہن کا پیدا کردہ تصوّر ہے اور اس قدیم زمانے کا پیدا کردہ جب انسان، کائنات کی مہیب قوّتوں (بجلی، بادل، سیلاب، آگ، امراض وغیرہ) کے اسباب سے واقف، اور ان کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس زمانے میں اسے اپنے سے زیادہ طاقت ور سے ڈرنے اور اس کے سامنے گڑگڑانے کے سوا کچھ نہیں آتا تھا۔

لیکن خدا کا جو تصوّر حضرات انبیاء کرامؑ کے ذریعے (وحی کی رُو سے) ملا وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی رُو سے خدا اس ہستی کا نام ہے جو کائنات کے عظیم سلسلے کو اپنے اٹل قوانین کے مطابق چلا رہا ہے۔ ان قوانین کے مطابق ہر شے اپنی ابتدائی حالت سے ترقّی کرتی اور نشوونما پاتی اپنی آخری منزل تک پہنچ جاتی ہے (جس طرح بیج، نشوونما پا کر آہستہ آہستہ درخت بن جاتا ہے)۔ خدا نے جس طرح کائنات کی باقی اشیاء کی نشوونما کے لئے قوانین عطا کئے ہیں، اسی طرح اس نے انسانوں کی نشوونما کے لئے بھی قوانین دیئے ہیں۔ جو لوگ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں وہ نشوونما پا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جو ان کے خلاف چلتے ہیں، وہ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں (جس طرح اس بیج کا ستیاناس ہو جاتا ہے جسے قانونِ فطرت کے خلاف سخت زمین میں دبا دیا جائے۔

اس سے تم نے سمجھ لیا ہوگا سلیم! کہ خدا کے اس تصوّر کی رُو سے جو اس نے وحی کی رُو سے

قوانینِ خداوندی

عطا کیا ہے (اور ظاہر ہے کہ خدا کا وہی تصوّر صحیح ہو سکتا ہے جسے وہ خود انسانوں کو بتائے) انسان کا خدا سے تعلّق درحقیقت اُن قوانین سے تعلّق ہے جو اس نے انسانوں کی نشو و نما کے لئے متعیّن کئے ہیں۔ خدا کی ذات کی کنہ و حقیقت کو انسانی ذہن سمجھ نہیں سکتا۔ ہم صرف ان قوانین کو سمجھ سکتے ہیں جو خدا نے ہماری نشو و نما کے لئے ہمیں دیئے ہیں۔ اس ضابطۂ قوانین کا نام قرآنِ کریم ہے۔ یہ انسانوں کی راہنمائی کے لئے آخری، مکمّل اور واحد ضابطۂ قوانین ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے سلیم! کہ جب کوئی فرد تنہا زندگی بسر کرے تو اسے کسی قاعدے اور قانون کی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قانون کی پابندی کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب انسان مل جل کر رہیں۔ جنگل میں کوئی دائیں طرف چلے یا بائیں طرف، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن شہر کی سڑکوں پر اگر قاعدے اور قانون کے خلاف چلا جائے تو نتیجہ فوراً سامنے آجاتا ہے۔ خدا نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے قوانین دیئے ہی اسی لئے ہیں کہ انسانوں نے مل جُل کر رہنا ہے جب بہت سے انسان کسی قاعدے اور قانون کے مطابق مل جل کر رہیں تو اسے نظام، سسٹم یا ORDER کہتے ہیں۔ اسے قرآن نے الدّین سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں انسان اجتماعی طور پر قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔

اس سے سلیم! یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ

۱۔ مذہب اور الدّین میں فرق کیا ہے ـــــــ مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلّق کا نام ہے جسے انسانوں کی اجتماعی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے برعکس،

۲۔ اسلام، مذہب نہیں، الدّین ہے۔

۳۔ اسی کو اسلامی نظام کہتے ہیں۔ یعنی وہ اجتماعی طریق جس میں زندگی، قوانینِ خداوندی کے مطابق بسر کی جائے۔ اور

۴۔ اسلامک آیڈیالوجی کے معنی ہیں وہ بنیادی تصوّرات جن پر اسلامی نظامِ زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے فلسفۂ زندگی، نصب العین حیات، منزلِ مقصود وغیرہ اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے "کلمہ" کہہ کر پکارا ہے (یعنی نظریۂ زندگی) اور اس

کلمہ طیبّہ کا مفہوم

کے ساتھ لفظ "طیّب" کا اضافہ کرکے اسے درخت سے تشبیہہ دی ہے۔ "طیّب" کے عام معنی تو خوشگوار کے ہیں لیکن یہ لفظ اس درخت کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو نہایت عمدہ پھل دے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۞ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ...... (۱۴/۲۴) کلمہ طیبّہ کی مثال ایک شجرِ طیّب کی ہے جس کی جڑیں (پاتال میں) محکم ہوں اور اس کی شاخیں آسمان (کی بلندیوں) میں پھیل رہی ہوں۔ اور وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہر زمانے میں پھل دیتا چلا جائے۔

یہ ہے سلیم! اسلامک آئیڈیالوجی۔ یعنی وہ تصوّراتِ حیات جو اپنے مقام پر محکم اور اٹل ہوں اور جو نظام ان کی بنیادوں پر قائم کیا جائے وہ مکان (یعنی SPACE کی حدود LIMITATIONS سے بے نیاز ہو کر ساری دنیا کو محیط ہو۔ اور اس کے انسانیت پرور نتائج، زمان TIME کی قیود سے بلند ہو کر، ہر زمانے میں تازہ بتازہ سامنے آتے رہیں۔ اس مثال کو سلیم! اچھی طرح ذہن نشین کر لو کیونکہ آگے چل کر اس سے ایک اہم اصول سامنے آئے گا۔

"درخت" کی مثال میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ درخت کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری

آئیڈیالوجی اور عمل

ہے کہ اس کا بیج عمدہ ہو۔ اس میں بڑھنے، پھولنے اور پھلنے کی صلاحیت ہو۔ اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ اس بیج کی نشوونما کے لئے ایک پروگرام کے مطابق محنت کی جائے۔ اس کے لئے زمین تیار کی جائے۔ کھاد ڈالی جائے۔ پانی دیا جائے۔ حرارت اور روشنی کا انتظام کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اسے موسموں کی شدّت سے بچایا جائے۔ جانوروں کی یورش سے محفوظ رکھا جائے۔ دیکھو سلیم! قرآن اس عظیم حقیقت کو کس انداز میں بیان کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (خدا کی طرف سے عطا کردہ) خوشگوار نظریۂ زندگی (آئیڈیالوجی) میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ "خدا کی طرف" بلند ہوتا چلا جائے۔ یعنی ان بلندیوں تک پہنچ جائے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کی ہیں۔ لیکن وہ از خود ایسا نہیں کرسکتا۔ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (۳۵/۱۰) انسان کا عملِ صالح اسے بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یعنی اس کے لئے اس عملی پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے

جو اس کی مناسب نشوونما کر سکے. قرآن کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کو ایمان اور اسے کامیاب بنانے کے لئے عملی پروگرام کو اعمالِ صالح کہا جاتا ہے.

اس سے ظاہر ہے سلیم! کہ کلمہ طیبہ یا آئیڈیالوجی' اسلامی نظام کا نصب العین ہوتا ہے. اور اعمالِ صالحہ وہ پروگرام جو اس نظام پر چلنے والوں کو اس نصب العین تک لے جائے. دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ کلمہ طیبہ یا آئیڈیالوجی اسلامی مملکت کی قراردادِ مقاصد OBJECTIVE RESOLUTION ہوتی ہے اس کا آئین CONSTITUTION اس قرارداد کو سیاسی پیکر عطا کرتا ہے اور مملکت کے قوانین' کاروانِ امت کو اس منزل تک لے جانے کا پروگرام متعین کرتے ہیں.

یہ ہے سلیم! اسلامک آئیڈیالوجی کی DEFINITION یعنی وہ بنیادی تصورات جن پر اسلامی نظامِ زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے.

(یا)

وہ نصب العین جس تک پہنچنا اسلامی معاشرہ کا مقصودِ حیات ہوتا ہے. جو کچھ کہا گیا ہے اسے اچھی طرح سمجھ لو. اس لئے کہ یہ مشاعرہ نہیں کہ تم جب جی چاہے "مکرر" کہہ دو اور میں شعر دہرانے پر مجبور ہو جاؤں. یہ باتیں روز روز نہیں لکھی جا سکتیں.

اب آگے بڑھو اور یہ سمجھو کہ یہ تصورات یا نصب العین ہے کیا؟

زندگی کے متعلق دو نظریے

میں تمہیں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ بتا چکا ہوں کہ زندگی کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان بھی (دیگر حیوانات کی طرح) صرف طبیعی جسم PHYSICAL BODY رکھتا ہے. اس کا جسم فطرت کے طبیعی قوانین PHYSICAL LAWS OF NATURE کے مطابق زندہ رہتا ہے اور کچھ وقت کے بعد' انہی قوانین کے مطابق اس کی مشینری چلنے سے رُک جاتی ہے. اسے اس کی موت کہتے ہیں جس سے اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے. اس نظریہ کو میکانی تصورِ حیات MECHANISTIC CONCEPT OF LIFE کہتے ہیں. جو نظام اس نظریہ کے مطابق قائم ہوتا ہے اس کا نصب العین یا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس مملکت کی حدود میں رہنے والے افراد کی جسمانی پرورش کا انتظام کرے. اچھی مملکت وہ ہوتی ہے جس میں افراد

مادّی نظریۂ زندگی

کی پرورش کا انتظام اچھا ہو. یعنی ہر ایک کو سامانِ زندگی فراوانی سے اور بسہولت ملتا جائے. قرآن کریم اس نظریہ کو حیوانی سطحِ زندگی ANIMAL LEVEL قرار دیتا ہے اور کفر سے تعبیر کرتا ہے. سورۂ محمدؐ میں ہے. وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْ کُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ (۴۷/۱۲) اور جو لوگ (انسانی نظریۂ زندگی سے) انکار کرتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیاوی سامانِ زندگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں (بالکل اسی طرح) جس طرح حیوانات کھاتے پیتے ہیں. ان کا مقام جہنّم کی آگ ہے (جس میں شرفِ انسانیّت کی کھیتی جل کر راکھ ہو جاتی ہے).

قرآنی نظریہ زندگی

دوسرا نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان صرف طبیعی جسم سے عبارت نہیں. اس کے پاس جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جو حیوانات کو نہیں ملی. صرف انسان کو عطا ہوئی ہے. اسے انسانی ذات HUMAN PERSO-NALITY یا نفس SELF کہتے ہیں. انسانی ذات نہ مادی ارتقاء MATERIAL EVOLUTION کی پیداوار ہے اور نہ طبیعاتی قوانین PHYSICAL LAWS کے تابع. یہ ہر انسانی بچے کو — خواہ وہ بادشاہ کے محل میں پیدا ہو یا فقیر کی جھونپڑی میں. برہمن کے گھر میں ہو یا شودر کے. اس کے ماں باپ مسلمان ہوں یا غیر مسلم — خدا کی طرف سے پیدائش کے ساتھ عطا ہوتی ہے. انسانی ذات نشوونما یافتہ شکل DEVELOPED FORM میں نہیں ملتی بلکہ مضمر POTENT اور امکانی REALISABLE POSSIBILITIES کی صورت میں ملتی ہے. جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لئے قوانین مقرّر ہیں، اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے خدا کی طرف سے (قرآنِ کریم میں) قوانین دیئے گئے ہیں. اگر ان قوانین کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جائے تو اس میں، حدودِ بشری کے اندر، ان صفات کی نمود MANIFESTATION ہوتی جاتی ہے جنہیں (لامحدود حیثیت سے) صفاتِ خداوندی کہا جاتا ہے. نشوونما یافتہ ذات، انسانی جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی بلکہ بدستور زندہ رہتی اور مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے. انسانی زندگی کا مقصد ذات کی نشوونما ہے.

میں یہ لکھ رہا ہوں اور اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ اس سے تمہارے دل میں کیا خیالات پیدا

ہوں گے۔ تم کہو گے کہ میں نے یہ کون سی نئی بات کہہ دی ہے۔ یہ تو وہی پرانی کہانی ہے جسے ہم مذہب والوں (مثلاً ہندوؤں اور عیسائیوں کی زبانی سنتے چلے آرہے ہیں۔ یعنی یہ کہ انسانی زندگی کا مقصد "روحانی ترقی" ہے۔ لیکن سلیم! یہ وہی بات نہیں۔ اس سے بالکل مختلف بات ہے۔ "مذہب والوں" کا عقیدہ یہ ہے کہ

مذہب والوں کی روحانی ترقی

(۱) انسانی جسم (بلکہ پوری کی پوری مادی دنیا) روحانی ترقی کے راستہ میں روک بن کر حائل ہے۔ جب تک اسے راستے سے نہ ہٹایا جائے روحانی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا

(۲) روحانی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ انسان دنیا ترک کرے۔ آرزوؤں کا خاتمہ کرے تمام مادی آسائشوں کو قابلِ مذمت قرار دے۔ ان سے نفرت کرے اور کنارہ کش ہوتا چلا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ

(۳) انسان انفرادی زندگی بسر کرے۔ خلوت کدوں میں رہے اور اللہ سے لو لگاتے ہوئے انسانوں سے قطع تعلق کرتا چلا جائے۔

لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ

(الف) انسان خارجی کائنات کی قوتوں کو مسخر کرے اور ان کے ماحصل کو، قوانینِ خداوندی کے مطابق

قرآن کی رُو سے ذات کی نشوونما

تمام نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے عام کرتا چلا جائے۔ یاد رکھو سلیم! جس طرح اس انڈے میں کبھی بچہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کا خول ثابت نہ رہے، اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما نہیں ہو سکتی جب تک اس کی زندگی مادی لحاظ سے محکم اور مضبوط نہ ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ

(ب) انسان اجتماعی زندگی بسر کرے۔ یعنی ایسا معاشرہ قائم کرے جس میں ہر شخص کی جسمانی ضروریات بھی بآسانی پوری ہوتی رہیں اور اسے اس کی ذات کی نشوونما کے پورے پورے مواقع اور اسباب و ذرائع بھی میسّر ہوں۔

اسلامی مملکت کا فریضہ

(ج) اس قسم کے معاشرے کو اسلامی مملکت کہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت

کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے اور انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری اسباب و ذرائع فراہم کرنے کی ذمّہ دار ہو۔ ("ذمّہ دار" کا لفظ قابلِ غور ہے) اسے بھی سمجھ لو کہ "ذات کی نشوونما میں قلب و دماغ HEAD AND HEART کی تمام صلاحیتوں کی نشوونما آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر، خدا کی صفت علیم اور خبیر ہے۔ لہٰذا اس فرد کا جس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو، علیم و خبیر (صاحبِ علم اور باخبر) ہونا لازمی ہے۔ اس کے لئے ذہنی نشوونما ضروری ہے۔ دوسری طرف خدا کی صفت ربوبیّت اور رزّاقیت ہے۔ اس لئے جس فرد کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کی پرورش کا جذبہ اپنے اندر رکھے اور ان کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دے۔ اسے تم "قلب" کی نشوونما کہہ سکتے ہو۔ اگرچہ اس میں قلب کا تصوّر، MIND کے اس تصوّر سے مختص ہے جو آج کل مغرب میں رائج ہے۔ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے ہر فردِ مملکت کی ان صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے اور اس طرح یہ معاشرہ صفاتِ خداوندی کا چلتا پھرتا نمونہ بن جائے۔

مملکت مقصود بالذّات نہیں

اس سے تم نے دیکھ لیا ہو گا سلیم! کہ قرآن کریم کی رُو سے مملکت کا قیام مقصود بالذّات نہیں۔ "مقصود بالذّات" کے معنی ہیں END IN ITSELF۔ یہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد ہے افراد کی ذات کی نشوونما جو اپنی آزاد مملکت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اسلامی مملکت کے قیام ESTABLISHMENT بلکہ اس کی ہستی EXISTENCE کا جواز JUSITIFICATION یہ ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی ذات کی نشوونما (جس میں جسمانی نشوونما سب سے پہلے آتی ہے) کی ذمّہ دار ہے۔ جو مملکت اس مقصد کو پورا نہیں کرتی وہ اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

فرد اور معاشرہ کا تعلق

اس مقام پر لازماً تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو گا کہ میں نے اس وقت تک جو کچھ کہا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ قرآنی نظام میں ساری ذمّہ داری مملکت کی قرار پاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں افراد کو بھی کچھ کرنا پڑتا ہے یا نہیں؟ یہ سوال اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے سلیم! کہ اگر تم انسان کی تمدّنی زندگی کی تاریخ پر نظر ڈالو تو یہ حقیقت تمہارے سامنے آئے گی کہ انسان کے سامنے شروع سے آج تک مسئلہ ہی ایک

رہا ہے۔ یعنی یہ کہ فرد اور معاشرہ (سوسائٹی۔ مملکت) کا باہمی تعلق کیا ہے؟ انسان نے جتنے نظام وضع کئے ہیں ان میں صورت یہ رہی ہے کہ جب سوسائٹی یا مملکت کو اہمیت دی گئی تو اس میں افراد کی انفرادیت INDIVIDUALITY ختم ہو گئی۔ اور جب افراد کی انفرادیت برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی تو ان کے اجتماعی نظام میں انتشار واقع ہو گیا۔ قرآنِ کریم نے ایک ایسا نظام دیا ہے جس میں افراد کی انفرادیت بھی دن بدن بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ان کا نظم اجتماعی بھی محکم سے محکم تر ہوتا جاتا ہے۔ اس نظام کا راز پوشیدہ ہے فرد اور معاشرہ کے اس تعلق میں جسے قرآن کریم نے واضح طور پر متعین کیا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس تعلق کی وضاحت کروں، دو ایک باتیں بطور تمہید بیان کرنی ضروری ہیں۔

مشکل یہ ہے سلیم! کہ بات تم نے ایسی پوچھی ہے جس کے جواب میں اسلام کا سارا نقشہ تمہارے سامنے آجانا چاہیئے۔ اس کے بغیر بات واضح نہیں ہو سکتی۔ اور تقاضا تمہارا یہ ہے کہ میں کسی بنیادی نقطہ کے متعلق بھی یہ نہ کہوں کہ اس کی بابت میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ اس لئے مجھے اس قدر تفاصیل میں جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ سوچو اور جواب دو کہ ان میں سے کون سی بات ایسی ہے جسے میں تمہیں اس سے پہلے بالواسطہ یا بلاواسطہ نہیں بتا چکا۔

اطاعت صرف خُدا کی ہو سکتی ہے

اب سنو وہ تمہید! قرآنِ کریم نے کُھلے کُھلے الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ کسی فرد، معاشرہ یا مملکت کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی انسان سے اپنی اطاعت کرالے۔ اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے۔

لیکن خدا نہ تو ہمارے سامنے آسکتا ہے۔ نہ کبھی ہم نے اس کی آواز سنی ہے۔ اس لئے اس کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس کی اطاعت کی جاتی ہے ان قوانین کی رُو سے جو اس نے بذریعہ وحی دیئے ہیں۔

لیکن قوانین کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے یہ اجتماعی نظام، اسلامی مملکت کہلاتا ہے۔ لہذا خدا کی اطاعت سے عملاً مفہوم ہے اس مملکت کی اطاعت جو قوانینِ خداوندی کو نافذ کرے۔

لیکن اس مملکت سے خدا یہ کہتا ہے کہ جب تم میرے نام پر انسانوں سے اطاعت لیتے ہو تو میں نے

مملکت خدائی ذمہ داریاں پوری کرے گی

انسانوں کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں تمہیں ان کو پورا کرنا ہوگا۔ اگر تم خدائی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر سکتے تو تمہیں اس کا حق حاصل نہیں کہ تم میرے نام پر انسانوں سے اطاعت لو۔ اطاعت لینا اور ذمہ داریوں کو پورا کرنا ساتھ ساتھ چلے گا۔ لہٰذا قرآنی نظام میں فرد اور مملکت کے باہمی تعلق کی کیفیت یہ ہے کہ فرد، مملکت کی وساطت سے، قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتا ہے اور مملکت ان تمام وعدوں کو پورا کرتی ہے جو خدا نے افراد سے کر رکھے ہیں۔ فرد اور مملکت کا یہ تعلق ایک معاہدہ کی رُو سے قائم ہوتا ہے جسے قرآن نے سورۂ توبہ میں مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ

افراد اور مملکت میں معاہدہ

(9/111)۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں تاکہ وہ انہیں جنت دے"۔ ان تصریحات کی روشنی میں جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں، اس کا مفہوم واضح ہے۔ عملی دنیا میں افرادِ معاشرہ اپنی جانیں اور مال اُس اسلامی مملکت کے سپرد کر دیتے ہیں جو نظامِ خداوندی کے قیام کی ضامن ہوتی ہے اور اس کے بدلے میں یہ مملکت انہیں "جنت" عطا کر دیتی ہے۔ یہ تمہیں معلوم ہی ہے سلیم! کہ ایک جنت وہ ہے جو انسان کو مرنے کے بعد ملے گی۔ لیکن قرآن کریم اس دنیا میں اسلامی معاشرہ کو بھی جنت سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ اس میں انسانی جسم کی پرورش اور ذات کی نشوونما کے لئے تمام سامان اور ذرائع فراوانی سے موجود ہوتے ہیں لہٰذا مذکورہ صدر معاہدہ کی رُو سے، فرد اپنی جان اور مال، قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے، اسلامی مملکت کے سپرد کر دیتا ہے اور مملکت اس کی جملہ بنیادی ضروریاتِ زندگی اور اس کی ذات کی نشوونما کے اسباب و ذرائع بہم پہنچانے کی ذمہ دار بن جاتی ہے۔ اس طرح فرد، اپنی جان اور مال معاشرہ کے حوالے کر دینے کے باوجود اپنی انفرادیت (ذات) قائم رکھتا ہے (بلکہ وہ نشوونما پا کر مستحکم سے مستحکم تر ہوتی چلی جاتی ہے)۔ اور مملکت کا نظام محکم بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے سلیم! کہ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری کو سرانجام دے نہیں سکتی جب تک

رزق کے سرچشمے

رزق کے سرچشمے اور وسائلِ پیداوار اس کی تحویل میں نہ ہوں. ویسے بھی، جب افراد اپنی جان اور مال (سب کچھ) مملکت کے سپرد کر دیں تو وسائلِ پیداوار پر انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا. افراد کی ضروریات کی ذمہ دار مملکت ہوتی ہے اور اس کے لئے وسائلِ پیداوار اس کی تحویل میں رہتے ہیں.

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لئے (طبیعی) قوانین PHYSICAL LAWS مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین متعین ہیں. ان قوانین کو قرآنِ کریم "کلمات اللہ" کہہ کر پکارتا ہے اور ان کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ غیر متبدل ہیں. یعنی ان میں کوئی

غیر متبدل اصول

تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا (تم پہلے دیکھ چکے ہو کہ قرآنِ کریم نے آئیڈیالوجی کے لئے "کلمہ" کا لفظ استعمال کیا ہے ــــــ "کلمات" اس کی جمع ہے. لہٰذا کلمات اللہ وہ تصوّراتِ حیات ہیں جن کے مجموعہ کا نام اسلامک آئیڈیالوجی ہے. یہ تصوّرات غیر متبدل ہیں). سورۂ انعام میں ہے. وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶) "تیرے ربّ کی طرف سے عطا کردہ نظریۂ زندگی (یا تصوّرِ حیات) صداقت اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گیا. ان تصوّرات میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں. یعنی اسلامک آئیڈیالوجی (تصوّرِ حیات) مکمل بھی ہے اور ناقابلِ تغیر و تبدل بھی. انہی تصوّرات کو غیر متبدل اصول INVIOLABLE PRINCIPLES یا مستقل اقدار PERMANENT VALUES کہتے ہیں. انسانی ذات کی نشوونما انہی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے.

جب اسلامی مملکت، افراد کی ذات کی نشوونما کے لئے سامان و ذرائع بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہے تو اس سے لامحالہ مطلب یہ ہے کہ اس مملکت کا سارا کاروبار (خدا کی طرف سے عطا کردہ) مستقل اقدار (یا غیر متبدل اصولوں) کے مطابق سرانجام پائے گا. یہ ہوئی پہلی بات.

اب دوسری بات سنو. تم یہ دیکھ چکے ہو کہ جب کسی فرد کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے تو اس میں (حدودِ بشری کے اندر) ان صفات کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے جنہیں (لامحدود انداز میں) صفاتِ خداوندی کہا جاتا ہے. یعنی ذاتِ خداوندی میں یہ صفات لامحدود انداز میں ہوتی ہیں اور انسانی ذات میں ان صفات کی نمود محدود طور پر ہوتی ہے. اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ کسی فرد کی ذات کی نشوونما ہو رہی

ہے یا نہیں تو دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس میں وہ صفات پیدا ہو رہی ہیں یا نہیں جنہیں صفاتِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب ایک فرد میں، جو مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرے، صفاتِ خداوندی کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے تو جو مملکت ان قدار کے مطابق قائم ہوگی اور انہی کے مطابق چلے گی اس میں صفاتِ خداوندی کی نمود اور بھی شدت اور عظمت کے ساتھ ہوگی۔ لہٰذا اسلامی مملکت کی خصوصیت (اور پہچان) یہ ہے کہ وہ (بشری معاشرہ کی حدود کے اندر) صفاتِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے۔

مملکت صفاتِ خداوندی کی مظہر

ان دونوں باتوں کو یکجا کرنے سے نتیجہ یہ نکلا کہ

۱۔ اسلامی مملکت کا نظم و نسق مستقل اقدار کے مطابق ہوتا ہے۔ اور

۲۔ وہ مملکت صفاتِ خداوندی کی مظہر (اور خدائی ذمہ داریوں کے پورا کرنے کی ضامن) ہوتی ہے۔

قرآن نے مستقل اقدار اور صفاتِ خداوندی کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس لئے یہ معلوم کرنے کے لئے کوئی دقت نہیں ہو سکتی کہ فلاں مملکت اسلامی ہے یا نہیں۔ لہٰذا سمٹ سمٹا کر بات یوں سامنے آئی کہ

خلاصۂ مبحث

(ا) اسلامک آئیڈیالوجی ان مستقل اقدار (یا غیر متبدل اصولوں) کا نام ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔

(ب) اسلامی مملکت انہی اقدار کے عملی نفاذ کے لئے قائم ہوتی ہے۔

(ج) اس مملکت کا اوّلین فریضہ یہ ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی جسمانی پرورش اور ذات کی نشوونما کے سامان و ذرائع فراہم کرے۔ اور

(د) اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ ان صفاتِ خداوندی کی مظہر ہو جن کی تفصیل قرآنِ کریم میں بیان ہوئی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے دل میں بار بار یہ خیال انگڑائیاں لے رہا ہو گا کہ وہ مستقل اقدار کیا ہیں جن سے اسلامک آئیڈیالوجی ترتیب پاتی ہے۔ اور جن کی بنیادوں پر اسلامی مملکت کی عمارت استوار

ہوتی ہے۔ یہ سوال تمہارے دل میں پیدا ہونا بھی چاہیئے۔ اس لئے کہ جب تک یہ (مستقل) اقدار سامنے نہ آئیں، نہ اسلامک آئیڈیالوجی سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ اسلامی مملکت کا صحیح تصور قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ اقدار تو سارے قرآن کریم میں پھیلی ہوئی ہیں۔ انہیں ایک خط میں کس طرح سمویا جاسکتا ہے۔ (ان کی تفصیل میں نے اپنی اس کتاب میں دی ہے جو آج کل زیرِ ترتیب ہے اور جس کا عنوان ہے ـــــ اسلام کیا ہے؟ ـــــ تمہیں اس کی اشاعت کا انتظار کرنا ہوگا[1]

لیکن میں جانتا ہوں کہ تم اتنا انتظار نہیں کرسکو گے اور دامن پکڑ کر بیٹھ جاؤ گے کہ چچا جان! ساری نہیں تو چند ایک اقدار ہی بتا دیجئے۔ اور یہ اس لئے کہ تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ میں تمہارے تقاضوں کو رد نہیں کر سکتا۔

چند ایک مستقل اقدار کا تعارف

ہاں سلیم! میں کسی ایسے متلاشئ حقیقت کے تقاضوں کو رد نہیں کر سکتا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ (۲۶/۸۹) جو اللہ کی طرف قلب سلیم لے کر آئے ـــــ اس لئے ان اقدار میں سے چند ایک (مثال کے طور پر) لکھے دیتا ہوں۔ غور سے سنو!

پہلی قدر۔ احترامِ آدمیت

یہ تم دیکھ چکے ہو کہ ہر انسانی بچے کو خدا کی طرف سے وہ شے (پیدائش کے ساتھ) ملتی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے اور یہی چیز انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس لئے سب سے پہلی مستقل قدر یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، محض انسانی بچہ ہونے کی جہت سے، قابلِ عزت ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) "یقیناً ہم نے ہر فرزندِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔" اس میں کالے گورے، سید پٹھان، امیر غریب، مسلم غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں۔ ہر ابنِ آدم، محض آدمی کا بچہ ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسانی مساوات کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔

لیکن اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی نہایت ضروری ہے کہ "انسانی مساوات" کا صحیح مفہوم کیا

---

[1] یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ (۱۹۸۴ء)

ہے؟ اس لئے کہ (وہ ممالک تو ایک طرف رہے جن میں آمریت یا ڈکٹیٹرشپ کا دَور دورہ ہے، جن اقوام میں جمہوری نظام رائج ہے وہاں بھی) مساوات کا مطلب اتنا ہی سمجھا جاتا ہے کہ مملکت کے ہر فرد کو حقِ رائے دہندگی دے دیا جائے۔ جس مساوات کی عمارت انسانی ذات کے عقیدہ پر استوار ہوتی ہے اس کا مفہوم اس سے کہیں وسیع اور بلند ہے۔ ذات PERSONALITY کی بنیادی خصوصیات BASIC CHARACTERISTICS میں یہ بھی ہے کہ کوئی ذات کسی دوسری ذات کے مقصد کے حصول کے لئے آلۂ کار INSTURMENT نہیں بن سکتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی فرد، اپنے مفاد کے حصول کے لئے، کسی دوسرے فرد کو بطور ذریعہ استعمال نہیں کرسکتا سلیم!

حقیقی آزادی

یہ بات بظاہر تو چھوٹی سی ہے لیکن تم جوں جوں اس پر غور کرتے جاؤ گے یہ حقیقت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جائے گی کہ انسان کی حقیقی آزادی کا راز اسی چھوٹی سی بات کے اندر پوشیدہ ہے۔ جس معاشرہ میں ہر فرد کو اس کا حتمی یقین اور کلّی اطمینان ہو کہ اسے کوئی دوسرا فرد اپنے مقصد کے حصول کے لئے بطور ذریعہ استعمال نہیں کرسکتا اس معاشرہ میں آزادی کی جو فضا پیدا ہوسکتی ہے اس کا آج تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن تم یہ کہو گے کہ اس طرح دنیا کے کام کیسے چل سکتے ہیں۔ تمدّنی زندگی کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ ایک کام کو مختلف لوگ مل کر کریں۔ یہ ٹھیک ہے۔ اور خود قرآن کریم بطور مستقل قدر اس کی تاکید کرتا

دوسری قدر۔ تعاون

ہے جب کہتا ہے کہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (۵/۲) زندگی کی کشادگی کی راہوں میں اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کے معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔" لیکن اس میں اور جو بات میں کہہ رہا ہوں اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس میں تعاون کا حکم ہے۔ اور تعاون کے معنی ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ مقصد اجتماعی ہو جو سب کو نوعِ انسانی کی منفعت اور بھلائی کی طرف لے جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے، تمام افراد تقسیمِ کار کے اصول کے مطابق، ایک دوسرے کی مدد کریں۔ یہ ہے "برّ اور تقوٰے کے کاموں میں باہمی تعاون۔" اس کے برعکس جو بات میں کہہ رہا تھا ــــــــ وہ یہ تھی کہ ایک فرد، اپنے ذاتی اور انفرادی مفاد کے حصول کے لئے، دوسرے انسانوں کو اس طرح استعمال کرے جس طرح مادّی اسباب و ذرائع (مثلاً مشینوں کو) یا حیوانات کو استعمال کیا

جاتا ہے۔ جب ہم گھوڑے کو تانگے میں جوتتے اور اسے اسٹیشن لے جاتے ہیں تو اس میں گھوڑے کا اپنا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ مقصد صرف ہمارا ہوتا ہے۔ وہ ہمارے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ جب انسانوں کو اس طرح استعمال کیا جائے تو وہ انسان نہیں رہتے، مشینوں یا حیوانوں کی سطح پر آجاتے ہیں جن میں ذات PERSONALITY نہیں ہوتی۔ یہ انسانی ذات کا انکار اور انسانیت کی تذلیل ہے۔ اس سے فرزندِ آدم واجب التکریم نہیں رہتا۔ ایسا کرنے میں ہم قرآنِ کریم کی ایک مستقل قدر کا انکار کرتے ہیں۔ اور قرآنِ کریم کی کسی مستقل قدر کا انکار کفر ہے۔

تم جانتے ہو سلیم! کہ ایک انسان حیوانوں کی طرح دوسرے انسانوں کے مفاد کے حصول کا ذریعہ کیوں بنتا ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح اور بیّن ہے۔ اسے احتیاج ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک قلی گالیاں کھا کر بھی کام کئے جاتا ہے۔ اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو وہ

احتیاج!

بھوکا مر جائے گا۔ یہ بھوک کا خوف (یا احتیاج) ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے مفاد کے حصول کا ذریعہ بننے پر مجبور کرتا ہے۔ غلط معاشرے میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے (اور ان حالات کو مستقلاً قائم رکھا جاتا ہے) جن میں بعض افراد، اپنی روٹی (یعنی بنیادی ضروریاتِ زندگی) کے لئے دوسرے افراد کے دست نگر رہیں۔ اس سے وہ ان افراد کے مفاد کا ذریعہ INSTRUMENT بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآنی معاشرہ میں کوئی فرد اپنی ضروریات کے لئے کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں ہوتا۔ معاشرہ تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر پر لیتا ہے اور اس طرح اس بنیادی علّت کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے جو انسانی ذات کے عملی انکار کا موجب اور فرد کی تذلیل کا باعث بنتی ہے۔ یوں اس معاشرہ میں اس مستقل قدر پر عمل ہوتا ہے کہ "ہر ابنِ آدم، محض انسان ہونے کی جہت سے، واجب التکریم ہے"۔

اس مقام پر تم کہہ دو گے کہ مختلف انسانوں میں قابلیت اور صلاحیت میں فرق ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے کمانے کی استعداد بھی مختلف ہوتی ہے۔ ایک شخص زیادہ کمانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ دوسرا کم کمانے کی۔ اس طرح بعض افراد کو دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ مختلف افراد میں کمانے کی استعداد میں فرق ہوتا ہے اور اس سے وہ تمام خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم انسانی ذات کی مستقل قدر پر ایمان سے، ان

مفاسد کا بھی صحیح صحیح علاج کر دیتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ انسانی جسم کی پرورش اس سے ہوتی ہے جسے وہ اپنے آپ پر صرف کرے۔ لیکن، اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ فرد، دیگر افرادِ انسانیہ کی پرورش کے لئے عام کر دے۔ لہٰذا جن افراد میں کمانے کی صلاحیت ہو، ان کا یہ بھی ایمان ہوتا ہے کہ وہ اپنی محنت کی کمائی سے جس قدر دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیں گے، اتنی ہی ان کی اپنی ذات کی نشوونما ہو گی۔ اور چونکہ ذات کی نشوونما زندگی کا مقصود ہے، اس لئے وہ اپنی کمائی میں سے اپنے لئے صرف بقدرِ ضرورت رکھیں گے۔ باقی سب دیگر افراد کی پرورش کے لئے کھلا رکھیں گے۔ قرآنِ کریم کی اصطلاح میں اسے "انفاق فی سبیل اللہ" کہتے ہیں، جو ایک مستقل قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔

انفاق۔ تیسری مستقل قدر

تم پوچھو گے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کی نشوونما کے لئے "انفاق" کی ضرورت پڑتی ہے؟ ان میں سے ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو کسی حادثہ کی وجہ سے (خواہ پیدائشی ہو یا بعد میں واقع ہو گیا ہو) کمانے کی استعداد سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کی پرورش (دنیا کے موجودہ غیر قرآنی معاشرہ میں) امیروں کی خیرات سے ہوتی ہے۔ لیکن خیرات سے انسانی ذات کی جس قدر ذلت ہوتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس لئے ان کی پرورش کا یہ انتظام قرآنِ کریم کے نزدیک ایک مستقل نظام کی حیثیت سے کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ وہ اسے ہنگامی حالات میں تو برداشت کر سکتا ہے لیکن اسے معمولِ حیات نہیں بنا سکتا۔ (اس اصول کو یاد رکھو سلیم! کہ جس بات سے انسانی ذات کی کسی طرح بھی تذلیل یا تحقیر ہو، قرآن اسے روا نہیں رکھتا)۔ اس طبقہ کے متعلق (جو کمانے کی استعداد سے محروم ہو چکے ہوں) اس نے کہا ہے کہ وہ اپنے لئے سامانِ نشوونما بطورِ حق AS OF RIGHT طلب کر سکتے ہیں (حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۷۰/۲۵) یہ بھی قرآنِ کریم کی ایک مستقل قدر ہے، جسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

چوتھی قدر۔ محروم کا حق

دوسرا طبقہ وہ ہے جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ ایک مزدور مہینہ بھر کی محنتِ شاقہ سے ساٹھ روپے کماتا ہے لیکن اس کے بیوی بچوں کی بنیادی ضروریات سو روپے مہینے سے کم میں پوری نہیں ہوتیں۔ یہ مزدور بقایا چالیس روپے کہاں سے لائے۔ غیر قرآنی معاشرہ کو اس

سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ اس کا اپنا معاملہ ہے جس سے وہ جس طرح جی چاہے نپٹے۔ وہ مرے۔ وہ جئے۔ اس سے کسی دوسرے کو سروکار نہیں ہوتا۔ قرآنِ کریم نے اس باب میں ایسی مستقل اقدار دی ہیں جو اس مسئلہ کا نہایت اطمینان بخش حل پیش کر دیتی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ (۱۶/۹۰) "اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے"۔ عدل کے معنی ہیں برابر برابر

عدل و احسان۔ بطور مستقل اقدار

کر دینا۔ جو کچھ کسی کا واجب ہے وہ دے دینا۔ اس سے ظلم کی روک تھام ہو گئی۔ (ظلم کے معنی ہیں کسی کے حقوق میں کمی کرنا) اور احسان کے معنی ہیں کسی کی کمی کو پورا کر کے اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا۔ اس سے ان کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے جن کی محنت کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے مکتفی نہ ہو۔ یہ دونوں (یعنی عدل اور احسان) مستقل اقدار ہیں جنہیں کبھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور جن کا برقرار رکھنا قرآنی معاشرہ یا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔

تم نے دیکھا سلیم! قرآنِ کریم کس طرح "انفاق فی سبیل اللہ" کی مستقل قدر سے انسانی مساوات کو عملاً متشکل کرتا اور انسانی ذات کی صحیح تکریم کی ضمانت بہم پہنچاتا ہے۔ یعنی

(۱) جو لوگ اپنی ضروریات سے زیادہ کما سکیں ان کے لئے مستقل قدر یہ ہے کہ جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہو، وہ اسے دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا رکھیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) "تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے، سب کا سب"۔

(۲) جو لوگ محنت سے معذور ہو چکے ہوں، وہ دوسروں کی فاضلہ دولت میں ان کا حق قرار دیتا ہے اور اسے بطور مستقل قدر پیش کرتا ہے۔

(۳) جو محنت کریں، ان کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دینا بھی مستقل قدر کی حیثیت رکھتا ہے اور

(۴) جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہو سکتی ہو، ان کی کمی کا پورا کرنا بھی مستقل قدر ہے[1]۔

---

[1] یہ تمام انتظام، اسلامی مملکت کی رُو سے ہو گا۔

اب سلیم! ایک اور گوشے کو لو۔ جب انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے فرد کے ذاتی مقصد کے حصول کا آلۂ کار نہ بنے، تو انسانی ذات کی تکریم کا فطری تقاضا یہ بھی ہے کہ کوئی

کوئی محکوم نہ ہو۔ مستقل قدر

شخص کسی دوسرے شخص پر حکومت نہ کر سکے۔ اس سے اپنا حکم نہ منوا سکے۔ قرآنِ کریم نے اس اصول کو بھی ایک مستقل قدر کی حیثیت سے پیش کیا ہے جہاں کہا ہے مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ......... (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوّت (تک بھی) عطا کر دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کی نہیں بلکہ میری محکومیت اختیار کرو۔" تم نے دیکھا سلیم! کہ اس ایک اصول نے کس طرح غلامی اور محکومی کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں؟

لیکن تم کہو گے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا حکم ہی نہ مانے تو معاشرے میں نظم و ضبط کس طرح قائم رہے گا؟ اس طرح تو فساد CHOAS برپا ہو جائے گا۔ تمہارے اس اعتراض کا جواب باقیماندہ حصہ میں آجاتا ہے جو اوپر درج کی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ کسی

قانونِ خداوندی کی اطاعت۔ مستقل قدر

انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے یہ کہے کہ وہ اس کی محکومی اختیار کریں۔ وہ یہی کہے گا کہ وہ اس کتاب (کی اطاعت) سے جسے وہ پڑھتے پڑھاتے ہیں، ربّانی بن جائیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ قرآنِ کریم کی اس مستقل قدر کی رُو سے اطاعت کسی انسان کی نہیں ہوگی بلکہ قوانینِ خداوندی کی ہوگی جو اس نے اپنی کتاب میں عطا کر دیئے ہیں۔ کسی فرد کی نہیں بلکہ قانون کی اطاعت۔ اور قانون بھی ایسا نہیں جو کسی انسان کا وضع کردہ ہو، بلکہ وہ جو خود خدا نے نوعِ انسانی کی راہ نمائی کے لئے دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے سلیم! کہ اسلامی مملکت میں اطاعت کسی انسان کے حکم کی نہیں ہوگی۔ صرف ان قوانین کی اطاعت ہوگی جو کتاب اللہ میں دیئے گئے ہیں۔

تم کہو گے کہ کتاب اللہ میں تو بیشتر مستقل اقدار یا غیر متبدّل اصول ہی دیئے گئے ہیں۔ لیکن معاشرہ کا نظم و نسق تو اس صورت میں برقرار رہ سکتا ہے جب چھوٹی بڑی تمام باتوں کے لئے احکام

وضوابط موجود ہوں۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ احکام وضوابط، قرآنِ کریم کی مستقل اقدار کی روشنی میں خود مرتب کئے جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسے مرتب ہوں گے؟

مشاورت۔ مستقل قدر

اس کے لئے بھی قرآنِ کریم نے ایک مستقل قدر دی ہے جب کہا ہے کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ یہ چیزیں امت کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت ایک ایسے مشاورتی نظام کا نام ہے جس میں قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری میں رہتے ہوئے، ہر زمانے کے مسلمان، جزئی احکام وضوابط اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشورہ سے خود مرتب کریں گے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس نظام میں یہ صورت نہیں ہوگی کہ اربابِ حکومت کا ایک طبقہ الگ ہو اور باقی امت ان کی محکوم ہو۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اس میں حاکم اور محکوم کا فرق ہی نہیں ہوگا۔ اسلامی حکومت اس لئے وجود میں آتی ہے کہ وہ قرآنی اقدار کا نفاذ کرے اور غیر قرآنی مسالک وضوابط کی ترویج کو روک دے۔ اسے قرآنِ کریم کی اصطلاح میں "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کو تمام اُمّت کا مشترکہ فریضہ قرار دیا ہے۔ نہ کہ کسی خاص طبقہ، پارٹی یا جماعت کا۔ اس نے پوری امت کو مخاطب کرکے کہا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ .... (۳/۱۰۹) تم بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے متشکل کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔" لہٰذا قرآنِ کریم کی اس مستقل قدر کی رُو سے نظم ونسقِ مملکت میں پوری کی پوری قوم بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک ہوتی ہے اور اس میں حاکم اور محکوم کے الگ الگ طبقات نہیں ہوتے۔

اس سے یہ بھی واضح ہے سلیم! کہ جب پوری امت کے لئے ضابطۂ قوانین دیا گیا ہے اور اس ضابطہ کو نافذ کرنے کا فریضہ پوری کی پوری امت کی مشترکہ ذمہ داری قرار دیا ہے، تو امت میں

کوئی فرقہ یا پارٹی نہیں

فرقوں یا پارٹیوں کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔

اس نے مسلمانوں سے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۲-۳۱/۳۰) "دیکھنا! کہیں تم مشرک نہ ہو جانا. یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور گروہوں میں بٹ گئے. پھر کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر گروہ اپنے اپنے مسلک میں مگن ہو کر بیٹھ گیا." حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا منتہیٰ، وحدتِ قانون کی بنیاد پر، تمام نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری بنانا ہے. اس کا ارشاد ہے کہ

نوعِ انسان ایک اُمت

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ۚ (۲/۲۱۳) "تمام نوعِ انسانی ایک قوم ہے." اور یہ بھی ایک مستقل قدر ہے. سو، جو نظام تمام انسانوں کو ایک برادری کے قالب میں ڈھالنے کا پروگرام اپنے سامنے رکھتا ہو، وہ خود اپنے اندر فرقوں اور پارٹیوں کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ اس کے نزدیک انسانوں کی تقسیم کا معیار ایک ہی ہے. یعنی کفر اور ایمان. هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ ۚ (۶۴/۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآنِ کریم کی مستقل اقدار کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے مطابق اپنا معاشرہ متشکّل کر لیں، وہ ایک قوم کے افراد. اور جو اس کے خلاف، انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے مطابق، زندگی بسر کریں وہ دوسری قوم کے افراد.

معیارِ قومیت. مستقل قدر

قومیت کا یہ معیار بھی ایک مستقل قدر کی حیثیت رکھتا ہے. اور قرآنِ کریم کے دوسرے اصولوں کی طرح غیر متبدل ہے. اور جب قرآنِ کریم کی رُو سے تمام مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں تو وہ امت میں فرقوں اور پارٹیوں کے وجود کو کس طرح تسلیم کر سکتا ہے؟ قرآنی نظام، وحدتِ قانون اور وحدتِ امّت کی بنیادوں پر متشکّل ہوتا ہے.

میں نے جو اُوپر کہا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے معیارِ قومیت یہ ہے کہ جو لوگ قرآنِ کریم کی متعیّن کردہ مستقل اقدار کو اپنا نصب العینِ حیات قرار دے لیں وہ ایک قوم کے افراد. جو اس سے انکار کریں وہ دوسری قوم کے افراد ـــــــ تو اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ جس طرح آج ہر قوم اپنے اپنے مفاد کے تحفظ میں سرگرمِ تگ و تاز رہتی ہے اور اسے نہ صرف یہ کہ دوسری اقوام کے مفاد کا کوئی خیال نہیں ہوتا بلکہ اگر کسی دوسری قوم کا مفاد اس کے مفاد سے ٹکرائے تو وہ اپنے فائدے کی

خاطر دوسروں کے نقصان کی قطعاً پرواہ نہیں کرتی۔ اسی طرح قرآنی معاشرہ میں بھی ہوگا۔ قطعاً نہیں۔ قرآنی معاشرہ میں تمام لوگ "فرزندانِ آدم" تسلیم کئے جائیں گے اور ان تمام حقوق و مراعات کے مستحق ہوں گے جو مستقل اقدار کی رُو سے ہر فرزندِ آدم کو (بطور استحقاق) ملتی ہیں۔ قرآنِ کریم اس

دشمن سے بھی عدل

باب میں یہاں تک کہتا ہے کہ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ (۵/۸) "کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی چیز قرآنی طرزِ زندگی سے قریب ہے۔"

عدل ہی نہیں بلکہ یہ لوگ قرآنی نظام کی تمام نفع بخشیوں میں حصہ دار ہوں گے۔ اس لئے کہ

تمام نوعِ انسانی کی نفع بخشی

قرآن کریم کی ایک بنیادی مستقل قدر یہ بھی ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۭ (۱۳/۱۷) بقا اور دوام اسی کے لئے ہے جو تمام عالمِ انسانیت کے لئے نفع بخش ہے۔

"النّاس" میں اپنے اور پرائے، مومن و کافر، سب شامل ہیں۔ قرآنِ کریم کا خدا ——— ربّ العالمین ہے۔ اس کا رسول ——— رحمۃ للعالمین۔ اور خود قرآن ——— ذکر للعالمین

اس لئے اسلامی مملکت کی نفع بخشیاں تمام نوعِ انسانی کے لئے ہیں۔

یہ ہے سلیم! اسلامی آئیڈیالوجی کا مختصر سا تعارف۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(الف) اسلامک آئیڈیالوجی ان مستقل اقدار یا غیر متبدّل اصولوں کے مجموعہ کا نام ہے جو اپنی مکمل شکل میں قرآنِ کریم میں محفوظ ہیں۔

(ب) جب کوئی مملکت ان اقدار کو اپنا نصب العین قرار دے لے تو اسے اسلامی مملکت کہتے ہیں اور

(ج) جو دستاویز اس کے اس نصب العین کا اعلان کرے اور مملکت کی عمارت کو ان اقدار کی بنیادوں پر استوار کرنے کا نقشہ مرتب کرکے دے اسے اسلامی آئین کہیں گے۔

۲۔ اسلامی آئین کی عمارت اس بنیاد پر استوار ہوتی ہے کہ

(۱) انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی

ذات کہتے ہیں۔

(ب) اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کے جسم کی پرورش کے لئے طبیعی ضروریات کی ذمہ دار ہو اور ان کی ذات کے ارتقاء کے لئے ایسے سامان و ذرائع فراہم کرے جن سے ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما ہوتی جائے۔

(ج) اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برار ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اسباب و ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہیں۔

۳۔ انسانی ذات کی نشوونما ان مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے جو قرآنِ کریم میں محفوظ ہیں۔ اس لئے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرے۔

۴۔ مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی ذات میں صفات خداوندی کی (حدودِ بشریت کے اندر) نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت میں' افراد اور مملکت' دونوں صفاتِ خداوندی کے مظہر ہوتے ہیں۔

(۵) مستقل اقدار کی رُو سے

(ا) ہر انسان' بحیثیت انسان' واجب التکریم ہے۔

(ب) کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اطاعت ہر ایک کو قوانینِ خداوندی کی کرنی ہوتی ہے جو قرآن میں مذکور ہیں۔

(ج) ہر فرد پوری پوری محنت کرکے کمائی کرتا ہے لیکن اس میں سے اپنے لئے صرف اپنی ضروریات کے مطابق رکھتا ہے۔ باقی سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیتا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

(د) ہر ایک سے عدل کیا جاتا ہے (حتیٰ کہ دشمن سے بھی) اور جن افراد میں کسی وجہ سے کوئی کمی رہ جائے اس کمی کو پورا کردیا جاتا ہے۔

(س) تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری سمجھا جاتا ہے اور اسلامی مملکت کے نظامِ ربوبیت میں ہر انسان کا برابر کا حصہ ہوتا ہے۔

(س) اسلامی مملکت، مستقل اقدار کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین، ملّت کی مشاورت سے، خود مرتّب کرتی ہے. ان جزئی قوانین میں حسبِ ضرورت تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن مستقل اقدار اپنی جگہ غیر متبدّل رہتی ہیں. اس طرح ثبات اور تغیّر کے حسین امتزاج سے معاشرہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے.

یہ ہیں سلیم! اسلامک آئیڈیالوجی کے نمایاں خط و خال. کہو! اب تو نہیں بھولو گے؟

اچھا خدا حافظ! والسلام

اگست ۱۹۵۹ء　　　پرویز

اکتالیسواں خط

قرآن کا سیاسی نظام

باب اوّل ـــــ انسان نے کیا سوچا؟

جب انسانوں نے مل جُل کر رہنا شروع کیا تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اس ٹکراؤ سے باہمی تنازعات پیدا ہوئے۔ اس سے اس ضرورت کا احساس بیدار ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے یہ ٹکراؤ پیدا نہ ہو۔ اور اگر ٹکراؤ پیدا ہوجائے تو باہمی کشمکش اور تنازعات کا فیصلہ عمدگی سے ہوجائے تاکہ معاشرہ فساد اور جنگ وجدل سے محفوظ رہے۔ اس سے نظامِ سیاست کے تصوّر کی ابتدا ہوئی۔ ابتدا ہوئی تو اس ضرورت کے تحت، لیکن جن لوگوں نے جھگڑے نپٹانے اور فیصلے کرانے کا کام اپنے ذمّہ لیا، انہوں نے محسوس کیا کہ دوسروں سے اپنا حکم منوانے میں بڑی لذّت ملتی ہے۔ اس لئے انہوں نے ایسی تدابیر سوچنی شروع کیں جن سے ان کے ہاتھ میں آیا ہوا اقتدار چھننے نہ پائے۔ اس سے معاشرہ میں دو طبقے پیدا ہوگئے۔ ایک طبقہ وہ جو دوسروں سے اپنا حکم منواتا تھا اور دوسرا وہ جو ان کا حکم مانتا تھا۔ بعض اوقات حکمران طبقہ

حاکم ومحکوم کی کشمکش

سے اس کا اقتدار اور اختیار چھیننے کے لئے کوئی دوسرا فریق کھڑا ہوجاتا۔ آپ غور کیجئے تو انسانیت کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی داستان نظر آئے گی۔ یعنی

(۱) حکمران طبقہ کی کوشش کہ ان کے اقتدار واختیار کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی

جائیں۔

(ii) فریقِ مقابل کی خواہش کہ وہ اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے۔

(iii) محکوم طبقہ کی سرکشی اور حکمران طبقہ کی کوشش کہ انہیں دبا کر رکھا جائے۔

(iv) اور اربابِ فکر وبصیرت کی یہ کاوش کہ ایسی کون سی تدبیر کی جائے جس سے معاشرہ میں سیاسی نظام بھی قائم رہے اور حاکم و محکوم میں کشمکش بھی نہ پیدا ہونے پائے۔

قبل اس کے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم نے اس مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان کے اہم ٹکڑوں کو سامنے لایا جائے۔ اور یہ بھی دیکھا جائے کہ اربابِ فکر وبصیرت نے اس باب میں کیا کیا کوششیں اور کاوشیں کی ہیں۔

شروع شروع میں انسان قبائلی زندگی بسر کرتا تھا۔ یعنی ایک خاندان کے افراد مل جُل کر رہتے تھے۔ اسے ان کا قبیلہ کہا جاتا تھا۔ قبیلہ کا بزرگ، واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے باہمی نزاعات کے فیصلے کرنے کا فریضہ اسی کا ذمہ تھا۔ اس کا فیصلہ ہر ایک کے لئے واجب الاتباع تھا۔ رفتہ رفتہ ان "بزرگانِ خاندان" کے

قبائلی نظامِ حکومت

دل میں بھی جذبۂ حکومت نے انگڑائیاں لینی شروع کر دیں اور وہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے اور پائیدار بنانے کی تدابیر سوچنے لگے۔ اس لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے"۔ یا (سعدی کے الفاظ میں) "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"۔۔۔۔۔ اسلاف کی پرستش ۔۔۔۔۔ (ANCESTRAL WORSHIP) اسی عقیدہ کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔

انسان کی ابتدائی زندگی میں مذہبی پیشواؤں PRIESTS کو بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ (اب بھی جہاں جہاں جہالت اور توہم پرستی کا دَور دَورہ ہے، مذہبی پیشواؤں کی پرستش ہوتی ہے) وہ فوق الفطرت قوتوں کے حامل اور دیوتاؤں کی اولاد یا ان کے نائب تصوّر کئے جاتے تھے۔ ہر شخص ان سے ڈرتا اور کانپتا تھا اور ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی کا تصور تک بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا۔

خداوندی اختیارات کا عقیدہ

ان مذہبی پیشواؤں نے عوام کی اس عقیدت مندی کا فائدہ اٹھایا اور اپنے دائرۂ اقتدار کو، پرستش گاہوں کی چار دیواری سے آگے بڑھا کر، دنیاوی حکومت کے ایوانوں تک لے گئے۔ اس کے لئے انہوں نے

یہ عقیدہ وضع کیا کہ وہ خداوندی اختیارات DIVINE RIGHTS کے حامل ہیں یعنی انہیں خدا نے حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے احکام خود خدا کے احکام ہیں۔ ان کی اطاعت، خدا کی اطاعت اور ان کی معصیت، خدا کی معصیت ہے جس کی سزا اس دنیا میں عبرتناک عذاب ہے اور اگلی دنیا میں جہنم کی عقوبت۔ جب دوسرے حکمرانوں (بادشاہ وغیرہ) نے دیکھا کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرانے کا یہ طریقہ بڑا آسان اور نہایت کامیاب ہے۔ اس لئے کہ اس میں جسموں کے بجائے دلوں اور روحوں پر حکومت ہوتی ہے، جس کے لئے نہ کسی پولیس کی ضرورت پڑتی ہے، نہ فوج کی حاجت۔ تو انہوں نے مذہبی پیشواؤں سے گٹھ جوڑ پیدا کر لیا۔ اس طرح، راجہ ایشور کا اوتار اور بادشاہ ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار پا گیا اور وہ اپنے احکام و فرامین کو خدا کے احکام کی حیثیت سے منوانے لگا۔ (انسانوں کے خودساختہ) مذہب نے حکومت کی اس شکل کو بڑی تقویت پہنچائی ہے اور

تھیاکریسی

ان "خدائی فوجداروں" کے ہاتھوں نوعِ انسانی پر جس قدر مظالم، خدا کے نام پر ہوئے ہیں، شیطان بیچارے کے حصے میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ اس نظامِ سیاست کو تھیاکریسی کہتے ہیں جسے عیسائیت نے خاص طور پر فروغ دیا تھا۔ وائی کونٹ سیموئیل، عیسائیت پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

> اس نے بادشاہوں کے آسمانی حقوق کے عقیدہ کی تائید کی۔ اس لئے یورپ کی تاریخ میں اس عقیدہ نے جس قدر تباہیاں پھیلائیں ان کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔ BELIEF AND ACTION (صفحہ ۲۹)

یہ تو تھا مختلف تدابیر سے اپنے اقتدار کو قائم رکھنا۔ اس کے برعکس، ایسا بھی ہوا کہ کسی قبیلہ یا قوم میں جو شخص سب سے زیادہ جسمانی قوت رکھتا تھا، یا جس نے سب سے زیادہ مادی قوت فراہم کر لی، اس نے باقیوں کو دبا کر اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ذرا غور کرنے سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ حکومت کا یہ نظریہ شروع سے آج تک مسلسل کارفرما چلا آرہا ہے۔ اسلوب

جس کی لاٹھی اُس کی بھینس

و انداز اور اسباب و ذرائع میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن "اصول" ہر جگہ یہی کارفرما ہوتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"۔ انسان کے عہدِ جہالت و بربریت میں بھی یہی ہوتا تھا اور آج زمانہ

تہذیب و تمدّن میں بھی یہی ہو رہا ہے۔

جب اُن اربابِ فکر و نظر نے، جو حالات پر گہری نظر رکھتے تھے، یہ دیکھا کہ معاشرہ کے اجتماعی نظام کی ضرورت کس مقصد کے لئے پیش آئی تھی اور اس سے فائدہ کیا حاصل کیا جا رہا ہے، تو انہوں نے اس نظام کو (اپنی دانست کے مطابق) صحیح خطوط پر متشکّل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ افرادِ معاشرہ کو باہمی رضامندی سے یہ طے کرنا چاہیئے کہ مملکت میں افراد کے حقوق و فرائض کیا ہوں گے اور حکومت کے

نظریۂ میثاق

فرائض اور واجبات کیا؟ فریقین کے ان طے شدہ حقوق و واجبات کی توثیق ایک معاہدہ کی رُو سے ہو جانی چاہیئے۔ اس نظریہ کو THEORY OF CONTRACT سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ قدیم یونان سے چلا آرہا تھا لیکن اٹھارویں صدی (عیسوی) میں، اسے یورپ میں ہابز HOBBES لاک LOCKE اور روسو ROSSEAU نے خاص طور پر فروغ دیا۔ موجودہ ڈیماکریسی (جمہوریت) کی بنیاد اسی نظریہ پر ہے یعنی لوگوں کی باہمی رضامندی سے حکومت۔"

نظامِ سیاست کے سلسلہ میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاملات کا آخری فیصلہ کس

اقتدارِ اعلیٰ

کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ اسے اقتدارِ اعلیٰ یا SOVEREIGNTY کہتے ہیں۔ جب زمامِ اقتدار مذہبی پیشواؤں یا بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی تو اس وقت یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ (ہمارے زمانے میں، بادشاہوں کی جگہ ڈکٹیٹروں نے لے لی ہے اس لئے ان کی حکومت میں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا)۔ مذہبی پیشوا، بادشاہ یا ڈکٹیٹر، خود مقتدرِ اعلیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن جب اندازِ حکومت جمہوری قرار پایا، تو اس وقت اس سوال نے اہمیت اختیار کر لی۔ روسو کے نزدیک "اقتدارِ اعلیٰ" مملکت کے تمام باشندوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ لیکن لاک کے خیال میں یہ اقتدار افراد کی اکثریت کے پاس ہونا چاہیئے۔ بنتھم بھی لاک کا ہمنوا ہے ڈیماکریسی نے اسی اصول کو اختیار کیا ہے۔ اس کے برعکس، مارکس کا نظریہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ اُس طبقہ کو حاصل ہوتا ہے جس کے پاس وسائلِ پیدا وار ہوں۔ نظامِ سرمایہ داری میں سرمایہ دار طبقہ کو۔ اشتراکی نظام میں مزدوروں کو۔ ہمارے دَور میں جمہوری نظریہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اکثر متمدّن قومیں اس کی حامل ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس نظریہ کی بنا حسبِ ذیل مفروضات پر ہے۔

جمہوری نظام (i) اس اندازِ حکومت میں حاکم و محکوم کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اس میں "عوام کی حکومت، عوام کے مفاد کی خاطر، عوام ہی کی وساطت سے" کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ یعنی

GOVERNMENT OF THE PEOPLE, BY THE PEOPLE, FOR THE PEOPLE

(ii) عوام کا منشا ان کے نمائندگان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔

(iii) کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ان نمائندگان کی کثرتِ رائے ہوتا ہے۔

(iv) اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے ہوتے ہیں۔

یہ وہ نظامِ حکومت ہے جس پر انسان اپنے مدت العمر کے تجارب کے بعد پہنچا ہے اور مغربی مفکرین کے نزدیک اس نظام سے بہتر نظام کا تصور ناممکن ہے۔ اس نظام کو آیۂ رحمت اور ضامنِ ہزار برکات و سعادت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تائید کرنے والوں کو حق و صداقت کے شاہد اور نوعِ انسان کے ہمدرد و بہی خواہ اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو انسانیت کا مجرم خیال کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ مغرب کے عملی تجربے نے اس نظامِ حکومت کو فی الواقع ایسا ثابت کیا ہے یا وہاں کے مفکرین و مدبرین کسی اور نتیجے تک پہنچے ہیں؟ ان مفکرین و مدبرین سے مراد، ان ممالک کے اربابِ فکر و سیاست ہیں جہاں جمہوری نظام قائم ہے۔

کچھ عرصہ ہوا لندن یونیورسٹی کے پروفیسر الفریڈ کوبن ALFRED COBBAN نے ایک عمدہ کتاب لکھی جس کا نام ہے THE CRISIS OF CIVILISATION وہ اس کتاب میں تہذیبِ مغرب کے زوال کے اسباب پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ ان میں سب سے بڑا سبب ان کا جمہوری نظام ہے۔ (جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے) اس نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ اس میں "حاکم اور محکوم" میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ پروفیسر کوبن اس مفروضہ کے متعلق لکھتا ہے۔

جمہوریت کی ناکامی اگر سیاست کو، نظری حیثیت سے نہیں بلکہ، عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصور کرنا عملی ناممکنات میں سے ہے۔ عملاً حکومت افراد کے ایک طبقہ پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا افراد کے دوسرے طبقہ کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی ابتدائی قبائلی

زندگی سے ذرا آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں مملکت میں بدترین قسم کی آزادی اختیارات پیدا کر دیتا ہے[1]۔
(صفحہ ۶۸)

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر A-C- EWING نے ۱۹۴۷ء میں ایک کتاب بہ عنوان THE INDIVIDUAL, THE STATE AND THE WORLD GOVERNMENT شائع کی تھی جس میں اس نے ڈیماکریسی کے متعلق بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ بحث کے دوران وہ کہتا ہے کہ روسو نے یہ سمجھا تھا کہ نظامِ جمہوریت میں استبداد یا غصبِ حقوق کا خطرہ نہیں ہوگا کیونکہ لوگ خود اپنے اوپر آپ ظلم نہیں کریں گے۔ لیکن

اگر روسو عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔ (صفحہ ۱۱۴)

فرانسیسی مفکر رینی گوئن RENE GUENN اس باب میں لکھتا ہے۔

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے۔ جو کبھی نہ پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی .... حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقاضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں .... عام رائے دہندگی UNIVERSAL SUFFRAGE کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ (اس اصول کی رُو سے) سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے

[1] اس مقالہ کے اقتباسات میں نے اپنی کتاب "انسان نے کیا سوچا" سے لئے ہیں۔

وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر لگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے۔

(THE CREISES OF THE MODERN WORLD P. 106)

آگے بڑھنے سے پہلے اس حقیقت کا ایک بار پھر سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ مفکرین جمہوری نظام کی جس خرابی پر اس شد و مد سے تنقید کر رہے ہیں اس نظریہ کا یہ مفروضہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ (یعنی قانون سازی کا لامحدود اور غیر مشروط حق) عوام کو حاصل ہے اور عوام کا یہ حق ان کے نمائندوں کی اکثریت کی وساطت سے بروئے کار آتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس نظریہ کی رُو سے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ملک کے نمائندگان کی اکثریت جو قانون بنائے وہ ملک کے تمام افراد کا متفقہ فیصلہ ہوتا ہے اور بہرحال میں حق و صداقت پر مبنی۔ ان مفکرین کے نزدیک، یہ اس نظریہ کی بنیادی کمزوری ہے اور تباہی کا باعث۔

اس ضمن میں پروفیسر H L MENCKEN اپنی کتاب TREATISE ON RIGHT AND WRONG میں لکھتا ہے۔

سب سے بڑی ناکامی تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقع محیّر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں۔ لیکن جب انہیں عملاً بروئے کار لانے کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پبلک کے خدام ہیں۔ لیکن عملاً دیکھئے تو حکومت اپنا فریضہ پبلک کی خدمت نہیں بلکہ سلب و نہب سمجھتی ہے...... اس

باب میں مختلف اسالیبِ حکومت میں سب سے زیادہ ناکام جمہوری نظام رہا ہے
جمہوری نظام کے اربابِ حل و عقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت
پر ہونی چاہیئے لیکن ان کا جذبۂ محرکہ کبھی معقولیت پسندی نہیں ہوتا۔ ان کا کام
یہ ہوتا ہے کہ جو عنصر بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے اس کا ساتھ دیا جائے۔
چنانچہ اس ہتھکنڈے سے وہ ان لوگوں کی وساطت سے جو فی الحقیقت پبلک کے
دشمن ہوتے ہیں، لامحدود عرصہ تک برسرِاقتدار رہتے ہیں۔ (صفحہ ۲۲۴)

۱۹۴۷ء میں، اقوامِ متحدہ کی ثقافتی مجلس UNESCO نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی تھی کہ وہ جمہوری طرزِ حکومت کے متعلق سائنٹفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے دنیا

کی تحقیق

بھر کے مفکرین و مدبرین سے جمہوریت سے متعلق مقالات حاصل کئے۔ اور انہیں ایک کتابی شکل میں شائع کر دیا جس کا نام DEMOCRACY IN THE WORLD OF TENSION ہے۔ اس کمیٹی نے سب سے پہلے یہ سوال پوچھا تھا کہ ڈیماکریسی کا مفہوم کیا ہے۔ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا ہے کہ یہ لفظ بالکل مبہم ہے۔ آج تک اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "دورِ حاضر میں لفظ جمہوریت سے زیادہ مہمل لفظ کوئی اور ہے ہی نہیں" (صفحہ ۴۶۰)۔ اس کے بعد اس رپورٹ میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ

یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے اور اس کے خلاف
احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟

اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ

یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔
اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے خلاف ایجی ٹیشن کرے اور
اکثریت کے فیصلے کو بدلوا دے۔ (صفحہ ۵۰۴)

سابقہ صفحات میں ہم نے جمہوریت کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ مقصود نہیں کہ دنیا میں اس

وقت جو مختلف نظامہائے حکومت رائج ہیں، ہمارے نزدیک ان میں سے کوئی اور نظام، جمہوریت کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ بالکل نہیں۔ جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسانی فکر نے اپنی ساری تاریخ میں جو نظام سب سے بہتر تجویز کیا تھا، تجربہ نے اس کے متعلق بھی یہ بتایا ہے کہ وہ بڑا ہی ناکام رہا ہے۔ دنیا کے دیگر نظامہائے سیاست کی طرح، اس نظام کی بنیادی خرابی بھی یہ ہے کہ اس میں حق اور باطل، غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے مستقل PERMANENT خارجی OBJECTIVE اور مطلق ABSOLUTE معیار کوئی نہیں۔ اس میں عوام کے نمائندگان کی اکثریت کا فیصلہ قانون بن جاتا ہے جس کی اطاعت ہر ایک پر واجب ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے اگر غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے کوئی مستقل، خارجی معیار نہ ہو اور قوم کے نمائندوں کی اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بن جائیں، تو اس سے کیا نقصان ہوتا ہے؟ یہ سوال واقعی غور طلب ہے، بالخصوص اس لئے کہ ایک سیکولر حکومت

اس سے کیا نقصان ہوتا ہے؟

اور قرآنی نظامِ مملکت میں بنیادی طور پر یہی مقامِ افتراق POINT OF DEPARTURE ہے۔ سب سے پہلے اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ قوم کے عام افراد ہوں یا ان کے نمائندے۔ نمائندوں کی اکثریت ہو یا اقلیت۔ یہ ہوں گے تو بالآخر انسان ہی۔ اور جو کمزوری ایک انسان میں ہو سکتی ہے وہ انسانوں کے گروہ میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ باور کرنا ناممکن ہے، اور جو ایسا فرض کر لیتا ہے وہ اپنے آپ کو فریب دیتا ہے کہ نمائندوں کی اکثریت ان امیال و عواطف اور کشش و جاذبیت سے مبرّیٰ ہو جائے گی جو ایک انسان کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دیتی ہے۔ لارڈ سنل LORD SNELL کے الفاظ میں۔

> حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوں گی اور ہر انسان میں وہ کمزوریاں پائی جائیں گی جو نوعِ انسان کا خاصہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قوانین وضع کرتے ہیں اور ملک کی پالیسی کی تشکیل کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی زیادہ شریف یا زیادہ ہوشمند نہیں ہو سکتے۔ (THE NEW WORD P. 17)

آلڈوس ہکسلے ALDOUS HUXLEY اس باب میں لکھتا ہے۔

> تاریخ میں کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا جو یہ بتائے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوت و

اقتدار آیا ہو اس میں سرکشی نہ پیدا ہو گئی ہو۔ اور ایسا باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ جو کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آیا ہے وہ آج نہیں ہو گا۔ یا آئندہ بھی ایسا نہیں ہوتا رہے گا۔

(SCIENCE LIBERTY AND PEACE P.41)

اس لئے اگر اکثریت کو بھی بلا حدود و قیود چھوڑ دیا جائے تو اس کے ہاتھوں دوسرے انسانوں کے حقوق کبھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہ کچھ تو ہو گا اپنے ملک کے اندر رہنے والے انسانوں کے ساتھ۔ جہاں تک دوسرے ملکوں کے انسانوں کا تعلق ہے، انہیں انسان ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ اس وقت دُنیا کے باشندے مختلف قوموں NATIONS میں بٹے ہوئے ہیں۔ نیشنلزم، بحیثیت ایک سیاسی عقیدے کے، دورِ حاضر کی پیداوار ہے۔ یا کم از کم یوں کہیئے کہ اس زمانے میں اسے خاص طور پر فروغ حاصل ہوا ہے اور مغرب کو اس پر بڑا ناز ہے۔ لیکن نیشنلزم کے عملی تجربہ کے بعد، خود مغرب کے مفکرین جس

نیشنلزم کی تباہ کاریاں

نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ اب راز کی بات نہیں رہی۔ پروفیسر کوبن جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس باب میں لکھتا ہے۔

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حقِ خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے تو پھر ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے حقِ خود اختیاری کی مدعی ہوں۔
>
> (THE CRISTIS OF CIVILISATION P. 166)

تاریخِ قومیت کا عالم FRDRICK HERTZ اپنی کتاب NATIONALITY IN HISTORY AND POLITICS میں لکھتا ہے۔

> تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنہوں نے اپنے اپنے الگ نام رکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ (مثلاً) ایک انگریز کے دل میں کسی فرانسیسی یا ہسپانوی یا اطالوی کا نام نفرت اور حقارت کا خیال پیدا کر دیتا ہے۔ (صفحہ ۳۲۸)

برٹرینڈرسل، اپنی کتاب THE HOPES FOR A CHANGING WORLD میں لکھتا ہے۔

ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوعِ انسانی کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

(جیساکہ پہلے کہا جاچکا ہے) ہمارے زمانے میں نیشنلزم کی حیثیت ایک سیاسی نظریہ کی ہی نہیں رہی۔ اس نے ایک عقیدے کی صورت اختیار کرلی ہے۔ آلڈوس ہکسلے کے الفاظ میں:۔

نیشنلزم ایک بُت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب، فلاح و وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔

(THE PERENNIAL PHILOSPHY P-P 184 AND 203)

نیشنلزم کے مذہب بن جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیت پرستی PATRIOTISM سب سے

حُبّ الوطنی کا جذبہ

بڑی نیکی اور جذبۂ حُبّ الوطنی سب سے بلند جوہر قرار پاچکا ہے۔ اس مذہب کا "کلمہ" یہ ہے کہ

MY COUNTRY-RIGHT OR WRONG "میرا ملک حق پر ہو یا باطل پر، میں بہرحال اس کا ساتھ دوں گا۔" ROMELINE کے الفاظ میں:۔

مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفظ اور اپنی قوت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اس صورت میں رکھنا چاہیئے جبکہ اس سے اس کے اپنے مفاد کے خلاف زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدم ہے اور اس لئے ہر قربانی جائز۔

(QUOTED BY MURRAY IN THE AINDIVIDUAL AND THE STATE P. 216)

یہی وجہ ہے کہ وال پول نے کہا تھا کہ

نیک آدمی کبھی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے۔

(QUOTED BY SUSAN STEBBINGS IN IDEALS AND ILLUSIONS P. 14)

اور لارڈ گرے کا عقیدہ تھا کہ "سلطنتوں کے معاملات اخلاقی ضابطوں کی رُو سے طے نہیں پایا کرتے۔" (ایضاً صفحہ ۱۳)۔ یہی وجہ ہے کہ، پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں، اب دنیا میں

پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانتدار، رحم دل اور قابلِ اعتماد ہیں، ان کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاہدہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کرگزرنا کارِ ثواب ہے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصوّر کرتے تھے۔

GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS P. 730)

اسی حقیقت کو اٹلی کے مدبّر COVOUR نے سمٹا کر ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔

(FOREIGN AFFAIRS-YEAR 1952)

ماحصل مبحث جو کچھ ہم نے سابقہ صفحات میں لکھا ہے، اسے مختصر الفاظ میں دہرانا چاہیں تو بات یوں سامنے آتی ہے کہ

۱۔ انسانوں نے مل جل کر رہنا ہے۔

۲۔ مل جُل کر رہنے سے ان کے مفاد میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور ٹکراؤ سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ اس مقصد کے لئے کہ مختلف افراد کے مفاد میں ٹکراؤ نہ ہو اور اگر ٹکراؤ ہو تو اس سے جھگڑے پیدا نہ ہوں، سیاسی نظام کا تصوّر پیدا ہو۔

۴۔ انسانی فکر نے آج تک جس قدر سیاسی نظام وضع کئے ہیں ان میں کوئی بھی اس مقصد کے لئے کامیاب ثابت نہیں ہوا۔

۵۔ ان نظاموں میں آخری نظام قومی جمہوریت ہے۔ لیکن یہ نظام بھی بری طرح ناکام ثابت ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ اوّل تو اس سے ملک کے اندر مختلف پارٹیوں میں باہمی کشمکش رہتی ہے اور دوسرے مختلف ملکوں اور قوموں میں نفرت اور رقابت کے جذبات دنیا کو جہنم بنائے رکھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ انسانی فکر نے ان مشکلات کا بھی کوئی حل سوچا ہے؟ اور اگر سوچا ہے تو وہ کیا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے راستے میں کیا موانع ہیں؟

مفکّرین مغرب کیسا نظام چاہتے ہیں؟

ہم نے دیکھا یہ ہے کہ نظامِ جمہوریت کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں "اقتدارِ اعلیٰ" عوام کے ہاتھ میں سمجھا جاتا ہے اور عوام کے نمائندوں کی اکثریت کے فیصلے حرفِ آخر تصوّر کئے جاتے ہیں۔ اس نظریہ پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر کوبن لکھتا ہے۔

> عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریہ کی تائید میں روایتی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا تو قوّت سے قائم کی جائے گی یا باہمی رضامندی سے۔ اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوّت صحیح کہہ دے وہ صحیح ہو' اس لئے یہی درست ہے کہ حکومت کو باہمی رضامندی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر صحیح ہے' نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ .... فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔ روسو کہتا ہے کہ منشائے عمومی GENERAL WILL

اخلاقی معیار

> ہمیشہ صحیح ہو گا ورنہ وہ منشائے عمومی کہلا نہیں سکے گا۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر اکثریت اور اقلیت کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ (جب منشائے عمومی' اس وقت منشائے عمومی کہلا سکے گا' جب وہ صحیح بات کہے تو پھر یوں کیوں نہ کہا جائے کہ جو بات اخلاقی معیار کے مطابق صحیح ہے وہی صداقت

ہے (خواہ اس کی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ اٹھے)۔ (صفحہ ۷۶)
پروفیسر کوبن کا مطلب یہ ہے کہ کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار "اخلاقی بنیادیں" ہیں، نہ کہ اکثریت کے فیصلے. حقیقت یہ ہے کہ جب لاک نے جمہوریت کا نظریہ پیش کیا تھا تو اس کے پیش نظر بھی ایک "ابدی قانون" کا عملی نفاذ تھا جسے وہ "قانونِ فطرت" سے تعبیر کرتا تھا. چنانچہ اس باب میں اس نے کہا تھا کہ

> کسی حکومت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کرتی رہے. قانونِ فطرت وہ ابدی قانون ہے جو تمام انسانوں پر یکساں طور پر منطبق ہوتا ہے. خواہ وہ قانون ساز ہوں یا قانون کے متبع.

(CF. MABBOTH-THE STATE AND THE CITIZEN P. 25)

قانونِ فطرت

لاک کے نزدیک قانونِ فطرت خدا کا بنایا ہوا ہے اور انسان اس کے ماتحت اُس وقت بھی رہا کرتے تھے جب وہ تہذیب و تمدن کے نام سے ناآشنا تھے اور "نیچر" کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے. اس وقت لوگ عقل REASON سے کام لیتے تھے، جذبات سے نہیں. لیکن بعد میں جب لوگ جذبات کے پیچھے لگ گئے تو ان کی زندگی قانونِ فطرت کے مطابق نہ رہی. اب اسی قانون کی بازیابی اور اس کی عملی تنفیذ انسانی معاشرہ کا فریضہ ہے. لیکن اتنا کچھ لکھنے کے بعد، لاک یہ کہتا ہے کہ یہ قانون اکثریت کی منشاء سے مل سکتا ہے.

آپ نے دیکھا کہ یہ اتنا بڑا مفکر، کس طرح گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح، ایک ہی نقطہ کے گرد ناکام چکر کاٹ رہا ہے؟ وہ انسانی فیصلوں کی غلطیوں اور مفاد پرستوں کی چیرہ دستیوں سے گھبرا کر پکار اُٹھتا ہے کہ "کسی حکومت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کرتی رہے. اسے فطرت

لاک کی غلطی

کے ابدی قانون کا پابند رہنا ہوگا." اور اس سے جب پوچھا جاتا ہے کہ فطرت کا وہ ابدی قانون کہاں سے ملے گا تو اسے اس کے سوا کچھ اور نہیں سُوجھتا کہ " یہ قانون اکثریت کے فیصلوں میں ملے گا." بارش سے بچنے کے لئے پرنالے کے نیچے پناہ لینا اسے ہی کہتے ہیں. لیکن یہ لوگ ہیں بھی سچے.

تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

بہر حال، ہم کہہ رہے تھے کہ اب مغرب کے مفکرین اس حقیقت کا احساس کر رہے ہیں کہ جمہوری نظام میں اکثریت کے فیصلوں کو بہر حال و بہر کیف صحیح سمجھنا غلط ہے۔ کسی فیصلہ کے صحیح یا غلط ہونے کے لئے کسی خارجی معیار کی ضرورت ہے۔ لاک کے نزدیک، یہ خارجی معیار "قانونِ فطرت" ہے۔ پروفیسر کوبن اسے "اخلاقی معیار" سے تعبیر کرتا ہے۔ مشہور اطالوی مدبر، میزینی MASSENI نے اس باب میں کہا تھا۔

> اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں، جس میں وحدتِ عقائد نہ ہو، جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو یا زیادہ، بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کون سی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے؟ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو، جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے۔ خواہ اس کا نام بوناپارٹ رکھ لیں یا انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانۂ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔......... یاد رکھئے جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کو رائج اور نافذ کرنے کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر رہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں، بلکہ فریضہ ہے کہ تم ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

خدا کا قانون

QUOTED BY GRIFFTHIN INTERPRETTERS OF MAN P. 46)

یعنی میزینی کے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار، قوانینِ خداوندی ہونے چاہئیں، جن کا نافذ کرنا حکومت کا

فریضہ قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ قوانینِ خداوندی مذہب کے ہاں سے مل سکتے ہیں۔ لیکن یورپ میں جو مذہب (عیسائیت) رائج ہے، پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں، اس کی حالت یہ ہے کہ

قوانینِ خداوندی عیسائیت سے نہیں مل سکتے

عیسائیت کی رُو سے زندگی کا حقیقی مسکن یہ دنیا نہیں بلکہ آنے والی دنیا ہے۔ اُخروی دنیا خیرِ محض کی مظہر ہے۔ اس کے برعکس یہ دنیا شر و فساد کی دنیا ہے۔ اُس دنیا کی حیات ابدی ہے۔ یہ دنیا محض عبوری حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کے لئے یہ دنیا اگلی دنیا کے لئے تیاری کا مقام ہے۔ اس دنیا میں کوئی شے بالکلیہ خیر اور طیّب نہیں۔ یہاں جو کچھ نظر آتا ہے اسی صورت میں اچھا ہے جبکہ وہ ان نعمتوں کے حصول کا ذریعہ بن سکے جن کا وعدہ اگلی دنیا میں کیا گیا ہے۔

GUIDE TO THE PHILOSPHY OF MORALS AND POLITICS P. 127

ہسپانوی پروفیسر DR. FALTA DE GARCIA اس باب میں لکھتا ہے۔

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصوّرِ اخلاق سے یکسر باہر کی چیز ہے ...... عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی رُوح سے یکسر بےحس ہے۔

QUOTED BY BRIFFAULT IN THE MAKING OF HUMANITY P. 334

مشہور مفکّر، پروفیسر وہائٹ ہیڈ لکھتا ہے کہ

انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اسے اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

ADVENTURE OF IDEAS P. 18

انہی حقائق کے پیشِ نظر، تہذیب کا مشہور (امریکی) مؤرخ DORSEP اپنی کتاب CIVILISATION میں لکھتا ہے۔

آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے۔ وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعترافِ شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی شے قابلِ اطمینان

نہیں۔" اطمینان کی آرزو باطل اور باطل کی آرزوؤں کی تکمیل گناہ ہے"۔ یہ اندازِ نگاہ، صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ (صفحہ ۴۴۶)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مذہب سے کبھی وہ خدائی قوانین نہیں مل سکتے تھے جنہیں میز ینی نے صحیح اور غلط کا ناقابلِ تغیّر معیار قرار دیا تھا۔ اب یورپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اپنی مشکل کے حل کے لئے کسی اور دروازے پر دستک دے۔ یہ دروازہ مجلس اقوامِ متحدہ (U-N-O) کا تھا جس

منشورِ حقوقِ انسانیت

نے "انسانیت کے بنیادی حقوق" کے متعلق تحقیق و تعین کے لئے ایک کمیشن بٹھایا اور اس کمیشن کی سفارشات کے مطابق، ۱۹۴۸ء میں "منشورِ حقوقِ انسانیت" DECLARATION OF HUMAN RIGHTS شائع کیا۔ اس میں ان حقوق کی فہرست دی گئی جو اقوامِ متحدہ کے نزدیک ہر حکومت میں، ہر افرادِ انسانیہ کو حاصل ہونے چاہئیں۔ اقوامِ متحدہ کے اس کارنامے کو عصرِ حاضر کی بہت بڑی کامیابی اور کامرانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں کی ڈھارس بندھ سکتی تھی کہ اسے کسی طرح کچھ حقوق کی مستقل ضمانت تو ملی۔ لیکن اس کی یہ توقع بھی غلط نکلی۔ ابھی مذکورہ صدر منشور زیرِ ترتیب ہی تھا کہ (UNESCO) (یعنی انجمن اقوامِ متحدہ ہی کے ایک ادارہ) نے دنیا کے مشہور اربابِ فکر و نظر کے پاس ایک سوالنامہ بھیجا کہ وہ ان حقوق کے متعلق اپنی آرا سے مطلع کریں۔ ان کے جوابات، مسٹر JACQUES MARITIAIN کے تعارف کے ساتھ، ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کئے گئے تھے۔ ان حقوق کی حیثیت کے متعلق، سب سے پہلے خود مسٹر میری ٹین لکھتے ہیں۔

یہ حقوق بھی غیر متبدّل نہیں

یہ حقیقت بدیہی ہے کہ یہ تمام حقوق، انسانی حقوق ہیں۔ اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عائد کی جائیں اور انہیں قابلِ ترمیم و تبدیل قرار دیا جائے۔ (صفحہ ۱۰)

اس کے بعد ماڈرن کوارٹلی لندن کا ایڈیٹر JOHN LEWIS اپنے مقالہ کی ابتدا ان الفاظ سے کرتا ہے۔

اس حقیقت کو اب ہر جگہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ حقوقِ انسانی کے متعلق یہ تصور، کہ یہ حقوق مطلق ہیں اور فطرتِ انسانی کے اندر مضمر ہوتے ہیں اور ان کی ابتدا اس زمانے سے ہوتی ہے۔ جب انسان نے ہنوز معاشرہ کی طرح بھی نہیں ڈالی تھی ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ (صفحہ ۵۱)

شکاگو یونیورسٹی کا پروفیسر GERARD لکھتا ہے۔

انسانی حقوق صرف اس کوشش کا نام ہیں کہ انسان اور اس کے معاشرہ کے باہمی تعلقات کو متعین کر دیا جائے۔ یہ حقوق نہ تو مطلق ہوتے ہیں نہ ایسے کہ انہیں ہمیشہ ناقابلِ تغیّر و تبدّل قرار دیا جائے۔ (صفحہ ۲۰)

یعنی جو کچھ اتنی کاوشوں اور کوششوں کے بعد انسان کو ملا، اس کے متعلق بھی اسے اطمینان نہیں کہ آئے وہ مستقل طور پر ملتا رہے گا۔ اور اس میں کسی قسم کا تغیّر و تبدّل نہیں ہوگا۔ حقوق کے تحفّظ کے متعلق مسٹر MARITAIN نے لکھا ہے۔

انسانیّت کے حقوق کی تعریف نہیں بلکہ۔ روز مرّہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقتدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے۔ حقوقِ انسانیت کے احترام کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصوّر مشترک ہو۔ اسی کو "فلسفۂ زندگی" کہتے ہیں۔ (صفحہ ۱۷)

اسی حقیقت کو پروفیسر جوڈ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

مستقل اقدار کی تلاش

اچھی زندگی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان مستقل اقدار کو حاصل کر سکے۔ بنا بریں میں کہہ سکتا ہوں کہ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ایک انسان کے لئے مستقل اقدار کا حصول ممکن ہو جائے۔ سوسائٹی کی ترقی کا یہی ایک پیمانہ ہے۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS P. 806)

یعنی بات سمٹ سمٹا کر یہاں پہنچی کہ انسانی معاشرہ کی اس مشکل کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانوں

کے باہمی معاملات مستقل اقدار کے مطابق طے ہوں اور یہی اقدار غلط اور صحیح کا معیار قرار پائیں. یہ ہے وہ آخری منزل جس تک انسان اپنے ہزاروں سال کے ناکام تجارب کے بعد پہنچا ہے. لیکن اس منزل میں پہنچ کر بھی انسان ششدر و حیران کھڑا ہے. کیونکہ اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ مستقل اقدار ملیں گی کہاں سے؟ وہ اپنے ذہن سے کچھ اقدار متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں. لیکن ایک کی تردید دوسرا کر دیتا ہے.

انسان کو اس مقام پر چھوڑ کر اب دیکھئے کہ خدا اس باب میں کیا کہتا ہے.

باب دوم

خدا نے کیا کہا

قرآن کریم اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اگر انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اس کی تمدنی زندگی ناممکن ہو جائے. اس لئے کہ انسان بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے (وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ اَکۡثَرَ شَیۡءٍ جَدَلًا ۱۸/۵۴). یہ بڑا بے صبرا ہے.

انسان کیسا واقع ہوا ہے؟

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ۷۰/۱۹) تنگ نظر ہے (وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ قَتُوۡرًا ۱۷/۱۰۰) جلد باز ہے (کَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا ۱۷/۱۱). مال و دولت کی محبت میں بڑا متشدد ہے (وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ ۱۰۰/۸). چاہتا ہے کہ دنیا بھر کی دولت اسی کے پاس سمٹ کر آجائے (وَ تُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا ۸۹/۲۰). وہ دولت سمیٹتا چلا جائے اور پھر اسے گرہ میں باندھ کر رکھ لے (وَ جَمَعَ فَاَوۡعٰی ۷۰/۱۸) اور اسے اس طرح روک کر بیٹھ جائے کہ یہ کسی اور تک نہ پہنچنے پائے (وَ اِذَا مَسَّهُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعًا ۷۰/۲۱). واضح رہے کہ جب قرآن کریم، انسان کے متعلق یہ کچھ کہتا ہے تو اس سے اس کی مراد یہ نہیں کہ انسان کی فطرت بد واقع ہوئی ہے. قطعاً نہیں. (انسان کی فطرت کوئی نہیں. یہ سادہ لوح لے کر آتا ہے). اصل یہ ہے کہ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہر ذی حیات کا طبعی جذبہ ہے. ہر جاندار زندہ اور باقی رہنے

انسان بدفطرت نہیں

کے لئے انتہائی جدّوجہد کرتا ہے۔ انسان کے علاوہ جتنے ذی حیات ہیں، فطرت نے ان کی جدّوجہد کا دائرہ خود محدود کر دیا ہے۔ اسے ان کی جبلّت INSTINCT کہتے ہیں۔ کسی جاندار کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنے اس دائرہ سے باہر نکل سکے۔ اس لئے حیوانات کی دنیا میں فساد انگیزی نہیں ہوتی۔ لیکن انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے وہ اپنے جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ اسی لئے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔ جنہیں نپٹانے کے لئے نظامِ سیاست کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

سابقہ باب میں ہم نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں کے سپرد "جھگڑے" نپٹانے کا کام کیا جاتا ہے وہ اپنے آپ کو حاکم سمجھ لیتے ہیں اور دوسروں کو محکوم۔ اس کے بعد اقتدار کی لذّت انہیں مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنی حکومت کی گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جائیں۔ اور ایسے اقدامات کریں جن سے حکومت ان کے ہاتھوں سے کبھی چھننے نہ پائے۔ قرآن کریم نے ایک انسان پر دوسرے انسان کی حکومت کے تصوّر کو باطل قرار دینے کے لئے اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) "ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو (یکساں طور پر) واجب التکریم پیدا کیا ہے" اس لئے کسی

کسی انسان کو حکومت کا حق نہیں

انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو حاکم اور دوسروں کو محکوم سمجھے۔ اور اس طرح اوروں سے اپنا حکم منوائے۔ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْکِتٰبَ وَ الْحُکْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... (۳/۷۹) "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین، فیصلہ کرنے کی قوّت اور نبوّت (تک) بھی عطا کر دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم، خدا کو چھوڑ کر، میرے محکوم بن جاؤ .... لہٰذا پہلی بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم، انسانوں کو حقِ حکومت دیتا ہی نہیں، خواہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ نظامِ حکومت کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔ وہ اس کی ضرورت سمجھتا ہے۔ بلکہ اسے لازمی قرار دیتا ہے۔ لیکن کہتا یہ ہے کہ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ

حقِّ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے

حکومت صرف اللہ کی ہو سکتی ہے۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ. یہی نظامِ زندگی سیدھا اور متوازن ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۴۰) "لیکن انسانوں کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی"۔ خدا اپنے اس حقِ حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا (لَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)۔

لیکن خدا تو ایک مجرّد حقیقت ABSTRACT REALITY ہے۔ اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں، نہ اس کی آواز سُن سکتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنے معاملات کے فیصلے اس سے کس طرح کرا سکتے ہیں؟ ہم اس کی محکومیت کس طرح اختیار کر سکتے ہیں؟

خُدا کی حکومت کتابُ اللہ کی رُو سے

اس کے لئے اس نے بتا دیا کہ یہ فیصلے اُس ضابطۂ قوانین (کتاب اللہ) کی رُو سے کئے جائیں گے جسے اس نے رسول اللہ پر نازل کیا تھا۔ اس ضمن میں خود نبیِ اکرمؐ کی زبان سے کہلوا دیا کہ

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ...... (۶/۱۱۵)

کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم چاہوں، حالانکہ اس نے ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

لہٰذا خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان قوانین کی اطاعت کی جائے جنہیں اس نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے۔ ان قوانین کے سوا کسی کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ اس کے متعلق خود خدا نے کہہ دیا کہ

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (۷/۳)

تم سب اس کا اتباع کرو جو تمہارے ربّ نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اور اس کے سوا کسی سرپرست کا اتباع مت کرو۔ (لیکن) تھوڑے ہیں جو اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔

لیکن کتاب کے اندر لکھے ہوئے قوانین محض نظری THEORETICAL حیثیت رکھتے ہیں اور متنازعہ فیہ امور میں کبھی فیصلہ نہیں کرسکتے جب تک انہیں عملاً نافذ کرنے والی کوئی اتھارٹی موجود نہ ہو.

زندہ اتھارٹی

قرآن کریم نے سب سے پہلے خود رسول اللہ کو ایسی اتھارٹی قرار دیا (اور ظاہر ہے کہ حضورؐ کی موجودگی میں کوئی اور اتھارٹی ہو نہیں سکتی تھی) اور آپؐ کی اطاعت کو خود خدا کی اطاعت قرار دے دیا۔ (وَ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهُ ۴/۸۰)۔ جس نے رسُولؐ کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ اور اس نظام کی اہمیت کو ان الفاظ میں اجاگر کر دیا کہ

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (۴/۶۵)

تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ کبھی ایمان والے نہیں ہوسکتے جب تک یہ اپنے ہر متنازعہ فیہ معاملہ میں (اے رسولؐ!) تجھے اپنا ثالث مقرر نہ کریں اور پھر تیرے فیصلے کے خلاف اپنے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں۔ بلکہ اسے اپنے دل کی پوری رضامندی سے قبول کر لیں۔

ایک طرف، جماعتِ مومنین (یعنی مملکتِ اسلامی کے افراد) سے یہ کہا اور دوسری طرف رسول اللہ (یعنی فیصلے دینے والی اتھارٹی) سے تاکید کر دی کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ ان کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کر. وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵/۴۸) جب حق تیرے پاس آچکا ہے تو ان لوگوں کے خیالات کی پیروی مت کر.

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم نے جو نظامِ سیاست متعین کیا ہے، اس کی رُو سے حکومت کی مرکزی اتھارٹی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ

(i) وہ متنازعہ فیہ امور میں لوگوں سے اپنا حکم منوائے۔ یا

(ii) ان قوانین کے خلاف فیصلہ دے جو کتاب اللہ میں مذکور ہیں. بالفاظِ دیگر، اس اتھارٹی کا کام قوانین سازی نہیں، بلکہ قوانینِ خداوندی کا نفاذ ہوتا ہے. اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر اقتدارِ اعلیٰ

SOVEREIGNTY قانون سازی کے آخری اختیار کو کہتے ہیں، تو قرآنی نظامِ سیاست میں اس قسم کا اقتدار، نہ عوام کے منشا GENERAL WILL OF THE PEOPLE کو حاصل ہوتا ہے نہ ہی کسی خاص فرد کو۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے جس کی عملی مظہر اس کی کتاب ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس نظام میں کسی کو خدائی اختیارات DIVINE RIGHTS بھی حاصل نہیں ہوتے۔ اس میں سب سے بڑی اتھارٹی بھی قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتی ہے۔ خدا کے نام پر اپنا حکم نہیں چلاتی۔ چنانچہ خود نبیِ اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہے کہ وَ اتَّبِعْ مَا یُوْحٰیٓ اِلَیْکَ..... (۱۰/۱۰۹) "جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اس کی پیروی کر......" خدائی اختیارات کا تصوّر، قرآنی نظام سے کس قدر دُور ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو کسی نے انہیں خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا۔ اس پر آپ نے اسے فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں، خلیفۃ الرسول ہوں — خود رسولؐ اللہ نے بھی کبھی اپنے آپ کو خلیفۃ اللہ نہیں کہا۔ اسلامی حکومت، قوانینِ خداوندی کو عملاً نافذ کرنے والی اور بندوں کے متعلق جو ذمّہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں انہیں پورا کرنے والی ہوتی ہے۔ خدا کی قائم مقام نہیں ہوتی۔ خدا کی قائمقامی کا تصوّر، تھیاکریسی کا پیدا کردہ ہے جو قرآن کی رُو سے باطل ہے۔

غیر متبدّل اصُول

چونکہ قرآنِ کریم آخری کتاب ہے اور اسے ہمیشہ کے لئے تمام نوعِ انسان کا ضابطۂ حیات قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں (بجز چند مستثنیات) صرف اصولی قوانین دیئے گئے ہیں۔ ان کی جزئیات متعین نہیں کی گئیں۔ ان اصولوں کے متعلق کہہ دیا کہ یہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل رہیں گے۔ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ (۶/۱۱۶) "تیرے ربّ کی بات عدل اور سچائی کی حیثیت سے مکمّل ہوگئی۔ اس کی باتوں (قوانین) کو کوئی بدلنے والا نہیں (اس لئے کہ یہ قوانین معاذ اللہ کسی اندھی قوّت یا بے خبر انسان کے بنائے ہوئے نہیں۔ یہ اس کے متعیّن کردہ ہیں جو) سب کچھ سننے والا اور ہر بات کا جاننے والا ہے۔" ان ہی "کلمات اللہ" (قوانینِ خداوندی کو غیر متبدّل اصُول UN-ALTERABLE PRINCIPLES یا مستقل اقدار PERMANENT VALUES کہتے ہیں۔ ان

میں کوئی ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ کسی پارٹی کی اکیاون فیصد آراء، تو ایک طرف، پوری نوعِ انسانی کی سو فیصدی آراء بھی ان میں کسی قسم کی کمی بیشی یا ردّ و بدل نہیں کر سکتیں۔ انہی غیر متبدّل اصولوں کو حدود اللہ کہا جاتا ہے۔ اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان حدود BOUNDRY LINES کے اندر رہتے ہوئے، افرادِ مملکت کے مشورے سے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئی احکام مرتّب کرے۔ یہی وہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی کے لئے رسول اللہ سے کہا گیا کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) معاملاتِ مملکت میں

مشاورتی نظام

اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کر۔" قرآنِ کریم اس مشاورت کی کوئی خاص شکل تجویز نہیں کرتا۔ اس کے لئے اسلامی مملکت، اپنے زمانے کے تقاضے اور اپنے حالات کے مطابق، جس قسم کا انتظام مناسب سمجھے تجویز کرلے۔ قرآنِ کریم کا مقصد صرف مشاورت سے ہے مشاورتی مشینری سے نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی نظامِ سیاست میں قوانین سازی کے اختیارات، قرآنِ کریم میں بیان کردہ غیر متبدّل اصولوں کی چار دیواری کے اندر محدود ہوں گے۔ یہ چار دیواری غیر متغیّر رہے گی اور اس کے اندر امّت کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق اپنے لئے خود جزئیات متعیّن کرے۔

اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس نظام میں نہ تو انسانوں کو ایسے غیر محدود اختیارات دیئے گئے ہیں کہ وہ اپنی من مانی کر سکیں اور نہ ہی ان کی آزادی کو اس طرح سلب کر لیا گیا ہے کہ وہ اپنے معاملات کے متعلق کچھ سوچ ہی نہ سکیں۔ اس نظام میں اُمّت کی حیثیت فٹ بال کے میدان میں ٹیم کی سی ہوتی ہے کہ وہ میدان کی چار دیواری BOUDRY LINE کے اندر رہتے ہوئے پوری آزادی کے ساتھ کھیل کھیلیں اور باہمی تعاون سے زندگی کے بال کو اس کے گول (نصب العین) تک لے جائیں۔ یہ ہے قرآنی جمہوریت کا صحیح تصوّر۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، یہ نظام سب سے پہلے نبیِ اکرمؐ نے متشکّل فرمایا۔ لیکن چونکہ یہ کوئی عارضی نظام نہیں تھا بلکہ اسے تمام نوعِ انسان کے لئے ہمیشہ کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ اس لئے قرآنِ کریم نے اس کی صراحت کردی کہ یہ نبیِ اکرمؐ کی وفات کے ساتھ ختم نہیں ہو جائے گا۔ سورہ آلِ عمرانؑ میں ہے۔

رسول اللہ کی وفات کے بعد

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انْقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤى اَعۡقَابِكُمۡ ؕ (۳/۱۴۴)

محمدؐ بجز ایں نیست کہ اللہ کا پیغامبر ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو گذرے ہیں۔ سو اگر یہ (کل کو) وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم پھر اپنی قدیمی روش کی طرف لوٹ جاؤ گے؟

چنانچہ اُمت سے کہہ دیا گیا کہ تم رسول اللہ کی وفات کے بعد، اس نظام کو اسی طرح آگے بڑھاتے چلے جانا۔ یعنی قرآن کی متعین کردہ غیر متبدّل حدود کے اندر رہتے ہوئے، باہمی مشاورت سے، جزئیات کا تعیّن کرتے ہوئے۔ اسی نظام کی حامل اُمت کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (۴۲/۳۸)۔

اسلامی جمہوریت

ان کا نظامِ حکومت باہمی مشورہ سے طے پاتا ہے۔ اسی کا نام اسلامی جمہوریت ہے۔ اس جمہوریت میں،

(i) نہ تو مغربی ڈیماکریسی کے مطلق اختیارات ہیں، جس میں کوئی اصول غیر متغیر اور کوئی قدر مستقل نہیں۔ اس میں برسرِ اقتدار پارٹی کی اکثریت جو قوانین چاہے بنائے۔ جب جی چاہے ان میں ردّ و بدل کر دے اور جس وقت چاہے منسوخ کر دے۔

(ii) نہ ہی اس میں ملوکیت یا ڈکٹیٹرشپ ہے کہ ایک فرد قوت کے زور پر ہر ایک سے اپنا حکم منواتا چلا جائے۔

(iii) نہ ہی اس میں تھیاکریسی ہے کہ کسی فرد یا جماعت کو خدائی اختیارات کا حامل سمجھا جائے اس میں مذہبی پیشواؤں کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ اور

(iv) نہ ہی اس میں یہودی شریعت کی سی جکڑ بندی ہے کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملہ کے لئے بھی غیر متبدّل، ابدی قانون موجود ہو اور اُس "لوہے کے جوتے" سے پاؤں باہر نکالا ہی نہ جاسکے۔

مستقل ضمانت

اس نظامِ سیاست میں ہر فردِ انسانیہ کو ایسے مستقل حقوق حاصل ہوتے ہیں جنہیں کوئی تبدیل یا منسوخ نہیں کرسکتا۔ حکومتیں قائم ہوتی

رہیں اور بدلتی رہیں۔ افراد آتے رہیں اور جاتے رہیں۔ لیکن اس مملکت میں بسنے والے شہریوں کو (خواہ وہ غیر مسلم ہوں یا مسلم) جو حقوق خدا کی طرف سے مل چکے ہیں، ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ کتنی بڑی ہے یہ ضمانت جو کسی مملکت میں افرادِ انسانیہ کو حاصل ہو اور کتنا بڑا ہے وہ اطمینان جو اس ضمانت سے میسر آئے۔ سب سے بڑا اطمینان یہ کہ اس میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہو گا۔ اس کے لئے اس مملکت کا ہر شہری اربابِ بست و کشاد کی طرف سے بار بار یہ اعلان سنے گا کہ

کلمۂ شہادت کے معنی!

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ۔ میں اس کی شہادت دیتا ہوں۔ میں دنیا کو پکار کر سنائے دیتا ہوں کہ دنیا میں خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اس کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں کہ کسی انسان سے اپنا حکم منوائے۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں۔

اس میں اگر کوئی اور شریک ہو سکتا تھا تو خدا کا رسولؐ ہو سکتا تھا، جس سے بلند تر ہستی کا تصور بھی ذہنِ انسانی میں نہیں آ سکتا۔ لیکن!

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

میں اس کی بھی شہادت دیتا ہوں۔ دنیا کو پکار کر سنائے دیتا ہوں کہ محمدؐ بھی خدا کا عبد (بندہ۔ محکوم) اور اس کا پیغامبر ہے۔

اور جب دنیائے انسانیت کی بلند ترین ہستیؐ کی یہ پوزیشن ہے تو کسی دوسرے انسان کو اس کا حق کب حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ انسانوں کو اپنا محکوم بنائے۔ نہ رسول اللہؐ نے کسی انسان کو اپنا محکوم بنایا۔ نہ ہم کسی انسان کو اپنا محکوم بنا سکتے ہیں۔ حضورؐ نے خود بھی احکامِ خداوندی کی اطاعت کی اور دوسروں سے بھی انہی احکام کی اطاعت کرائی۔ آپؐ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں ہمارا فریضہ بھی یہی ہے کہ ہم خدا کے قوانین کی خود بھی اطاعت کریں اور دوسروں سے بھی انہی احکام کی اطاعت کرائیں۔

لوگ اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ اسلامک آئیڈیالوجی کیا ہے؟ ایک فقرہ میں اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کی آئیڈیالوجی ہے اس کا کلمۂ طیبہ۔ یعنی اس امر کا اعلان کہ اطاعت و محکومیت صرف قوانینِ

خداوندی کی ہے۔ اور کسی کی نہیں۔

وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (۶/۱۶۴)

اس مقام پر یقیناً تمہارے دل میں یہ آرزو پیدا ہو گی کہ اُن اصولوں کا تعارف کرایا جائے جنہیں قرآنِ کریم غیر متبدّل قرار دیتا ہے اور ان اقدار کو سامنے لایا جائے جنہیں وہ مستقل اور مطلق PERMANENT AND ABSOLUTE ٹھہراتا ہے اور جن کے نفاذ کے لئے اسلامی مملکت وجود میں آتی ہے۔ ان اقدار کی فہرست طویل ہے جسے ضمناً پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چیز ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتی ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن اس غرض کے لئے کہ ان اقدار کا کچھ نہ کچھ تصور IDEA ذہن میں آجائے، ہم یہاں (تمثیلاً) دو چار کا ذکر کئے دیتے ہیں۔

پہلی مستقل قدر — تکریم آدمیت

سب سے پہلی قدر تو یہی ہے کہ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے، یکساں طور پر واجب التکریم ہے۔ اس میں رنگ، نسل، زبان، ملک، قوم، مذہب، حسب، نسب، امارت، افلاس وغیرہ کی کوئی تمیز نہیں۔ ہر انسان، بحیثیت انسان، عزت کا مستحق اور تعظیم کا سزاوار ہے۔ اس اصول کے بنیادی قدر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی مملکت نہ کوئی ایسا قانون بنا سکتی ہے اور نہ معاشرہ میں ایسا نظریہ رائج ہونے دے سکتی۔ جس کی رُو سے کوئی انسان (پیدائشی یا پیشہ وغیرہ کی) اضافی نسبتوں سے شریف یا ذلیل تصوّر کیا جائے۔ معاشرہ میں عزت کے مدارج، جوہرِ ذاتی کے مطابق متعیّن ہوں گے۔ (وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ (۴۶/۱۹))۔

۲۔ تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب العزت سمجھنا۔ ہر ایک کے لئے اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع مہیّا کرنا اور سعی و عمل کے لحاظ سے ان کے مقامات و مدارج کا تعیّن کرنا۔ کسی کے حقوق و واجبات DUES کو سلب نہ کرنا اور تمام امور کے فیصلے قانون کے مطابق کرنا، جو سب پر یکساں طور پر نافذ ہو، عدل کہلاتا ہے۔ یہ

دوسری مستقل قدر — عدل

قرآنِ کریم کی رُو سے دوسری مستقل قدر ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ...... (۱۶/۹۰) "اللہ عدل کا حکم دیتا ہے۔" اسلامی مملکت

عدل کا راستہ کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتی۔

۳۔ بعض اوقات (مثلاً کسی پیدائشی نقص یا حادثات کی وجہ سے) ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص کی کسی استعداد میں مستقل طور پر کمی واقع ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ دیگر ہم عصر افراد سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس کی اس کمی کو پورا کرنا احسان کہلاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے جہاں عدل کا حکم دیا ہے وہاں

تیسری مستقل قدر — احسان

احسان کو بھی ایک غیر متبدّل اصول قرار دیا ہے۔ چنانچہ جو آیت پہلے درج کی گئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ۔ اللہ عدل کے ساتھ احسان کا بھی حکم دیتا ہے۔ احسان کے معنی ہیں حسن قائم رکھنا۔ توازن برقرار رکھنا۔

چوتھی مستقل قدر — دشمن سے عدل

۴۔ عدل کے متعلق قرآن کریم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ یہ صرف "اپنوں" کے ساتھ ہی نہیں کیا جائے گا۔ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل کیا جائے گا۔ ارشاد ہے۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۵/۸) "کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہر حال میں عدل کرو۔ یہ روش تقوے سے زیادہ قریب ہے۔" یہ بھی قرآن کریم کی رُو سے ایک مستقل قدر ہے۔

۵۔ عدل کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری خود اٹھائے اور ہر شخص اپنے اعمال کے لئے خود جواب دہ ہو۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے کہا کہ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ (۶/۱۶۴)

پانچویں مستقل قدر — اپنا بوجھ آپ اُٹھاؤ

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔" یہ قرآن کا بڑا جامع اصول ہے جس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبہ پر ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ایک مستقل قدر ہے جس میں کبھی تغیر و تبدّل نہیں ہو سکتا۔

۶۔ ہم پہلے یہ بتا چکے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ یہ بھی ایک غیر متبدّل اصول ہے۔ ہر ایک کو قانون کی اطاعت کرنی ہوگی لیکن کوئی بھی ایسا قانون وضع نہیں کیا جا سکے گا جو خدا کی مقرر کی ہوئی مستقل اقدار

سے ٹکراتے۔

مستقل اقدار کے مطابق حکومت قائم کرنا کسی ایک فرد یا پارٹی کا کام نہیں ہوگا۔ اس میں پوری کی پوری امت شامل ہوگی۔ اس مقصد کے لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ .... (۳/۱۱۰) "تم ایک بہترین قوم ہو جسے تمام نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے باہر لایا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم سب قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے کا حکم دو اور قانون کی خلاف درزی سے روکو۔" اس سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسلامی حکومت تمام افراد کی مشترکہ امانت ہوگی۔ اور دوسرے یہ کہ اُس اُمت کی ہستی کی وجہِ جواز JUSTIFICATION FOR EXISTENCE یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں نوعِ انسانی کی بھلائی ہو۔

چھٹی مستقل قدر ــ نظم و نسق میں ہر ایک شریک ہوگا

۷۔ حکومت چلانے کا فریضہ تو تمام اُمت کا مشترکہ ہوگا لیکن اس کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ امورِ نظم و نسق صرف ان لوگوں کے سپرد کئے جائیں جو ان کے اہل ہوں۔ اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهۡلِهَا ...... (۴/۵۸)

ساتویں مستقل قدر ــ امانت نا اہلوں کے سپرد نہ کرو

"اللہ تمہیں اس امر کا تاکیدی حکم دیتا ہے کہ تم امانات کو ان لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں۔" یہ بھی ایک مستقل قدر ہے جس میں تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا۔

۸۔ قرآنِ کریم کی رُو سے اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے اور انہیں اس کی ضمانت دے کہ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَ اِيَّاهُمۡ (۶/۱۵۲) "ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔"

آٹھویں مستقل قدر ــ رزق کی ذمہ داری

یہ بھی ایک بنیادی حق ہے جو تمام افرادِ مملکت کو یکساں طور پر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی مملکت میں بدنظمی یا بے انصافی کی وجہ سے ایک فرد بھی بھوکا رہ جائے تو وہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

۹- یہ ظاہر ہے کہ اس نظامِ سیاست کی ابتدا کسی ایک خطۂ زمین سے ہوگی جس کی حفاظت

حُبُّ الوطنی کا جذبہ

تمام افرادِ مملکت کا اوّلین فریضہ ہوگا۔ اس حد تک ملک کی خیر سگالی ایک مستحسن جذبہ TATRIOTIOSM قرار پائے گا لیکن قرآن کریم کا منتہیٰ یہ ہے کہ اس نظام کو تمام عالمِ انسانیت تک پھیلا دیا جائے۔ اس لئے کہ اس کی رُو سے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳)۔ "تمام انسان اُمّتِ واحدہ ہیں"۔ اس کا مستقل اصول ہے۔ لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس نظام کو اس

عالمگیر انسانی برادری

طرح پھیلایا جائے کہ نوعِ انسانی اس کے خوشگوار نتائج کو دیکھ کر خود بخود اسے اختیار کرتی چلی جائے۔ وہ اسے جبراً کسی سے نہیں

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

منوانا چاہتا۔ اس لئے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲/۲۵۶) "دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں کی جا سکتی"۔ اس کی طرف سے پیش کردہ مستقل اصول ہے۔ جو لوگ اس نظامِ زندگی کو اپناتے چلے جائیں گے، وہ ایک اُمّت کے فرد بنتے جائیں گے۔ جو اس کے خلاف کوئی دوسرا نظام تجویز اور اختیار کریں گے وہ دوسری قوم کے

قومیّت کی تشکیل۔ آیڈیالوجی کی رُو سے

افراد ہوں گے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے قومیّت کی تشکیل کا یہ معیار (یعنی آیڈیالوجی) بھی ایک مستقل اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح وہ چاہتا ہے کہ تمام انسان رفتہ رفتہ ایک قانون کے تابع آکر وحدتِ انسانیّت کی زندگی بسر کریں۔ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی یہی وہ شکل ہے جسے عملی پیکر میں دیکھنے کے لئے مغرب کے مفکّرین اور مدبّرین اس قدر آرزومند ہیں۔ چنانچہ پروفیسر کوبن اپنی اس کتاب کے آخری باب میں (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) لکھتا ہے۔

> دنیا کے مصائب کا جو حل سامنے آ رہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے۔ (صفحہ ۲۲۵)

مسٹر EMERY REVES جس نے THE ANATOMY OF PEACE کے عنوان سے ایک مختصر لیکن بڑی جامع اور فکر انگیز کتاب شائع کی ہے، کہتا ہے۔

> ہم انٹرنیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں۔ جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ

عالمگیر نظام

کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے)۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کر سکے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔ (صفحہ ۱۶۴)

مسٹر REVES دوسرے مقام پر لکھتا ہے۔

کھلے کھلے الفاظ میں، بیسویں صدی کی قیامت خیزیوں کے بعد، انسان لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کرۂ ارض کو کسی ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ہے۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح جمہوری انداز سے اس اقتدارِ واحد کی تشکیل کریں۔ اس کے لئے اسے ان بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا چاہیئے جن پر یہ اقتدار متشکل ہوگا۔ اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاہیئے تاکہ یہ مقصد خوں ریزی کے بغیر حل ہو جائے۔ اگر اس مقصد کا حصول اس طرح ممکن نہ ہوا تو پھر تاریخ کا فولادی ہاتھ مجبور کر دے گا کہ ہم اندھا خونریزی کریں اور آج سے زیادہ مہلک آلاتِ حرب و ضرب وضع کریں تاکہ سب سے زیادہ طاقتور جماعت باقی دنیا کو مغلوب کر کے وحدتِ اقتدار قائم کر لے۔ (صفحہ ۲۳۳)

جس "اقتدارِ واحد" کے لئے مسٹر REVES کا دل اس قدر مضطرب و بے قرار ہے (اور دنیا کے ہر دلِ دردمند کو ایسا ہونا چاہیئے) اس کا اعلان آج سے چودہ سو سال پہلے قرآنِ کریم نے "لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ" کے انقلاب آفرین پیغام کے ذریعے کر دیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، اس (کلمۂ توحید) کے معنی ہی یہ ہیں کہ تمام نوعِ انسانی کو واحد اقتدار کے تابع زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اور وہ "اقتدارِ واحد" کسی انسان

اقتدارِ واحد

یا انسانوں کی جماعت کا نہیں بلکہ خدا کا ہو سکتا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر سمجھایا کہ بتاؤ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ

اَلْقَهَّارُ ○ (۱۲/۳۹)" کیا مختلف اقتدارات بہتر ہیں یا ایک خدا کا اقتدار جو بڑی قوتوں کا مالک ہے؟"
قرآنِ کریم کی رُو سے توحید کے معنی وحدتِ اقتدار کے ہیں۔ اور شرک سے مفہوم ہے متعدد اقتدارات۔
اسی کے لئے اس نے کہا تھا کہ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ (۱۲/۴۰) "خدا نے حکم دیا ہے کہ اس
کے سوا کسی اور کی محکومی اختیار نہ کرو۔" اقتدار صرف اسی کا تسلیم کرو۔ اس کا یہ پیغام تمام نوعِ انسان
کے نام تھا۔ کسی خاص قوم، ملک یا گروہ کے نام نہیں۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ
مِّنْ دِيْنِيْ۔ ان سے کہہ دو اے نوعِ انسان! جو نظامِ زندگی میں لایا ہوں اگر تمہیں اس کے سچا
ہونے میں کوئی شک ہے تو (میں تمہیں مجبور نہیں کرتا کہ تم ضرور اسے اختیار کرو لیکن) فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ
تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ میں تو ان کا اقتدار
تسلیم نہیں کر سکتا جن کا اقتدار تم، خدا کو چھوڑ کر، اختیار کئے
ہو۔ میں تو صرف اسی خدائے واحد کا اقتدار تسلیم کرتا ہوں جس

یہی توحید سے مطلب ہے

کی قوتوں کا یہ عالم ہے کہ تمہاری موت و حیات تک بھی اس کے اقتدار کے تابع ہے۔" وَاُمِرْتُ اَنْ
اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں کے زمرے میں رہوں جو خدا کے
اقتدار پر یقینِ محکم رکھتے ہوں۔" وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ○ (۱۰/۱۰۴-۱۰۵) اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ تو، ہر طرف سے منہ موڑ کر، اسی نظامِ زندگی کو اپنا
نصب العین بنا اور، مختلف اقتدارات کو اختیار کر کے مشرکین میں سے مت ہو جا" ـــ یہی وہ وحدتِ اقتدار
ہے جو اس عالمگیر نظامِ انسانی کی بنیاد بن سکتا ہے، جس کا تصور پروفیسر HAROLD LASKI کے دل
میں کروٹیں لے رہا تھا، جب اس نے کہا تھا کہ

> دنیا میں اس وقت انسانی حالت کا تقاضا یہی ہے کہ ایک عالمگیر نظام کی تشکیل کی
> جائے جس کے ارکین تمام دنیا کے افراد ہوں۔

HUMAN RIGHTS P.91

اور جس کے متعلق مسٹر W-A- GUALD نے اپنی کتاب MAN, NATURE AND TIME میں
لکھا تھا کہ

> مجھے تسلیم ہے کہ "گھر اور وطن" کا خیال سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن ایک

عالمگیر انسانی معاشرہ کی رکنیت کا تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیئے........

ابھی تک اس عالمگیر نظام کا احساس کچھ زیادہ شدّت سے اُبھر کر سامنے نہیں آیا۔ اس لئے اس کے متعلق زیادہ حسنِ ظن قبل از وقت ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت، کہ کم و بیش ہر ملک میں ایسے افراد موجود ہیں جن کے دل میں یہ خیال کروٹیں لے رہا ہے، اس امر کی ضمانت ہے کہ کچھ وقت کے بعد یہ خیال عملی شکل اختیار کر لے گا۔ (صفحہ ۲۸۴ - ۲۸۱)

قرآن کریم کا کہنا ہے کہ ایسا نظام آخر الامر دنیا میں قائم ہو کر رہے گا۔ خوں ریزی سے نہیں بلکہ ذہنی تبدیلی سے، جو زمانے کے تقاضوں سے رفتہ رفتہ ہوتی چلی جا رہی ہے مسٹر REVES کا یہ خیال غلط ہے کہ جدید قسم کے آلاتِ حرب و ضرب سے کوئی ایک قوم، باقی اقوام کو مغلوب کر کے، اپنا اقتدارِ واحد قائم کر لے گی۔ اب جو آلاتِ حرب و ضرب ایجاد ہو رہے ہیں اگر انہیں جنگ میں استعمال کیا گیا تو نہ قومِ غالب باقی رہے گی نہ قومِ مغلوب۔ پوری کی پوری نوعِ انسان تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے وحدتِ انسانیت کا عالمگیر نظام، جو خدا کے اقتدارِ واحد کی بنیادوں پر استوار ہوگا، انسان کی داخلی تبدیلی سے ظہور میں آئے گا۔ یہی قرآن کا بتایا ہوا طریقِ کار PROCESS ہے۔ لیکن اس کا آغاز بہرحال کسی ایک خطۂ زمین سے ہوگا۔ آخر وہ خطۂ زمین پاکستان کیوں نہ ہو؟

اگر ہم نے پاکستان میں قرآنِ کریم کے سیاسی نظام کو رائج کر لیا تو اس سے نہ صرف ہماری مشکلات ہی کا حل مل جائے گا بلکہ ساری دنیا کو اس جہنم سے نجات مل جائے گی جس میں وہ آج اس بُری طرح سے گرفتار ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا احساس ہم سے بھی پہلے مغرب کے مفکرین کے دلوں میں بیدار ہو رہا ہے۔ چنانچہ عصرِ حاضر کا نامور مؤرخ پروفیسر ٹوئن بی A-J- TOYN BEE اپنی کتاب THE WORLD AND THE WEST میں لکھتا ہے:

مغرب میں بعض دوسرے تصوّرات بھی ہیں جن کا باعثِ فوز و فلاح ہونا مشکوک ہے۔ ان میں سے ایک ہماری نیشنلزم ہے۔ ترک اور بعض دوسرے اسلامی

ممالک، نیشنلزم کے تصوّر سے بھی اسی طرح متأثر ہوتے جارہے ہیں جس طرح اور مغربی تصوّرات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ جن مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان بلالحاظِ اختلاف نسل، رنگ، زبان، عادات وغیرہ، محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایسا تنگ نظر عقیدہ رائج ہوگیا تو دنیا کا حشر کیا ہوگا؟ ......

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہوچکی ہے اس میں یورپ کے اندر کم وبیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا۔ (خود) یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا ہے کہ وہ اس کے تصوّراتِ حیات کو آنکھیں بند کئے اپنائے چلے جارہے ہیں۔ ہمیں کم ازکم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے عالمگیر مودّت واخوّت کے تصور کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری کا تصوّر اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے۔ ایک عالمگیر برادری کا تصوّر ویسے تو انسانی فلاح کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے لیکن اس ایٹم کے دَور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہوگئی ہے۔ (صفحہ ۳۱-۳۰)

آپ نے غور فرمایا کہ یہ غیر مسلم مفکّر و مؤرّخ ہمیں کیا کہہ رہا ہے؟ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ ہم تو قومیت پرستی کے عذاب میں ماخوذ ہیں اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی (آسمانی) روشنی نہ تھی جو صحیح راستے کی طرف ہماری رہنمائی کرتی۔ لیکن تمہارے پاس تو (تیرہ سو سال سے) ایک قندیلِ خداوندی روشن تھی جو زندگی کے ہر دوراہے پر تمہاری راہنمائی کرنے کے لئے کافی تھی۔ پھر تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم بھی ہم اندھوں کے پیچھے لگ کر جہنّم کی طرف چل پڑے؟ تمہیں تو ہماری رہنمائی کرنی چاہیئے تھی اور بتانا چاہیئے تھا کہ انسانیت کی نجات وسعادت، آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر عالمگیر برادری کی تشکیل میں ہے، نہ کہ رنگ، نسل، زبان، وطن کے اشتراک سے

قومیت کے تصوّر پر! آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ملّت کی تشکیل، ہمارے لئے کوئی نیا نظریہ نہیں یہ تو دین کے ان اصولوں میں سے ہے جو خدا کی طرف سے اس زمانے سے ملنے شروع ہو گئے تھے۔ جب انسان کو پہلے پہل وحی کی راہنمائی کی ضرورت پڑی تھی۔ یہی وہ تصوّر تھا جس کی رُو سے حضرت نوحؑ کے بیٹے کے متعلق کہہ دیا گیا تھا کہ باپ کے "اھل" میں سے نہیں ہے۔ اسی کے مطابق، حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد (اور ساری قوم سے) کہہ دیا تھا کہ اُن میں اور ان میں بُعد و مغائرت کی وسیع خلیج حائل رہے گی جب تک وہ خدائے واحد کی محکومی تسلیم نہیں کریں گے۔ اسی نظریہ کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کا شمار بے گانوں میں کیا گیا تھا۔ پھر آخر الامر اسی اصول کے مطابق، مکّہ کے رہنے والے قریش، خود نبیِ اکرمؐ کے ہم قبیلہ (بنو ہاشم) بلکہ آپؐ کے قریب ترین رشتہ دار (حقیقی چچا وغیرہ) اشتراکِ رنگ، نسل، زبان، وطن کے باوجود، ایک الگ قوم کے افراد قرار دیئے گئے تھے اور حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ اپنی برادری کے اخوان۔ لیکن آج اُسی دین کے نام لیواؤں کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ کہیں نسل کی بنیادوں پر جداگانہ قومیت کی تشکیل ہو رہی ہے۔ کہیں زبان کے اشتراک سے علیٰحدگی کے دعوے کئے جا رہے ہیں۔ کہیں وطنیّت کی رُو سے قوم ترتیب پا رہی ہے۔ ہم یہ کچھ کر رہے ہیں اور غیر مسلم ہمیں متنبہ کر رہے ہیں کہ تمہاری یہ روش تمہیں تباہیوں کی طرف لے جائے گی۔ تم اپنے ہاں عالمگیر برادری کے اُسی تصوّر کو عام کرو جسے تمہارے دین نے انسانیت کی فوز و فلاح کے لئے تجویز کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ عالمگیر برادری اسی صورت میں قائم ہو سکتی ہے جب تمام مسلم ممالک اپنے ہاں قرآنی نظامِ سیاست رائج کریں۔ لیکن اس کا سب سے زیادہ امکان پاکستان میں ہے۔ اس لئے کہ دوسرے ممالک میں کوئی نہ کوئی نظام پہلے سے رائج ہے۔ لیکن پاکستان نے اپنے لئے کسی نظام کو تجویز کرنا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اس وقت ساری دنیا کی آنکھیں پاکستان کی طرف لگی ہوئی ہیں اور وہ اسے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ!

تماشہ کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

خدا کرے کہ مملکتِ پاکستان دنیا کی اس حسین توقع کو پورا کر دکھائے جو اس نے اس کے ساتھ وابستہ کر رکھی ہے۔[1]

یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو

والسلام
پرویز

[1] یہ کچھ تشکیلِ پاکستان کے ابتدائی ایام میں لکھا گیا تھا۔ (۱۹۸۴ء)

بیالیسواں خط

اسلام آگے کیوں نہ چلا؟

نہیں سلیم! یہ سوال کچھ انوکھا تمہارے ہی دل سے نہیں اُبھرا جو اس کو زبان تک لانے میں تمہیں اس قدر تردّد و تامّل ہوتا۔ یہ تو ہر اس شخص کے ذہن میں پیدا ہو گا جو ہمارے عروج و زوال کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا اور دیکھے گا کہ مسلمان اپنے ابتدائی دَور میں اس تیزی کے ساتھ ساری دنیا پر چھا گئے کہ اس کی نظیر تاریخ کے اوراق میں کہیں نہیں ملتی۔ اور اس کے بعد وہ اس طرح مائل بہ زوال ہوئے کہ پھر ان کے اُبھرنے کی کوئی صورت ہی پیدا نہیں ہوئی۔ تاریخ کے اس مطالعہ کے بعد (جو حقائق پر مبنی ہے) اظہارِ خیال کرنے والوں کے دو گروہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک گروہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے (اور اس کا اظہار بیباکانہ کرتا ہے) کہ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام

دو گروہ

نے عربوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی جس کی بناء پر وہ ایران اور روما کی مملکتوں پر غالب آ گئے اور ساری دنیا میں پھیل گئے۔ لیکن اسلام میں اس کی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتا۔ اس لئے جب زمانہ آگے بڑھا تو اسلام ناکام رہ گیا اور مسلمانوں کا عروج، انحطاط میں بدل گیا۔ اس کے بعد یہ گروہ طنزاً کہتا ہے کہ اب جب کہ زمانہ اس قدر آگے نکل گیا ہے، اسی ناکام تجربے کے دہرانے کی کوشش کرنا حماقت ہے۔ دوسرا گروہ اس قدر بے باکی کی جرأت تو نہیں کرتا لیکن

ﻟ INDIA WINS FREEDOM-BY-M ABDUL KALAM AZAD

اس کے دل میں بھی یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام ایک حقیقتِ ثابتہ تھا اور اس میں فی الواقع یہ صلاحیت تھی کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتا، تو وہ چند قدم چل کر رُک کیوں گیا۔ برابر آگے کیوں نہ بڑھتا گیا؟ یہ خیال ان کے دل میں تعجب اور تشکیک کے ملے جلے جذبات ابھارتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلام کی ابدی صداقت کے متعلق ان کے ایمان میں تزلزل واقع ہو جاتا ہے۔

گر وہ یہ ہو یا وہ، سوال بہرحال ایسا ہے جس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے، اور جس کا اطمینان بخش جواب، غیروں کے اعتراض کے مسکت جواب اور اپنوں کے شبہات کے ازالہ کا موجب ہوگا۔ اس لئے تم نے اچھا کیا کہ اسے بلا تکلف پوچھ کر یہ موقعہ بہم پہنچا دیا کہ میں اپنی بصیرتِ قرآنی کے مطابق اس مشکل عقدہ کو وا کرنے کی کوشش کروں۔ وَمَا تَوْفِيقِيٓ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

اسلام کسے کہتے ہیں؟

سب سے پہلے تو یہ سمجھو سلیم! کہ اسلام کسے کہتے ہیں؟ تمہیں معلوم ہے کہ اس کائنات میں، خدا کے متعین کردہ غیر متبدل، محکم اصول (قوانین) کارفرما ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ عظیم و عجیب اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ کائنات کی ہر شے، ان قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کئے ہے۔ وَلَهٗٓ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۳/۸۳) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے (قوانین کے سامنے) جھکے ہوئے ہیں"۔ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶/۴۹) "یہ کبھی ان قوانین سے سرکشی نہیں برتتے"۔ اسے "کائناتی اسلام" سمجھو۔ اس کے قوانین نہ آج ناکام ثابت ہوئے ہیں، نہ تھک کر کسی مقام پر رُک گئے ہیں یہ برابر آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کا کوئی سقم یا خلفشار نہیں۔ مَا تَرٰى فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷/۳) "تخلیق خداوندی میں تم کوئی جھول نہیں پاؤ گے"۔

جس طرح خدا نے سلسلۂ کائنات کے لئے غیر متبدل قوانین متعین کئے ہیں، اسی طرح اس نے انسانی دنیا کے لئے بھی ایسے محکم اصول اور مستقل اقدار (بذریعہ وحی) عطا کئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے افراد اور اقوام، زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے، آگے بڑھتے اور بلند ہوتے

چلے جاتے ہیں. یعنی انہیں، اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر قسم کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی کامیابیاں اور کامرانیاں. لیکن انسان کو چونکہ (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) مجبور پیدا نہیں کیا گیا، اس لئے اسے اس کا اختیار ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان سے انحراف برت کر، اپنے خود ساختہ مسلک پر گامزن ہو۔ اوّل الذکر راستہ اسے عروج وارتقاء کی طرف لے جائے گا اور ثانی الذکر مسلک، زوال و انحطاط کی طرف۔

خدا کا تجویز کردہ نظامِ زندگی (الدّین یا الاسلام) تمام نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کی ضمانت دیتا ہے اور زمین کے دسترخوان پر بکھری ہوئی نعمائے خداوندی کو ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھتا ہے. لیکن یہ چیز ان لوگوں پر شاق گزرتی ہے جو اپنی قوت کے بل بوتے پر، رزق کے سرچشموں پر قابو پا کر، دوسروں کو ان سے محروم رکھنے اور اس طرح ان سے اپنی من مانی کرانے کی فکر میں رہتے ہیں. اس لئے یہ گروہ نظامِ خداوندی (الاسلام) کی مخالفت کرتا اور اس کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرتا ہے۔

حق و باطل کی کشمکش

قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے حق و باطل کی کشمکش کہتے ہیں. اس سے تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ الاسلام کائنات میں بھی کارفرما ہے اور انسانی دنیا میں بھی اس فرق کے ساتھ کہ کائنات میں اس کی کہیں مخالفت نہیں ہوتی اور انسانوں کی دنیا میں اس کی مزاحمت ہوتی ہے۔

اب آگے بڑھو! تمہیں اس کا علم ہے کہ اگر بیج تندرست و توانا (صالح) ہو اور اسے ضروری سامانِ نشوونما مل جائے تو اس میں سے کونپل پھوٹتی ہے اور آہستہ آہستہ اُوپر کو ابھرتی ایک دن تناور درخت بن جاتی ہے. بالفاظِ دیگر یوں کہا جائے گا کہ اس بیج میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اُوپر کو اُبھرے اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے. جن ابدی قوانین اور مستقل اقدار کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے (اور جن کے مجموعہ کا نام الاسلام ہے) قرآن کریم کہتا ہے کہ ان میں اس امر کی صلاحیت ہے کہ وہ تمام موانعات کو راستے سے ہٹاتے ہوئے اُوپر کو اُبھریں اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ کر رہیں. اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ...... (۳۵/۱۰) "ان خوشگوار نظریاتِ حیات

میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ "خدا کی طرف" اُوپر کو اُٹھتے جائیں، یعنی عروج وارتقاء کی وہ آخری منزل، جسے خدا نے ان کے لئے متعین کیا ہے، اس تک پہنچ کر رہیں۔ دوسرے الفاظ میں، حق میں اس کی صلاحیت اور قوت ہے کہ وہ باطل کا مقابلہ کر کے اسے شکست دے اور اس طرح اپنے راستے پر چلتا جائے۔ قرآنِ کریم اس باب میں کہتا ہے بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ....(۲۱/۱۸)

حق ہمیشہ غالب رہتا ہے

"ہم حق کا باطل پر نشانہ لگاتے رہتے ہیں تو حق باطل کا سر توڑ دیتا ہے اور اس طرح باطل شکست کھا کر بھاگ جاتا ہے۔" باطل راستے سے ہٹ جاتا ہے اور حق پھر اپنی منزل کی طرف رواں دواں چلے جاتا ہے۔

اس مقام پر تمہارے دل میں یقیناً یہ سوال پیدا ہو گا کہ ہمارا مشاہدہ تو اس کے خلاف ہے۔ ہم دیکھتے یہ ہیں کہ دنیا میں باطل کا دَور دَورہ ہے۔ وہی ہر جگہ مسلّط نظر آتا ہے۔ حق کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ظلم، استبداد، قہرمانیت، بددیانتی، دھوکا، فریب، دنیا کے بازار میں انہی کا سکّہ رواں دواں ہے۔ تو پھر ہم کیسے سمجھ لیں کہ یہاں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے اور اس کشمکش میں حق ہمیشہ باطل پر غالب آتا ہے اور باطل خاسر و ناکام میدان چھوڑ جاتا ہے؟ تمہارا یہ شبہ بجا ہے لیکن ایک غلط فہمی پر مبنی۔ اس غلط فہمی کے رفع ہو جانے سے اس شبہ کا ازالہ خود بخود ہو جائے گا۔

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ خدا کے متعین کردہ تصوراتِ حیات میں اس کی صلاحیت تو موجود ہے کہ وہ (اپنے زورِ دروں سے) تمام موانعات کو راستے سے ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جائیں۔ لیکن

اُس کی رفتار سُست ہوتی ہے

ان کی اس طرح آگے بڑھنے کی رفتار (تمہارے اندازوں کے مطابق) بڑی سُست ہے۔

سورۂ سجدہ میں ہے يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ۔ "خدا اپنے امر کی تدبیر سما سے ارض کی طرف کرتا ہے۔" یعنی خدا اپنی مشیّت کے مطابق ایک سکیم تجویز کرتا ہے۔ اس کی یہ تجویز "عالمِ امر" میں ہوتی ہے جو انتہائی بلندیوں پر ہے۔ لیکن، اس سکیم کو عملی تشکیل دینے کے لئے، وہ اس کا آغاز پست ترین سطح سے کرتا ہے۔ جیسے وہ بیج جس میں شاہ بلوط کا تناور

درخت بننے کی صلاحیت ہوتی ہے، پہلے مٹی میں دبایا جاتا ہے۔ اس مقام سے اس شاہ بلوط کی نمود کی ابتداء ہوتی ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ○ (۳۲/۵) "پھر اسکیم اس کی طرف اٹھتی ہے ایک دن میں جس کی مقدار تمہارے حساب وشمار کے مطابق ہزار برس کی ہوتی ہے۔" یعنی خدا کی ہر اسکیم (جو حق پر مبنی ہوتی ہے) اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ کر رہتی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ راستے کے موانعات سے مغلوب ہوکر ناکام یا ناتمام رہ جائے۔ لیکن اس کی ترقی کی یہ رفتار بڑی سست ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ (بظاہر) آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔ یہ تو پھر بھی مجرّد حقائق ABSTRACT TRUTHS کی بات ہے۔ نمود وارتقاء کی رفتار تو محسوس، مادی اشیاء میں بھی ایسی غیر مرئی INVISIBLE اور غیر محسوس IMPERCEPTIBLE ہوتی ہے کہ آنکھ اس کا اندازہ نہیں کرسکتی۔ علم الارتقاء ORGANIC EVOLUTION کے ماہرین بتاتے ہیں کہ کسی ایک نوع SPECIES میں ذرا سی تبدیلی کے لئے لاکھوں برس کی مدت درکار ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ ایک نوع لاکھ برس تک اسی حالت میں رہتی ہے اور پھر اس میں یک لخت تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے۔ نہیں! اس میں یہ تبدیلی بتدریج ہو رہی ہوتی ہے لیکن اس کی رفتار ایسی غیر محسوس ہوتی ہے کہ اس تبدیلی کا احساس تک بھی نہیں ہوسکتا۔ کہیں لاکھوں برس میں جاکر، وہ تبدیلی مشہود شکل میں سامنے آتی ہے۔ یہ ہے "خدائی اسکیم" کی وہ رفتار جس کا ایک ایک دن ہمارے حساب وشمار سے ہزار ہزار برس کا (اور قرآن کریم کے دوسرے مقام (۷۰/۴) کے مطابق، پچاس پچاس ہزار برس کا) ہوتا ہے۔ تم اس سست روی کا اندازہ کرنا چاہو تو کسی پودے کے پاس بیٹھ جاؤ۔ ہفتوں، مہینوں، برسوں، دن رات اس کے پاس رہو۔ وہ اس دوران میں مسلسل آگے بڑھ رہا ہوگا لیکن تمہیں اس کا احساس تک بھی نہ ہونے پائے گا کہ اس میں کوئی تبدیلی واقع ہو رہی ہے — لو! مجھے یاد آگیا۔ پچھلے سال جب تم یہاں تھے تو تمہاری گھڑی کی منٹوں کی سوئی گر گئی تھی اور صرف گھنٹوں کی سوئی رہ گئی تھی۔ دن بھر گھڑی تمہارے سامنے رہتی تھی۔ گھنٹوں کی سوئی ایک سے دو، دو سے تین، تین سے چار تک پہنچ جاتی تھی۔ لیکن تمہیں احساس تک بھی نہیں ہوتا تھا کہ گھڑی چل رہی ہے۔

حق وباطل کی کشمکش میں، حق کا غلبہ اور باطل کی شکست، اس آہستہ خرامی سے ہوتی ہے

جس میں ایک ایک دن کی مدت ہمارے حساب وشمار کے مطابق ہزار سال کی ہوتی ہے۔ ہم تاریخ کے کسی ایک دَور کو لیتے ہیں (جو دس بیس برس پر مشتمل ہوتا ہے) اور دیکھتے ہیں کہ اس میں باطل کا دَور دَورہ ہے۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ غلبہ باطل ہی کا رہتا ہے۔ اگر ہم ہزار سال کی تاریخ کا دقتِ نظر سے مطالعہ کریں تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ جہاں جب، خدا کے متعین کردہ کسی اصول کے ساتھ انسانوں کے خودساختہ نظام کا ٹکراؤ ہوا ہے،

غلبہ حق ہی کا ہوتا ہے

آخر الامر غلبہ خدائی اصول کو ہوا ہے اور انسانی نظام ناکام رہا ہے۔ (اس کی مثالیں ذرا آگے چل کر تمہارے سامنے آئیں گی)۔

چونکہ مسئلہ ذرا مشکل اور بات دقیق ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ اس وقت تک کہا جا چکا ہے اسے مختصر الفاظ میں دہرا دوں۔ میں نے کہا یہ ہے کہ

(۱) اسلام ان غیر متبدّل اصولوں کا مجموعہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے (بذریعہ وحی) عطا کیا ہے تاکہ، اس کے مطابق زندگی بسر کرکے، کاروانِ انسانیت اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔

(۲) مفاد پرست گروہ، اس ضابطۂ خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں اور اس طرح حق اور باطل میں کشمکش کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

(۳) حق میں اس امر کی صلاحیت ہے کہ وہ باطل کو شکست دے کر اپنی منزل کی طرف بڑھتا جائے لیکن!

(۴) اس کی رفتار اتنی سست ہوتی ہے کہ اس کا ایک ایک دن ہمارے حساب وشمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔

لیکن! اس کے ساتھ قرآنِ کریم کچھ اور بھی کہتا ہے، اور وہ اس سلسلہ کی بڑی اہم کڑی ہے۔ سورۂ فاطر کی جو آیت پہلے درج کی جا چکی ہے اس کا اگلا حصہ یوں ہے اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ

اس کی رفتار تیز کی جا سکتی ہے

الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ (۳۵/۱۰) "خوشگوار نظریاتِ زندگی میں اس

کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے نصب العین کی طرف بلند ہوتے جائیں۔ لیکن اگر ان کے ساتھ انسان کے اعمالِ صالح کی تائید بھی شامل ہو جائے تو اس سے انہیں مزید ارتفاع (بلندی) حاصل ہو جاتی ہے۔ اس سے سلیم! بات صاف ہو گئی۔ یعنی قوانینِ خداوندی اپنی عام (سُست) رفتار سے خود بخود چلتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ انسانوں کی کوئی جماعت انہیں اپنے ہاں عملاً نافذ کر کے معاشرہ کو ان کے خطوط پر متشکل کر لے، تو ان کی رفتار بڑی تیز ہو جاتی ہے اور ان کے جو نتائج ہزار ہزار برس میں جا کر ظہور میں آنے تھے، وہ دنوں کے اندر سامنے آ جاتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ عام حالات میں، انسانی معاشرہ میں تبدیلیاں ارتقائی طور پر BY EVOLUTION نمودار ہوتی ہیں لیکن انسانی جماعت کی رفاقت سے یہ تبدیلیاں انقلابی طور پر ظہور میں آجاتی ہیں یا علم الارتقاء کی اصطلاح میں یہ تبدیلیاں فجائی ارتقاء سے BY EMERGENT EVOLUTION نمودار ہوجاتی ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور نکتہ بھی سمجھنے کے قابل ہے۔ جب خدا کے ابدی حقائق اپنی عام رفتار سے جادہ پیما ہوتے ہیں تو ذہنِ انسانی عام طور پر انہیں اپناتا جاتا ہے۔ یعنی اگر ایک تبدیلی نے ہزار برس میں جا کر نمودار ہونا ہے تو اس طویل مدت میں، ذہنِ انسانی کی سطح بھی اتنی اونچی ہو جاتی ہے کہ وہ اس بلند تصوّر کو اپنا سکے۔ لیکن جب کسی خاص جماعت کے اعمالِ صالح سے یہ حقائق غیر معمولی رفتار سے آگے بڑھ جائیں تو اس جماعت سے باہر کے انسانوں کی ذہنی سطح اتنی اونچی نہیں ہوتی کہ وہ ان حقائق کے ہم دوش ہو جائے۔ اس لئے وہ حقائق ان انسانوں کے لئے غیر مانوس رہتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم کسی بچّے کی تعلیم کا سلسلہ جاری کریں اور اسے بتدریج آگے بڑھاتے چلے جائیں تو وہ ایک دن نہایت آسانی سے ایم۔ اے کے مشکل ترین اسباق کو سمجھ لے گا اور اسے اس کا احساس بھی نہیں ہو گا کہ اس کے سامنے کوئی مشکل سوال آ گیا ہے۔ لیکن اگر دسویں جماعت میں ایم۔ اے کا کورس اس کے سامنے رکھ دیا جائے تو اس کا ذہن اسے اپنے لئے غیر مانوس پائے گا۔ اگر ہم چاہیں کہ اسے دس سال میں ایم۔ اے تک پہنچا ئیں تو شروع ہی سے اس کی تعلیمی رفتار کو (اسی نسبت سے) تیز تر کرنا ہو گا۔ جس کے لئے خاص انتظامات و اہتمامات کی ضرورت ہو گی۔

انسانی عقل کا طریق انسانی عقل کا طریق تجرباتی ہے۔ وہ TRAIL AND ERROR سے کسی نتیجہ تک پہنچتی ہے۔ وہ ایک نظریہ وضع کرتی ہے۔ پھر اُس

پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ سینکڑوں برس کے تجربات کے بعد جاکر معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریہ نے صحیح نتائج پیدا نہیں کئے۔ اس طرح جب وہ نظریہ غلط ثابت ہوتا ہے تو عقلِ انسانی دوسرا نظریہ وضع کرتی ہے۔ اس طرح بہیم تجربات کے بعد، کہیں صدیوں میں جاکر وہ صحیح نظریہ تک پہنچتی ہے۔ اس وقت یہ نظریہ اس کے لئے غیر مانوس نہیں ہوتا۔ اس تمام دوران میں ذہن اسے اپنا چکا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، وحیٔ خداوندی کی رُو سے صحیح نظریاتِ زندگی بیک وقت انسانوں کے پاس آجاتے ہیں۔ اس لئے انسانی ذہن کو ان سے مانوس کرنے کے لئے خاص کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔

(اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

اس طویل تمہید کے بعد سلیم! تم اصل سوال کی طرف آؤ۔ خدا کے ابدی قوانین (الاسلام) اپنی معمولی رفتار سے خراماں خراماں چلے آرہے تھے۔ جس حد تک ذہنِ انسانی انہیں اپنا چکا تھا، وہ اس حد تک ان سے مانوس تھا۔ ان کا باقی حصّہ ہنوز ان کی دسترس سے باہر تھا کہ اتنے میں سرزمینِ

ظہورِ اسلام

عرب میں، نبیٔ اکرمؐ کا ظہورِ قدسی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ابدی قوانین (الاسلام) کا مجموعہ بذریعہ وحی حضورؐ کو عطا فرمایا۔ ان قوانین کا جو حصّہ ہنوز ذہنِ انسانی کی دسترس سے باہر تھا، حضورؐ کے مخاطبین نے اسے اپنے لئے غیر مانوس پایا اور اس کی مخالفت شروع کردی۔ آپؐ نے اپنی بے مثال تعلیم اور بے نظیر عمل سے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ حقائق کس طرح شرفِ انسانیت کے ضامن اور ان کی فلاح و بہبود کے کفیل ہیں۔ جن سعید روحوں نے، اپنے تعصّب کو ایک طرف رکھ کر، انہیں سمجھنے کی کوشش کی، ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور وہ حضورؐ سے متفق ہوگئے۔ اس طرح مومنین کی جماعت حضورؐ کے گرد جمع ہوتی چلی گئی۔ اس جماعت کے اعمالِ صالح (تعمیری پروگرام) نے خدا کے ابدی حقائق کی رفتار میں تعجب انگیز تیزی پیدا کردی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان سے ایسے محیّر العقول نتائج مرتّب ہوکر سامنے آئے کہ تاریخ کے اوراق میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ کچھ کسی مافوق الفطرت یا غیر معمولی اسباب کی رُو سے ظہور میں نہیں آیا تھا۔ یہ خدا کے اسی ابدی قانون کے مطابق ہوا تھا جس کے متعلق اس نے کہا تھا کہ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ خوشگوار نظریاتِ حیات

اپنے زورِ دروں سے اس کی طرف اٹھتے چلے جاتے ہیں اور (انسانوں کے) اعمالِ صالح انہیں ترفع (بلندی) عطا کر دیتے ہیں. یہ سب کچھ اس جماعت کے اعمالِ صالح کی رُو سے ہوا تھا جنہوں نے ان

رفتار میں تیزی

قوانین کی رفتار میں ایسی غیر معمولی تیزی پیدا کر دی تھی کہ ان کے جو نتائج کہیں ہزار برس میں جا کر محسوس طور پر سامنے آنے تھے وہ چند دنوں میں مشہود ہو گئے.

اگر یہ سلسلہ اسی طرح سے قائم رہتا تو یہ حقائق اسی تیز رفتاری سے آگے بڑھتے چلے جاتے (اور سوچو سلیم! کہ اس طرح انسان اس وقت تک کہاں پہنچا ہوتا؟) لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ انسانی جماعت کے اعمالِ صالح ان حقائق کے ساتھ نہ رہے. لہٰذا ان حقائق نے پھر اپنی سابقہ (معمولی) رفتار سے چلنا شروع کر دیا. یہ تھوڑا سا زمانہ جس میں ان حقائق کے نتائج انسانی حساب و شمار کے مطابق سامنے آ گئے تھے' وہ زمانہ ہے جس کے متعلق دنیا کے مؤرخین اور مفکرین یہ کہتے ہیں کہ اسلام صرف اس وقت تک کامیاب رہا. اس کے بعد ناکام ہو گیا. حالانکہ جو کچھ فی الحقیقت ہوا وہ صرف اس قدر ہے کہ اسلام اپنی معمولی رفتار (ہزار ہزار برس کے ایک ایک دن) سے چلا آ رہا تھا. درمیان میں اسے خارجی قوت مل گئی جس سے اس کی رفتار میں

پھر وہی آہستہ خرامی

غیر معمولی تیزی پیدا ہو گئی. بعد میں وہ خارجی قوت الگ ہو گئی اور اسلام پھر اپنی سابقہ رفتار سے چلنے لگ گیا.

بالفاظِ دیگر، نہر اپنی معمولی رفتار سے بہہ رہی تھی. ایک مقام پر ٹھوکر FALL کی وجہ سے اس کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی. جب یہ خارجی تحریک IMPETUS ختم ہو گیا تو وہ پھر اپنی سابقہ رفتار سے بہنے لگ گئی. یہ کہنا کہ نہر صرف اتنے وقت تک بہتی رہی جب تک اس کی لہروں سے اس کی رفتار محسوس طور پر نظر آتی تھی اور اس کے بعد وہ جوئے رواں کی بجائے ساکت و ساکن

چار اہم شقیں

جوہڑ بن گئی، کم نگہی کی دلیل ہے. جو کچھ اوپر کہا گیا ہے' اس میں تین چار باتیں مزید غور کے قابل ہیں.

(۱) وہ کیا چیز تھی جس سے اس خاص دور میں انسانوں کی ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس کے اعمالِ صالح، خدائی قوانین کے لئے اس قدر تحرک کا موجب بن گئے؟

(۲) بعد میں وہ چیز باقی کیوں نہ رہی؟

(۳) اگر وہ چیز باقی نہیں رہی تھی، تو بھی اس زمانے کے عام انسانی ذہن نے ان بلند حقائق کو اپنا کیوں نہ لیا؟ اور

(۴) اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ قوانینِ خداوندی، بعد میں پھر اپنی سابقہ رفتار سے چلنے لگ گئے اور اب تک چلے جارہے ہیں۔ یعنی یہ نہر، جوئے رواں ہے، ساکن جوہڑ نہیں۔ جو ایک مقام پر رُک کر کھڑی ہوگئی ہو اور آگے چلنے کے قابل نہ رہی ہو۔

یہ سوالات ایسے ہیں جو بڑے گہرے غور و تدبّر کے محتاج ہیں۔ اس لئے ان کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا اسے بڑی توجہ سے سمجھنے کی کوشش کرنا۔

سب سے پہلے شق اوّل کو لو۔ یعنی اس سوال کو کہ وہ کیا چیز تھی جس سے اس خاص دَور میں انسانوں کی ایسی جماعت پیدا ہوگئی جس کے اعمالِ صالح سے خدائی قوانین کو ایسی تقویت MOMENTUM مل گئی۔ یہ چیز سلیم! بڑی صاف اور سیدھی تھی۔ قرآنِ کریم نے اسے چند

نظامِ تعلیم و تربیت

الفاظ میں بیان کردیا ہے، جہاں کہا گیا ہے کہ نبیٔ اکرمؐ کا طریقِ عمل یہ تھا کہ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ ...... (۶۲/۲) اس پروگرام کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ یہ کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآنِ کریم پیش کرتے تھے۔ یعنی جن لوگوں کو اس تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دی جاتی تھی ان کے سامنے قرآنِ کریم اور خالص قرآنِ کریم پیش کیا جاتا تھا۔ اس میں انسانی خیالات، تصوّرات، نظریات، معتقدات کی قطعاً آمیزش نہیں ہوتی تھی۔ نبیٔ اکرمؐ کو خدا کی طرف سے قرآنِ کریم ملتا تھا اور اسی کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ یہ دعوت علیٰ وجہ البصیرت دی جاتی تھی۔ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲/۱۰۸) "میں اور میرے متبعین خدا کی طرف دعوت علیٰ وجہ البصیرت دیتے ہیں۔ یعنی قرآنِ کریم کو دلائل و براہین اور علم و بصیرت کی بناء پر پیش کیا جاتا تھا۔ اسے نہ معجزات کے زور سے منوایا جاتا تھا، اور نہ ہی کسی کے سر پر تلوار رکھ کر اسے مسلمان ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

جو لوگ اس طرح علیٰ وجہ البصیرت (دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ) قرآنِ کریم

کی صداقت کو تسلیم کر لیتے، ان کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ ہو جاتا. نبیٔ اکرمؐ انہیں سمجھاتے کہ خدا کے احکام و قوانین (الکتاب) کیا ہیں اور ان کی غرض و غایت (الحکمۃ) کیا. اس طرح انہیں، الاسلام کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں، اپنی عقل و فکر سے کام لینے اور پیش آمدہ معاملات کا حل دریافت کرنے کے طور طریقے سکھائے جاتے۔

اور اس کے ساتھ ہی، صحیح آزادی کی ایسی فضا پیدا کی جاتی جس سے ان کی ذات PERSONALITY کی نشو و نما (تزکیہ نفس) ہوتی جاتی. ان کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں میں بالیدگی پیدا ہوتی. انہوں نے (اس سے پیشتر) انسانوں کی خود ساختہ رسوم و قیود کی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ رکھا تھا وہ سب ایک ایک کر کے ٹوٹ جاتیں اور وہ محسوس کر لیتے کہ وہ دنیا میں نہ کسی انسان کے محکوم ہیں نہ محتاج. (قرآنی معاشرہ میں کوئی کسی کا محکوم و محتاج نہیں ہوتا). اس سے ان کی ذات کی نشو و نما ہوتی۔

یہ تھا وہ سیدھا سادہ پروگرام جس سے نبیٔ اکرمؐ نے ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جس کے اعمالِ صالح، قوانینِ خداوندی کی رفتار میں اس قدر محیّر العقول تیزی پیدا کرنے کا موجب بن گئے تھے اور اس طرح ایک ایسا معاشرہ قائم ہو گیا تھا جس میں اسلام کے درخشندہ و تابناک نتائج چند دنوں میں دنیا کے سامنے آ گئے تھے۔

قرنِ اوّل کے مُسلمانوں میں فرقِ مدارج

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جتنے لوگ نبیٔ اکرمؐ کی زندگی میں مسلمان ہو گئے تھے (اگرچہ اصطلاح میں ان سب کو صحابہؓ کہتے ہیں). ان سب کو تعلیم و تربیتِ نبویؐ سے استفادہ کے یکساں مواقع حاصل نہیں ہوئے تھے. قرآن کریم اس حقیقت کو واضح انداز میں بیان کرتا ہے. مثلاً سورۂ حجرات میں ان بدوی قبائل (اعراب) کا ذکر ہے جو نبیٔ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری ایام میں، اسلامی مملکت کی شوکت و عظمت کو دیکھ کر، مسلمان ہوئے تھے. ان کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے. قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا. یہ بدوی قبائل کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں. قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹/۱۴) " ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے. تم یہ کہو کہ ہم (اسلامی مملکت کے) مطیع و فرماں بردار

ہو گئے ہیں. ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔" یہ تو بدوی قبائل کے متعلق تھا. خود قریش کے متعلق (جو صلح حدیبیہ یا فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے) فرمایا کہ لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قَاتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قَاتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (۵۷/۱۰) "تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے (راہِ خدا میں) اپنا مال خرچ کیا اور لڑائیاں لڑیں اور جنہوں نے فتح کے بعد اپنا مال خرچ کیا اور لڑائیاں لڑیں. یہ دونوں (گروہ) برابر نہیں ہو سکتے. اوّل الذکر کے درجات، ثانی الذکر کے مقابلہ میں بہت بلند ہیں. اگرچہ اسلام کی برکات و حسنات کے سلسلہ میں اللہ کے وعدے دونوں کے ساتھ ہیں." یہ (بلند مدارج کے حامل) وہ حضرات ہیں جنہیں قرآن کریم نے "مومن حقا" کہہ کر پکارا ہے. سورۃ انفال میں ہے. وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ (۸/۷۴) "اور جو لوگ ایمان لائے. انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں ہر قسم کا جہاد کیا. اور وہ لوگ جنہوں نے (ان مہاجرین کو) پناہ دی. اور (دین کے استحکام میں ہر قسم کی) مدد کی. یہی لوگ ہیں پکے اور سچے مومن. ان کے لئے ہر تخریب سے حفاظت کا سامان اور باعزت رزق ہے." جنہوں نے ان کے بعد ہجرت کی اور جہاد کیا، ان کے متعلق کہا گیا کہ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ (۸/۷۵) "وہ بھی تم میں سے ہیں." یہی (اوّل الذکر) وہ "السابقون الاوّلون" (۹/۱۰۰) ہیں جنہیں قرآن نے "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ" کہہ کر پکارا (۴۸/۲۹) اور شجرِ اسلام کی آبیاری میں ان کی خدماتِ جلیلہ کو وجد و مسرت کے عالم میں سراہا ہے (۴۸/۲۹). اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا سلیم! کہ بعد کے مسلمانوں کے ایمان و عمل کی قرآنِ کریم نے تعریف نہیں کی. جنہوں نے ان "السابقون الاوّلون" کی حسن کارانہ انداز سے پیروی کی، ان کے متعلق بھی قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (۹/۱۰۰) اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے." جو کچھ میں نے اوپر کہا ہے اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ اس جماعت میں بعد میں شریک ہونے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو اس انداز سے اسلام نہیں لائے تھے جس انداز سے "السابقون الاوّلون" ایمان لائے تھے. نیز بعد میں

آنے والوں کو تعلیم نبوئ سے نسبتاً کم حصہ ملا تھا۔" السابقون الاوّلون" برسوں کے غور و فکر کے بعد اس وقت ایمان لائے تھے جب ایمان لانے کے معنی اپنے آپ کو دنیا بھر کی مخالفت کا نشانہ بنا لینا اور ہر قسم کی مصیبتوں سے دوچار ہونا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایمان اسی صورت میں لایا جا سکتا تھا جب انسان انتہائی غور و فکر کے بعد صداقت کو پہچان لے۔ لیکن جب اسلامی مملکت قائم ہو گئی تھی اور مسلمانوں کو ہر طرف غلبہ حاصل ہو رہا تھا اس وقت ایمان لانا (قرآنِ کریم کے الفاظ میں) اپنے آپ کو اسلامی مملکت کے سامنے SURRENDER کر دینے کے مرادف تھا۔ یہ تو تھا ان دو گروہوں کے ایمان لانے کے محرّکات کا فرق۔ اس کے ساتھ دوسرا اہم فرق یہ بھی تھا کہ بعد میں مسلمان ہونے والوں کو تعلیم و تربیت نبویؐ سے استفادہ کا بہت کم موقعہ ملا تھا۔

اب اگلی شق کو سامنے لاؤ۔ یعنی اس سوال کو کہ جس پروگرام کے مطابق نبیؐ اکرمؐ نے اس قسم کی جماعتِ مومنین پیدا کر دی تھی، وہ پروگرام آگے کیوں نہ چلا؟ اس سلسلہ میں تم نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہو گا کہ صاحب وہ تو رسولؐ کی منفرد شخصیت تھی جس نے اپنی بے مثال "روحانی قوتوں" سے اس قسم کا انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ (رسُول کے علاوہ) دوسرے انسانوں کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ اس لئے جب رسولؐ اللہ دنیا سے تشریف لے گئے تو یہ سلسلہ منقطع ہو گیا' یہ سلیم! بہت بڑی غلط فہمی ہے جسے دل

ایک غلط فہمی کا ازالہ

سے نکالنا نہایت ضروری ہے۔ اگر یہ خیال دل میں باقی رہے تو اس کا صرف اتنا ہی نتیجہ نہیں ہوتا کہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد یہ سلسلہ آگے نہیں چل سکتا تھا۔ اس سے یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اب اگر ہم لاکھ چاہیں، تو بھی اسلام کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتے۔ اس تصوّر کا نتیجہ، ناامیدئ جاوید ہوتا ہے یعنی اس حالت کو سنوارنے اور مستقبل کو روشن کرنے کی طرف سے ابدی مایوسی۔ یہ جو ہم میں، ہر صدی کے بعد، خدا کی طرف سے " مجدّد " کی آمد یا آخری زمانے میں " ظہورِ مہدی " کا عقیدہ آ گیا ہے، یہ اسی مایوسی کا پیدا کردہ ہے۔ (قرآن کریم میں ختمِ نبوّت کے بعد کسی آنے کا ذکر نہیں)۔ اور یہ جو ہمارے ہاں آئے دن نبوّت کے دعوے ہوتے رہتے ہیں، ان کا بنیادی سبب بھی یہی غلط تصوّر ہے (کہ اسلام کا احیاء نبی کے بغیر ہو نہیں سکتا) لہٰذا اس غلط

تصوّر کا ذہن سے نکالنا از بس ضروری ہے کہ اسلام نے جو کچھ کر کے دکھایا تھا وہ نبی اکرمؐ کی مافوق مافوق الفطرت قوتوں کا نتیجہ تھا۔ آپؐ کے بعد نہ وہ سلسلہ باقی رہ سکتا تھا، نہ اب اس کا احیاء ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبیِ اکرمؐ کی زبان مبارک سے جو کہلوایا ہے کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ ...... (۱۸/۱۱۰) "حقیقت یہ ہے کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں اس فرق کے ساتھ کہ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔" تو یہ اس بنیادی غلط فہمی کے دُور کرنے کے لئے ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ نبیِ اکرمؐ کو خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی۔ حضورؐ کی یہ وہ خصوصیت تھی جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ خصوصیت مافوق الفطرت تھی۔ لیکن اس کے بعد اسلام کو ایک عملی نظام کی صورت میں متشکل کرنے کے لئے آپ

جو کچھ رسولؐ اللہ نے کیا تھا وہ بعد میں بھی ہو سکتا تھا

نے جو کچھ کیا وہ کسی مافوق الفطرت قوّت کی بناء پر نہیں کیا۔ وہ بشری حیثیت سے کیا۔ (یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بار بار اعلان کرتا ہے کہ حضورؐ کو قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی معجزہ نہیں دیا گیا)۔ نبیِ اکرمؐ کی وفات کے بعد، خدا کی طرف سے وحی دیئے جانے کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن اس وحی کو ایک عملی نظام بنانے کے لئے آپ نے جو کچھ بشری حیثیت سے کیا، وہ سلسلہ بدستور آگے چلا۔ خلافت (یعنی آپؐ کی جانشینی) اسی حیثیت سے اور اسی مقصد کے لئے تھی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے یہ کہہ کر واضح کر دیا تھا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۴) "محمدؐ بجز ایں نیست کہ خدا کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی رسول ہو گزرے ہیں۔ سو اگر یہ (کل کو) مرجائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم (یہ سمجھ کر یہ سلسلہ تو آپؐ کی ذات تک ہی محدود تھا) اپنی پہلی روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟" اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ حضورؐ کی ذات کے ساتھ ختم ہونے والا نہیں۔ اسے آگے چلتا تھا اور (نبی کے بغیر) یہ آگے چل سکتا تھا۔ آپؐ نے جو فرمایا تھا کہ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ "میں تمہیں اللہ کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں"۔ تو اس کے بعد اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ کا اضافہ کیا تھا (۱۲/۱۰۸) یعنی میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔ نبیِ اکرمؐ کے

متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ (۷/۱۵۶) "وہ معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔" اور یہی فریضہ آپؐ کی اُمت کا بھی قرار دیا ہے جب کہا ہے کہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (۳/۱۱۰) "تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے "تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔" لہذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ "تلاوتِ آیاتِ قرآنی' تعلیمِ کتاب و حکمت اور تزکیۂ قلوب واذہان" کا جو پروگرام حضورؐ نے اختیار فرمایا تھا وہ آپؐ کی ذات تک محدود تھا۔ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور شجرِ اسلام نے جو ثمرات عہدِ نبویؐ میں دینے شروع کئے تھے' ان کا سلسلہ بدستور قائم رہا لیکن کچھ وقت کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کی وجوہات حسبِ ذیل ہیں۔

رسولؐ اللہ کی حیاتِ طیبہ میں سلسلۂ دعوت و تبلیغ (پہلے) مکہ اور اس کے گرد و نواح تک محدود رہا' اور اس کے بعد مدینہ اور اس کے گرد و پیش تک۔ جن حضرات (رض) کی تعلیم و تربیت اس دوران میں ہوئی' اسلام کے حقائق و تصورات ان کے قلب و دماغ میں پختگی سے مرتسم ہو گئے تھے۔

یہ سلسلہ آگے کیوں نہ چلا؟

بعد میں' جب پورا عرب مسلمان ہو گیا' تو ان کی حالت وہی تھی جس کی طرف قرآن کے "اعراب کے مسلمان ہونے" کے ضمن میں اشارہ کیا ہے۔ (جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں) ایک تو ان کے مسلمان ہونے کے محرکات اور تھے۔ یعنی ابتدائی حضرات (رض) ایک مدت تک غور و فکر کے بعد اسلام علیٰ وجہ البصیرت قبول کرتے تھے' لیکن یہ (بعد کے مسلمان) قرآنِ کریم کے الفاظ میں' اسلامی مملکت کے مطیع و فرمانبردار ہو گئے تھے۔ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں داخل نہیں ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ بدقسمتی سے انہیں تعلیم و ترتیبِ نبویؐ سے استفادہ کا موقع کم ملا تھا۔ ان کی تعداد زیادہ تھی اور یہ ملک کے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ نیز' اس کے بعد نبیٔ اکرمؐ زیادہ عرصہ تک اس دنیا میں تشریف فرما نہ رہے۔ حضورؐ کی وفات جلدی ہو گئی۔

یہ حالت خود نبیٔ اکرمؐ کی حیاتِ مقدسہ کے آخری ایام میں تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس کی حدود بہت وسیع ہو گئیں۔

(ان کے زمانہ میں مملکتِ اسلامی بائیس لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی) ایران کی پوری مملکت اور روما کا بیشتر حصّہ پرچم اسلامی کے زیرِسایہ آگیا تھا۔ اگر ان علاقوں کے باشندے مملکتِ اسلامی سے صرف معاہدات کرتے اور اپنے مذہب پر قائم رہتے، تو صورتِ حالات اور ہوتی۔ لیکن یہ سب مسلمان ہوگئے۔ اس سے نقشہ بدل گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ بالکل اسی طرح مسلمان ہوئے تھے جس طرح (قرآنِ کریم میں بیان کردہ) "اعراب" مسلمان ہوئے تھے (بلکہ ان کی حالت ان سے بھی گئی گزری تھی۔ وہ تو پھر بھی برسوں سے اپنے گرد وپیش صحیح مسلمانوں کو دیکھ رہے تھے اور اسلامی تصوّرات کا چرچا سُن رہے تھے۔ ان نومسلموں کو یہ بات بھی میسّر نہیں ہوئی تھی)۔ ان نومسلموں کی تعداد اس قدر کثیر، رقبہ اس قدر وسیع۔ اور اس زمانے میں وسائل رسل و رسائل اس قدر محدود۔ ظاہر ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اس انداز سے ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور تھی، جس انداز سے السّابقون الاوّلون کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ کو اس کا بڑا خیال تھا اور وہ اس کے متعلق بہت کچھ سوچتے تھے۔ یہی وہ مقامات ہیں جن کی نزاکت اور اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ کریم نے (سورۃ النصر میں یہ کہہ کر تاکید کی ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۙ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ "جب خدا کی فتح و نصرت آجائے اور تو دیکھے کہ لوگ خدا کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں"۔ تو اس وقت یہ نہ سمجھ لو کہ مقصد حاصل ہوگیا۔ ہمارا پروگرام ختم ہوگیا۔ نہیں! اس وقت تو اپنے پروگرام پر اور شدّت سے عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۠ (۱۱۰/۱-۳)۔ (اس وقت) اپنے نشوونما دینے والے کی حمدیت کے پروگرام میں اور زیادہ سرگرمی دکھاؤ۔ اس سے حفاظت کا سامان طلب کرو۔ وہ (اپنی رحمت کے ساتھ) تمہاری طرف رجوع کرنے والا ہے"۔ حضرت عمرؓ کو اس کا اس قدر احساس تھا کہ (ابنِ حزم کی تحقیق کے مطابق) آپ نے قرآنِ کریم کے کم و بیش ایک لاکھ نسخے مملکت کے طول و عرض میں پھیلا دیئے تھے۔

فتوحات کا سلسلۂ دراز

حضرت عمرؓ کی بے وقت شہادت

اس کے بعد ان کے سامنے تعلیم و تربیت کا مزید پروگرام بھی تھا۔ لیکن (امّت اور اس

کے ساتھ عالمِ انسانیت کی) انتہائی بدقسمتی کہ قبل اس کے کہ وہ اپنے پیشِ نظر پروگرام کو عمل میں لاتے وہ غیر متوقع طور پر (بے وقت) شہید کر دیئے گئے اور (نومسلموں کا) یہ پورے کا پورا بڑا وہ ناپختہ رہ گیا۔

ظاہر ہے کہ جب اس قدر کثیر آبادی، اس انداز سے ایک نیا دین قبول کرے تو وہ صرف "مملکت کی فرمانبرداری" کی حد تک "نیا دین" ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے معتقدات، تصوّرات، نظریات سب وہی رہتے ہیں جو پہلے تھے اور جو صدیوں سے ان میں متوارث چلے آرہے تھے۔ (تم نے سلیم! بابا بھیلو خاں کو دیکھا تھا۔ اس کا خاندان دو پشتوں سے مسلمان تھا لیکن بابا کی حالت یہ تھی کہ جب چھینک آتی، بے ساختہ "جے نندی" اس کے مُنہ سے نکل جاتا۔ میں نے اس سے ایک دفعہ پوچھا تو کہنے لگا کہ میاں! جے نندی جاتی جائے گی۔ الحمد اللہ آتی آئے گی۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ پرانی "جے نندیاں" تعلیم و تربیت سے جاتی ہیں۔ ایسا نہ ہو تو پھر یہ اعماقِ قلب سے بمشکل نکلتی ہیں۔ معاشرہ کے اثر سے، ان کے لباس میں تبدیلی آجاتی ہے لیکن یہ جاتی نہیں۔ اور ان کے لباس میں تبدیلی آجانا اور بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

یہ تو ان نومُسلم ممالک کے عوام کی حالت تھی۔ جہاں تک ان کے اوپر کے طبقے کا تعلق تھا، بات اور بھی گہری تھی۔ انہوں نے ان عربوں سے شکست کھائی تھی جنہیں وہ ابھی کل تک وحشی اور جنگلی شمار کیا کرتے تھے۔ اور شکست بھی ایسی جس سے ان کی اس قدر وسیع سلطنت اور ایسی قدیم تہذیب کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ ہونے کو تو مسلمان (یعنی اسلامی مملکت کے فرمانبردار) ہو گئے لیکن اس شکست اور محکومی کا احساس ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور اپنے حریف عربوں کی شان و شوکت کے منظر سے ان کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ انہوں نے یہ انتقام دو طرح سے لیا۔ ایک تو بساطِ سیاست پر جہاں انہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے امّتِ واحدہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اور دوسرے مذہب کے میدان میں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جس چیز نے عربوں کو اس قدر قوّت اور اقتدار عطا کر دیا ہے وہ اسلام کے حقائق ہیں۔ جب ہرمزان، پابجولاں، حضرت عمرؓ کے سامنے آیا اور آپ نے اس سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ کل تک تمہاری قوّت کا یہ عالم تھا کہ عرب تمہاری سرحدوں کی طرف

جذبۂ انتقام

آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اور اب یہ کیفیت ہے کہ تم کسی میدان میں بھی ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے؟ تو اس نے جو کچھ جواب میں کہا، وہ سلیم! سننے کے قابل ہے۔ اس نے کہا۔

> کل تک طاقت کا مقابلہ طاقت سے تھا جس میں ہم بہت آگے تھے۔ خدا نہ تمہارے ساتھ تھا نہ ہمارے ساتھ۔ اب جس وقت ہم میں اور تم میں مقابلہ ہوتا ہے تو تمہارے ساتھ خدا ہوتا ہے اور ہمارے ساتھ نہیں ہوتا[1]

یہ بات اس نے بڑے پتے کی کہی تھی۔ اہلِ ایران کے اربابِ فکر و نظر کا طبقہ خوب سمجھتا تھا کہ یہ خدا کے ابدی قوانین ہیں جن کی اتباع سے اس قوم میں اس قدر انقلاب واقع ہو گیا ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنا بدلہ لینے کے لئے سلیم، یہی یہ سوچی کہ ان لوگوں کو قوانینِ خداوندی (کتاب اللہ) سے دور ہٹا دیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے کیا یہ کہ تمام غیر اسلامی معتقدات و تصوّرات کو اسلام کا لبادہ اڑا کر مسلمانوں کے معاشرے میں داخل کرتے چلے گئے اور اس طرح، خدا کے ابدی قوانین کی جگہ، انسانوں کے خودساختہ قوانین و تصوّرات نے لے لی۔ (اس وقت جو اسلام دنیا میں رائج ہے[2] اس کا بیشتر حصہ انہی قوانین و تصوّرات پر مشتمل ہے)۔ اس حقیقت کو مصری مورّخ محمد حسین ہیکل نے

عجمی سازش

اپنی مشہور کتاب، عمرؓ فاروقِ اعظم، میں عمدہ انداز سے بیان کیا ہے۔ اس نے پہلے ان خیالات کو پیش کیا ہے جو اس موضوع پر تاریخ المؤرّخ — HISTORIAN'S HISTORY OF THE WORLD میں درج ہیں۔ اور اس کے بعد اپنی رائے لکھی ہے۔ تاریخ المؤرّخ کا بیان (ہیکل کے الفاظ میں) یہ ہے کہ

> (ایرانیوں کی) مذہب کی اس تبدیلی کا اثر سیاسی پہلو پر بھی پڑا۔ چنانچہ جب ایرانیوں

---

[1] اسے قرآنِ کریم کی اس آیت کا ترجمہ سمجھئے جس میں کہا گیا ہے کہ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (۴۷/۱۱) یہ اس لئے ہے کہ اللہ مومنین کا سرپرست اور کارساز ہے اور کافروں کا کوئی سرپرست اور کارساز نہیں۔

[2] ان نومسلموں میں یہودی، عیسائی اور ایران کے مجوسی سب ہی شامل تھے لیکن چونکہ ان میں ایرانیوں کی بہت زیادہ کثرت تھی اور انہی نے سب سے زیادہ اسلام کو متاثر کیا، اس لئے ان کا ذکر خصوصیت سے کیا جاتا ہے۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

نے مدینہ اور دمشق کی حکومتوں کے خلاف بغاوت کی تو وہ (حضرت) محمدؐ کے چچازاد بھائی اور شرعی وارث (حضرت) علیؓ عربی کے گرد جمع ہو گئے جنہیں خلافت سے دُور رکھا گیا تھا۔ اور ان کے چاروں طرف جلال و تقدّس کا وہ ہالہ قائم کر دیا گیا جو ان کے اسلاف اپنے قومی بادشاہوں کے گرد قائم کرتے چلے آتے تھے۔ اور پھر جس طرح ان کے بزرگ کسریٰ کو "آسمان کا بیٹا، مقدس بادشاہ" کے لقب سے ملقب کرنے کے عادی تھے اور ان کی کتابوں میں اسے "سیّد و مرشد" لکھا جاتا تھا اسی طرح انہوں نے بھی اپنے اسلام کے زمانے میں (حضرت) علیؓ کو امام کا لقب دے دیا جو اپنی سادگی کے باوجود بڑے اہم معانی کا مالک ہے' اگر اس کے حامل میں دینوی اقتدار اور عقلی برتری جمع ہو جائیں۔

جب (حضرت) علیؓ وفات پا گئے تو ایرانی ان کے صاحبزادوں (حضرت) حسنؓ اور (حضرت) حسینؓ کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے بعد ان کی اولاد کے۔ کہا جاتا ہے (حضرت) حسینؓ نے اکاسرۂ بنی ساسان کے آخری تاجدار کی بیٹی سے شادی کی تھی چنانچہ اس ازدواج کے بعد امامت' مقدّس حق سے رشتہ بدامن ہو گئی۔ پھر کربلا کے میدان میں (حضرت) حسینؓ کے خون نے اس وحدت کو متبرک بنا دیا جو اسلام اور قدیم ایران کے درمیان قائم ہوئی تھی۔

وہ بغاوت جس نے بنو امیہ سے حکومت چھین کر رسولؐ اللہ کے قرابت داروں' بنو عباس کو تخت پر بٹھایا' ایرانیوں ہی کی برپا کی ہوئی تھی۔ جس کے ذریعے انہوں نے اپنے اصولِ امامت کی تشکیل و تصدیق کر دی۔ اگرچہ وہ اس گھرانے کو تاج نہ پہنا سکے جسے تاج پہنانے کی راہ میں انہوں نے اپنی تمام کوششیں صرف کر دی تھیں۔

(ہیکل اُردو ترجمہ' صفحہ ۲۰ - ۴۱۹)

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) لیکن جب ہم "عجمی اسلام" کہتے ہیں تو اس سے مراد ہر غیر قرآنی نظریہ ہوتا ہے خواہ وہ کہیں سے آیا ہو۔

۱۔ خلافت میں وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (طلوعِ اسلام)

اس اقتباس کے بعد، ہیکل لکھتا ہے۔

> یہ واقعات جو تاریخ المؤرخ میں لکھے ہیں اور جن کا ذکر تمام مؤرخین نے کیا ہے، عہدِ فاروقی کے بعد پیش آئے۔ یہاں ہم نے ان کا ذکر، پڑھنے والوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کرنے کے لئے کیا ہے کہ ایرانیوں کے دل شروع ہی سے عربی حکومت پر مطمئن نہیں تھے، بلکہ وہ اس سے اِبار کرتے تھے۔ اوّل اوّل انہوں نے اس کے خلاف اعلانیہ بغاوت کرنی بھی چاہی لیکن اس میں ناکامی ہوئی تو دوسرے ذرائع سے اقتدار حاصل کرنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگے اور عام زندگی کے تمام میدانوں میں انہیں اقتدار کا ایک بہت بڑا حصہ مل بھی گیا۔ مسلمانوں کے ایران فتح کرنے سے ایرانی اس قدر نشتر بہ دل تھے کہ ان کے چند آدمی حضرت عمرؓ کی جان کے دشمن ہو گئے۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت جو فتح خراسان کے کچھ ہی دن بعد ہوئی، ایرانی سازش ہی کا نتیجہ تھی۔　　(ایضاً صفحہ ۴۲۰)

تم جانتے ہو سلیم! کہ نہ میں شیعہ ہوں نہ سنّی۔ اس لئے مجھے مسلمانوں کے کسی فرقے کے مخصوص معتقدات سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ہر اُس عقیدہ اور تصوّر کو غلط سمجھتا ہوں جو قرآن کے خلاف ہو۔ اس لئے مسئلہ زیرِ نظر کو بھی میری نگاہ فرقہ وارانہ عینک سے نہیں دیکھتی۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان مفتوحہ علاقوں کے نومسلموں نے اپنے معتقدات کو اسلام کا رنگ دے کر مسلمانوں کے معاشرے میں پھیلا دیا اور آہستہ آہستہ انہیں اس "خدا" (یعنی کتابِ خدا) سے بیگانہ بنا دیا جو غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے غلبہ کا باعث تھا۔ اس طرح انہوں نے فولادی شمشیروں کا بدلہ ذہنی شمشیروں کے ذریعہ لے لیا۔ ان کی اس سازش کو اس (بدقسمت) واقعہ سے اور تقویت مل گئی کہ عباسیوں نے سلطنت ہی ایرانیوں کے بل بوتے پر حاصل کی تھی جس سے ان کا اقتدار معاشرے کے ہر گوشے پر چھا گیا تھا۔ اور چونکہ پڑھے لکھے لوگ تھے اس لئے ان کا وضع کردہ "جدید اسلام" کتابی شکل میں بھی عام ہو گیا۔ ہمارے ہاں جو کچھ دین کے نام سے پڑھا جاتا ہے وہ بیشتر انہی کتابوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حادثہ کے بعد ہماری تاریخ (سیاست اور مذہب کے دونوں میدانوں میں) انہی عجمی ریشہ دوانیوں کی متنوّع داستان ہے۔

یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر صحیح اسلام سے متعلق تعلیم و تربیت کا وہ سلسلہ، جسے نبیؐ اکرمؐ نے شروع کیا اور جو خلافت کے اوّلین ایام تک جاری رہا، آگے چل کر رُک گیا۔ اور نہ صرف یہ کہ وہ سلسلہ رُک گیا بلکہ اس کی جگہ ایک نئے "اسلام" نے لے لی۔ اس ضمن میں بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ لڑائیاں نہ لڑی جاتیں تو اسلام اس مصیبت سے بچ جاتا جو ان نومسلموں کے ہاتھوں اس پر وارد ہوئی لیکن وہ اس

یہ فتوحات نہ ہی ہوتیں، تو اچھا تھا؟

رائے کے اظہار کے وقت ایک اہم حقیقت کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ لڑائیاں، جوع الارض (ہوسِ ملک گیری) کی تسکین کے لئے نہیں لڑی گئی تھیں۔ میں اپنے موضوع سے دُور ہٹ جاؤں گا ورنہ میں تمہیں تفصیل سے بتاتا کہ ان لڑائیوں کے محرکات و اسباب کیا تھے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ

(۱) اسلام ایک نظامِ زندگی ہے جو صرف ایک آزاد اسلامی مملکت میں عملی شکل میں سامنے آ سکتا ہے۔ یہ تھا وہ بنیادی مقصد جس کے لئے نبیؐ اکرمؐ نے ایک مملکت کی تشکیل کی اور اس مملکت کا تحفظ، حضورؐ کے جانشینوںؓ نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا۔

(۲) ایران اور روم کی مملکتیں، اس جدید اسلامی مملکت کو کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ یہ مملکت ان کی نگاہوں میں حریفِ تازہ تھی اور وہ لوگ اس کے استحکام میں اپنے لئے سخت خطرہ محسوس کرتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ اس مملکت کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالیں۔ اگر خلافت کے اس دور میں ان مملکتوں کے مشئوم عزائم کی روک تھام نہ کی جاتی تو اسلامی مملکت کا وجود باقی نہ رہتا۔ اس مقصد کے لئے جیوشِ اسلامیہ کا آگے بڑھانا ناگزیر تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے، اگر یہ ممالک صرف معاہدات کر لیتے تو بھی صورت مختلف ہوتی۔ لیکن وہاں کے باشندے (شتابشب) مسلمان ہو گئے اور اس سے وہ خرابیاں پیدا ہو گئیں جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اس پر انتہائی بدقسمتی یہ کہ حضرت عمرؓ بے وقت شہید کر دیئے گئے۔ اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے اور ان ممالک میں اسلام مستحکم طور پر رائج ہو جاتا تو پھر اس قدر خطرات پیدا نہ ہوتے۔

(۳) اس مقام پر اتنا اضافہ ضروری ہے کہ اسلامی مملکت میں صرف دفاعی جنگ کی شکل ہی پیدا نہیں

ہوتی. جنگ کی ضرورت اور بھی لاحق ہو جاتی ہے. مثلاً اگر کسی دوسری مملکت کے علاقہ میں (غیر مسلم) انسانوں پر سخت مظالم ہو رہے ہوں اور ان بیچاروں کا کوئی پُرسانِ حال نہ ہو تو اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان مظلوموں کی مدافعت کے لئے ہر ممکن کوشش کرے (۴/۷۵)۔ جس کی آخری (اور بعض حالات میں ناگزیر) صورت' جنگ ہوتی ہے. (یہ وہی مقصد ہے جس کے لئے اب تجویز ہو رہا ہے کہ اقوامِ متحدہ (U-N-O) کے پاس اپنی فوجیں ہونی چاہئیں تاکہ وہ انہیں عند الضرورت ان علاقوں میں بھیج سکے جہاں قانون شکنی ہو رہی ہو اور اس کی روک تھام کی کوئی اور صورت باقی نہ رہے). یہ بھی ایک مقصد تھا جس کے لئے خلافت کو اپنی فوجیں بعض مقامات کی طرف بھیجنی پڑیں.

ان حالات کے پیشِ نظر سلیم! تم اس سے متفق ہو گے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خلافت کو یہ لڑائیاں نہیں لڑنی چاہیئے تھیں' وہ حقیقت سے کس قدر بے خبر ہیں.

اب تم تیسری شق کو لو. یعنی اس سوال کو کہ اگر تعلیم و تربیت کا وہ سلسلہ جاری نہ بھی رہ سکا تھا' تو بھی عام ذہنِ انسانی نے اسلام کے ان حقائق کو' جو اس طرح بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آ چکے تھے، خود بخود کیوں نہ اپنا لیا؟ اس نے خود ساختہ قوانین کو ان پر

انسانی ذہن نے اسلامی حقائق کو اپنایا کیوں نہ؟

کیوں ترجیح دی؟ اس سوال کے متعلق ضمناً پہلے بھی لکھا جا چکا ہے. یعنی جب ابدی حقائق اپنی عام رفتار سے چلتے ہیں تو ذہنِ انسانی ان سے رفتہ رفتہ مانوس ہوتا رہتا ہے. لیکن جب وہ انقلابی طور پر نمودار ہوتے ہیں تو اپنے زمانہ کی سطح سے بہت اونچے ہوتے ہیں. اس لئے عام انسانی ذہن ان کا خوگر نہیں ہوتا جب تک خاص تعلیم و تربیت سے اسے ان کے لئے تیار نہ کیا جائے. اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا کرتے ہیں کہ انقلابی آواز قبل از وقت ہوتی ہے." انقلابی آواز" کے معنی ہوتے ہیں خدا کے کسی ابدی قانون کو انسانی رفتار سے سامنے لانے کی دعوت. اور" قبل از وقت" سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں وہ آواز اٹھتی ہے اس زمانے تک کا انسانی ذہن اس قانون سے مانوس نہیں ہوتا. اگر اس زمانے کا انسانی ذہن اس قانون سے مانوس ہو چکا ہو تو وہ آواز انقلابی نہیں ہوتی. اسے اسی فضا کی پیداوار کہا جائے گا. یہی وجہ ہے جو کہا جاتا ہے کہ انقلابی آواز کے لئے اس کا دور سازگار

نہیں ہوتا۔" سازگار نہیں ہوتا" سے مراد یہ ہے کہ اس دَور کے انسان اسے اچھی طرح APPRECIATE نہیں کرسکتے۔ ان کی فکری سطح اتنی اونچی نہیں ہوتی کہ وہ اس غیر معمولی آواز سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرسکیں۔ وہ آواز ان کے لئے بڑی غیر مانوس ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ تم رسولؐ کی دعوت کو تو چھوڑو، کہ وہ اپنے دَور سے صدیوں آگے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں تو عام نابغہ GENIUS کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ہاتھوں اپنی قدر ناشناسی کا رونا روتے مرجاتا ہے۔ تم اپنے محبوب (شاعر) غالب کو دیکھو، وہ کس طرح اپنے زمانے کی پستیِ سطح کا شکوہ سنج ہے! کہیں وہ ان سے کہتا ہے کہ ـــــ

زمانہ کی شکوہ سنجی

مباش منکرِ غالب کہ درزمانۂ تست۔ کہیں اپنی اس دشواری کا گلہ خواں ہے کہ گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل۔ لیکن چونکہ اپنے مقام اور اپنے دَور کی سطح سے خوب واقف ہے اس لئے نہایت حتم ویقین اور خود اعتمادی سے یہ کہہ کر ـــــ اپنے دَور سے آگے نکل جاتا ہے کہ

قدرِ شعرِ من بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداراں کہن خواہد شدن

یہی کچھ اقبالؒ کے ساتھ ہوا۔ وہ بھی اپنے آپ کو "گل نخستیں"، "آدمِ اوّل"، اور "شاعرِ فردا" کہتا ہوا چلا گیا۔ اور اپنی آواز کے قبل از وقت ہونے کا اعلان ان الفاظ میں کرگیا کہ

چوں رختِ خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود!
ولیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

اور غالب ہی کی طرح یہ "پیشگوئی" کرگیا کہ

پس از من شعرِ من خوانند و می یابند و می گویند
جہانے را دِگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اور، ایک غالب اور اقبال ہی پر کیا موقوف ہے۔ یہ جو تمہیں آج مختلف ممالک کی تاریخ میں آسمانِ فکر و نظر کے درخشندہ ستارے نظر آرہے ہیں، ان سب کے ساتھ ان کے زمانے نے یہی کچھ کیا تھا۔ وہ

اپنے زمانے میں روٹی کے ٹکڑے تک محتاج رہے۔ محتاج ہی نہیں رہے بلکہ ان کی زندگی اکثر قید و بند میں گزری اور مصائب و آلام کا شکار رہی۔ وہ گمنامی کی زندگی جیئے یا بدنامی کی موت مرے۔ لیکن مرنے کے بعد، آنے والے زمانے نے ان چیتھڑوں، گدڑیوں تک کو ڈھونڈ نکالا جن میں انہوں نے زندگی کے دن کاٹے تھے اور انہیں اپنے عجائب گھروں کی یادگار اور پرستش گاہوں کی زینت بنایا۔ ان کا ایک ایک لفظ سونے کے حروف میں لکھا اور جواہرات کے ترازوؤں میں تولا گیا۔

قرآنی انقلاب کی بلند سطح

ان حقائق کی روشنی میں سلیم! ذرا اس زمانے کی علمی، ذہنی، فکری، معاشی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی اور عمرانی سطح پر غور کرو جس میں قرآنِ کریم آیا۔ اور اس کے بعد اس انقلاب آفریں پیغام کو دیکھو جو قرآنِ کریم لایا۔ تمہیں خود معلوم ہو جائے کہ وہ پیغام اس زمانے کی سطح سے کس قدر اونچا اور اس دَور سے کتنا آگے تھا۔ ذرا سوچو سلیم! کہ جس زمانے میں دنیا کی حالت یہ تھی کہ بڑے بڑے مفکّرین سے لے کر عام انسانوں تک، مندروں اور قربان گاہوں، معبدوں اور خانقاہوں کی پُراسرار اعجوبہ پرستیوں کے شکار اور راہبوں، پجاریوں، منتریوں اور کاہنوں کے دامِ تزویر کے اسیر تھے اور انہیں کاروبارِ خداوندی کے براہِ راست کارپرداز تصوّر کرتے تھے۔ اس زمانے میں یہ آواز، کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی تیسری طاقت حائل نہیں، کس قدر زمانے کی سطح سے اونچی تھی؟

جس زمانے میں ساری دنیا کا معمول یہ تھا کہ راجہ کو ایشور کا اوتار، قیصر کو خدائی اختیارات کا حامل اور شاہنشاہ کو زمین پر خدا کا سایہ سمجھتی اور ان کی اس نہج پر پرستش کرتی تھی۔ اس زمانے میں یہ پکار کہ کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے (۳/۷۹) اور یہ کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں (۴۲/۳۸) اس دَور کے کان کے لئے کس قدر نا آشنا اور اس زمانے کے قلب کے لئے کتنی نامانوس تھی۔

جس زمانے میں عزت کا معیار نسلی تفوّق، شرف و مجد کا معیار خاندانی اور قبائلی نسبتیں، اور قیادت و سیادت کا مدار حسب و نسب پر سمجھا اور مانا جاتا ہو اور ان امتیازات کے استحکام و بقا کے لئے ملکوں کے ملک اور قوموں کی قومیں تباہ و برباد کر دی جائیں اور ایسا کرنے میں ہر شخص، ہر قبیلہ، ہر ملک اور ہر قوم انتہائی فخر محسوس کرے، اس زمانے میں یہ پیغام کہ ہر انسانی بچّہ پیدائش کے اعتبار

سے ایک جیسا ہے (۱۷/۷۰) اور عزّت و تکریم کا معیار اس کے ذاتی جوہر ہیں (۴۹/۱۳ - ۴۶/۱۹) نہ کہ آبائی نسبتیں، کس قدر اجنبی اور "غیر فطری" تھا!

جس دور میں انسانوں کی تقسیم ملکوں کی چار دیواریوں اور قوموں کی حد بندیوں کی رُو سے ہوتی تھی اور وطن اور قوم کی خاطر جان دینا زندگی کا مقدس ترین فرض سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں یہ دعوت کہ انسانوں کی تقسیم اور قوموں کی تشکیل، وطن، رنگ، نسل، زبان وغیرہ کے اشتراک سے نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کی روسے ہوتی ہے، کس قدر ناقابلِ فہم اور "ماورائے سرحدِ ادراک" تھی!

جس زمانے میں حالت یہ تھی کہ انسان نے، فطرت کے ہر حادثہ اور کائنات کے ہر تغیّر کے لئے ایک ایک الگ "خدا" تجویز کر رکھا تھا، جس کی خوشنودی اور ناراضگی ہر خوش آئند یا الم انگیز واقعہ کا موجب بنتی تھی۔ اس زمانے کے انسان سے یہ کہنا کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے ایک لگے بندھے قانون کے تابع ہوتا ہے۔ یہاں ہر معلول EFFECT کے لئے ایک علّت CAUSE اور ہر سبب کے لئے ایک مسبّب ہے اور یہ سب کچھ ایک غیر متبدّل قاعدے کے مطابق ہوتا ہے، جس میں کبھی کسی کے لئے کوئی استثناء نہیں ہوتی، کتنا بڑا محیّر العقول تصوّر اور کیسا ناقابلِ تسلیم دعوے تھا۔

جس زمانے میں انسان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ، اپنے آپ کو اپنے ذہن کی تراشیدہ موہوم قوتوں کے سامنے بے دست و پا سمجھ کر، اپنے آپ کو قدم قدم پر مجبور و مقہور پاتا تھا، اس زمانے میں انسان سے یہ کہنا کہ ان موہوم قوّتوں کا کوئی وجود نہیں اور کائنات کی تمام موجود قوّتیں اس کے لئے تابع فرمان کر دی گئی ہیں تاکہ وہ ان سے اپنا کام لے (۴۵/۱۳) یہ ایک ایسی آواز تھی جس پر کوئی کان دھرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

جس زمانے میں انسان کی علمی سطح کا یہ عالم تھا کہ گاؤں میں جو شخص دس سے اوپر گنتی جانتا اسے مافوق البشر تصور کیا جاتا، اس زمانے میں، اور تو اور، خود پیغمبرؐ کے متعلق یہ اعلان کہ وہ تمہارے ہی جیسا انسان ہے (۱۸/۱۱۰) انسان کے ذہن میں سمانے والی بات ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

جس زمانے میں یہ ایک مسلّمہ تھا کہ مقدّس بزرگ وہ ہے جس سے کوئی نہ کوئی شعبدہ سرزد ہو، اس زمانے میں یہ کہنا کہ ہم نے پیغمبر تک کو بھی کوئی حسی معجزہ نہیں دیا اور کسی دعوے کے جھوٹے اور سچے ہونے کا معیار یہ ہے کہ علم و بصیرت اس کے متعلق کیا کہتے ہیں اور اس کے ماننے اور نہ ماننے کا نتیجہ کیا

ہوتا ہے ایک ایسی بات تھی جسے "عقل" تسلیم ہی نہیں کر سکتی تھی۔ پیغمبر، اور معجزہ ہی کوئی نہیں! مذہب کی باتیں اور ان کا مدار عقل و بصیرت پر! شریعت کی رسومات اور ان کی پرکھ، نتائج کی رو سے! اسے اگر وہ بوالعجبی قرار نہ دیتے تو اور کیا کہتے؟

جس زمانے میں مزدور LABOURER تو ایک طرف، غلام SLAVE "تک کو فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہو۔ اس زمانے میں یہ آواز اٹھانا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے کی محنت کے ماحصل کا مالک بن بیٹھے" پاگل پن" کی بات نہیں تو اور کیا قرار پاتی؟

اور جس زمانے میں قارون کی سی دولت کو خدا کا فضل قرار دیا جاتا ہو۔ زمینداری اور جاگیرداری کو فطرت کا عطیہ ٹھہرایا جاتا ہو اور ذاتی املاک و مقبوضات پر کسی قسم کی حد بندی خلافِ قانون و شریعت قرار پاتی ہو۔ اس زمانے میں یہ نعرہ بلند کرنا کہ دولت جمع کرنا بدترین جرم ہے (۳۵-۳۴/۹ ؛ ۲-۱/۱۰۴)۔ ذرائع پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ رزق کے دروازے تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں (۳/۵۶)۔ ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا اور اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما، معاشرہ کا بنیادی فریضہ ہے (۶/۱۵۲) کس قدر تحیّر انگیز آواز ہو گی۔

ذرا غور کرو سلیم! کہ چھٹی صدی عیسوی میں اس قسم کے تصوّراتِ حیات اور اس انداز کے نظریاتِ زندگی، اس وقت کے ذہنِ انسانی کے لئے کس قدر نامانوس تھے۔ یہ وہ انقلاب آفریں تصورات تھے جنہیں اپنانے کے لئے زمانہ ابھی تیار نہیں تھا۔ دنیا ان سے ابھی بہت پیچھے تھی۔ وہ تو خیر پھر بھی چھٹی صدی عیسوی تھی جسے ازمنۂ مظلمہ DARK AGES کہتے ہیں۔ قرآن کے انقلابی تصورات کا تو یہ عالم ہے کہ خود ہمارا زمانہ، یہ بیسوی صدی جسے تہذیب و تمدّن اور علم و عقل کا بلند ترین مظہر سمجھا جاتا ہے، یہ بھی اس کے کئی ایک تصوّرات سے ہنوز بہت پیچھے ہے۔ ان تصوّرات کی سطح اتنی بلند ہے کہ ابھی زمانہ کو نہ معلوم ان تک پہنچنے کے لئے کتنی منزلیں اور طے کرنی پڑیں۔ ان حالات میں تعجب انگیز بات یہ نہیں کہ قرآنِ کریم کا پیش کردہ نظام (تمہارے خیال کے مطابق) زیادہ عرصہ تک چلا کیوں نہیں۔ تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ اس زمانے میں اتنے لوگ کس طرح پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنے زمانے کی سطح سے اتنے بلند اور نامانوس تصوّرات کو اپنا لیا اور انہیں عملاً متشکل کر دیا سلیم! جب میں اس مسئلہ کو اس زاویۂ نگاہ

حیرت انگیز انقلاب

سے دیکھتا ہوں تو اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی تحیّر انگیز تعلیم و تربیت کے حُسن تصوّر سے میری رُوح وجد میں آجاتی ہے جس نے اس دَور میں ایسے افراد تیار کر لئے جنہوں نے اس قسم کے نظام کو اپنا کر دکھایا۔ میرے نزدیک حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ یہی ہے کہ جن حالات میں دنیا کا ہر نابغہ GENIUS اپنے زمانہ کی قدرناشناسی کا رونا رو کر اور اپنے آپ کو "آنے والے زمانے کا انسان" کہہ کر چلا جائے، حضورؐ ان حالات میں یہ کہیں کہ خیر القرون قرنی سب سے بہتر میرا زمانہ ہے جس میں اس قسم کا انقلاب آفرین نظام، جو زمانہ کی سطح سے منزلوں اونچا ہے، اس حسن و خوبی سے متشکل ہو کر سامنے آگیا ہے۔ اگر تم سلیم! اس نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھو تو حضور نبیٔ اکرمؐ تمام دنیا کے انقلابی قائدین میں سب سے آگے اور سب سے اونچے نظر آئیں گے۔ ذرا سوچو! کہ ان تصوّرات کو جن تک زمانہ تیرہ سو سال میں بھی کماحقہٗ نہیں پہنچ سکا، نہ صرف اپنے رفقائے کار کے ذہن نشین کرانا بلکہ انہیں ان کے ہاتھوں متشکل کرا دینا، اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟ کتاب و حکمت کی ایسی حقیقت کشا اور محیّر العقول اور انسانی صلاحیتوں کا اس قدر ناقابلِ تصوّر تزکیہ (نشوونما) اس قسم کے معلّم و مربّی کے ہاتھوں عمل میں آسکتا تھا۔ یہی تھا حضورؐ کا وہ عدیم النظیر کارنامہ جس پر خدا اور کائنات کی تمام تعمیری قوتیں، غلغلہ ہائے تبریک و تحسین بلند کرتی تھیں۔

محیّر العقول معاشرہ

إِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (۳۳/۵۶) اور حضورؐ کے ساتھ اس جماعتِ مومنین کے لئے بھی، جو ساری دنیا سے الگ ہٹ کر، اور اپنے زمانے کی سطح سے منزلوں بلند ہو کر، اس قسم کے ناممکن التصوّر نظام کو عملاً متشکّل کر رہے تھے (هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (۳۳/۴۳)) سوچو سلیم! اس زمانے میں (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) قریش کے مرکز مکّہ کے اندر اس قسم کا معاشرہ قائم کر دینا جس میں قریش کے بڑے بڑے سردار اور عجم (فارس) کا ایک "عامی" (سلمانؓ) روم کا ایک مزدور (صہیبؓ) اور حبش کا ایک غلام (بلالؓ) نہ صرف ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتے تھے بلکہ باہمی رشتے ناطے بھی کرتے تھے، کس قدر محیّر العقول تھا۔ پھر اس معاشرہ میں یہ کیفیت پیدا کر دینا کہ اور تو اور، خود رسول اللہ جب کسی غلام اور لونڈی سے بھی کوئی بات کہتے تو وہ بغیر کسی جھجک کے پوچھ لیتے کہ حضورؐ آپ ایسا وحی کی رُو سے فرماتے ہیں یا آپ کا ذاتی مشورہ ہے۔ اور جب آپ فرماتے کہ یہ میرا ذاتی مشورہ ہے تو وہ نہایت آزادی سے کہہ دیتے کہ معاف فرمائیے! اس باب میں میرا

فیصلہ کچھ اور ہے اس لئے میں اس مشورہ کو نہیں مان سکتا. کتنا بڑا تھا یہ انقلاب جو ذہنیتوں میں پیدا کر دیا گیا تھا. امورِ مملکت میں ایسا نقشہ پیدا کر دینا کہ اگر کسی دوسرے کی رائے زیادہ بہتر ہے تو امیرِ مملکت (نبیٔ اکرمؐ) اسے خود اپنی رائے پر ترجیح دیتے اور بڑے سے بڑے اہم معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرتے، کتنی بڑی تبدیلی کا آئینہ دار تھا. اس سے بھی آگے بڑھو تو رسول اللہ کی وفات پر حضرت صدیق اکبرؓ کا پورے مجمع سے یہ کہنا کہ جو شخص محمدؐ کی پرستش کرتا تھا، وہ سمجھ لے کہ اس کا خدا مر گیا ہے. لیکن جو خدائے حیّ و قیّوم کا پرستار ہے اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا خدا زندہ و پائندہ ہے. محمدؐ خدا کے ایک رسول تھے. وہ اپنا وقت پورا کر کے دنیا سے تشریف لے گئے ہیں. اس سے اس نظام پر کچھ اثر نہیں پڑتا جسے حضورؐ نے قائم کیا تھا. سوچو سلیم! کہ یہ آواز اس زمانے میں کتنی قبل از وقت تھی. پھر حضورؐ کی وفات پر لوگوں کا جمع ہو کر اپنے میں سے ایک امیر چن لینا اور بلا لحاظ قرابت و وراثت سب کا اسے امیر تسلیم کرنا اس دور کے ذہنِ انسانی کے لئے کس قدر نامانوس واقعہ تھا! اور خود رسول اللہ کا یہ اعلان کہ میرے گھر میں ایک پیسہ بھی جمع نہیں. اور جو اشیائے مستعملہ میں چھوڑ رہا ہوں، اس کا کوئی وارث نہیں. وہ تمام امت کی مشترکہ ملکیت ہیں. اس زمانے کے لئے کس قدر تحیّر انگیز تھا. حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بحیثیت امیر المومنین، صرف اتنا کفاف (روزینہ) لینا جتنی ایک مزدور کی اُجرت ہوتی ہے، اور اپنی وفات کے وقت اس رقم کو بھی بیت المال میں یہ کہہ کر واپس داخل کر دینا کہ معلوم نہیں میں اس رقم کے برابر کام بھی کر سکا ہوں یا نہیں، اس زمانہ کی سطح سے کس قدر اونچا فیصلہ تھا؟ حضرت عمرؓ کا اپنی بیوی سے یہ کہنا کہ قیصر کی بیوی نے (تمہارے عطر کے تحفہ کے بدلہ میں) جو جواہرات بھیجے ہیں وہ بحیثیت امیر المومنین کی بیوی کے بھیجے ہیں نہ کہ تمہاری ذاتی حیثیت سے، اس لئے انہیں بیت المال میں داخل کرانا چاہیئے، اس زمانے کی فضا میں کس قدر تعجب انگیز سی بات تھی! اور ان کا یہ فیصلہ کہ مفتوحہ زمینیں سپاہیوں میں تقسیم نہیں ہونی چاہئیں بلکہ ملت کی مشترکہ تحویل میں رہنی چاہئیں. تاکہ اس سے موجودہ اور آنے والی نسلیں یکساں طور پر فائدہ اٹھائیں. اس دور کے لوگوں کے لئے کس قدر حیرت افروز تھا! پھر وادیٔ شام کی اس بڑھیا کا یہ کہنا کہ اگر خلیفۃ المسلمین، امت کے تمام افراد کے حالات سے باخبر رہنے اور ان کی ضروریات کو از خود پورا کرنے کا انتظام نہیں کر سکتا تو اسے خلافت کو چھوڑ کر الگ ہو جانا چاہیئے، کیونکہ وہ اس کا اہل نہیں، اس زمانے کے لئے کس قدر ناقابلِ تصوّر تھا. اور حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ

کہ میں گیہوں کی روٹی اس وقت کھاؤں گا جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی میسر آ رہی ہے ورنہ میں جَو کی روٹی ہی کھاؤں گا، اس زمانے کے آسمان کی آنکھ کے لئے کیسا تحیر انگیز تھا؟ سوچو سلیم! کہ اس زمانے میں اس قسم کا معاشرہ قائم کر دینا جس میں اس قسم کے فیصلے بہ تکلف نہ کئے جائیں بلکہ زندگی کا عام معمول بن کر از خود سامنے آتے جائیں، کس قدر قبل از وقت تھا؟ (جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں) ذہنِ انسانی تو تیرہ صدیاں آگے بڑھنے پر بھی اس سطح تک نہیں پہنچا کہ وہ ان تصوّرات کو اپنا کر زندگی کا معمول بنا لے۔ لہٰذا اس زمانے میں اس قسم کا نقشہ پیدا کر دینا کتنی بڑی کامیابی تھی۔

اس مقام پر اس غلط فہمی کا رفع کر لینا بھی ضروری ہے کہ میں نے جو کہا ہے کہ انقلابی دعوت اس زمانے کے عام ذہنِ انسانی سے بہت اونچی سطح پر ہوتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس دَور کا انسانی ذہن اس دعوت کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ وہ دعوت سمجھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن (جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں) اس کے لئے خاص جدّوجہد کی ضرورت ہوتی ہے، اور انسانی ذہن بڑا سہل انگار واقع ہوا ہے۔ یہ محنت اور کاوش سے جی چراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقلید کی روش (جس میں انسان کو کچھ سوچنا ہی نہیں پڑتا، بلکہ اس میں سوچنا حرام سمجھا جاتا ہے) بڑی آسانی سے، خود بخود آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ محنت اور کاوش سے ہر دَور کے انسانی ذہن کی سطح بلند ہو سکتی ہے۔ اسلام کے قرنِ اوّل کی تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے۔

ذہنِ انسانی کو بلند کیا جا سکتا ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے سلیم! کہ اس قسم کے ہنگامی انقلابات سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟ اگر خاص جدّوجہد اور کدّ و کاوش سے کچھ وقت کے لئے ابدی قوانین کی رفتار تیز کر کے ان کے نتائج غیر معمولی طور پر نمودار کر لئے جائیں اور اس کے بعد، انسانی ذہن اور اس کا معاشرہ پھر اسی سطح پر چلا جائے تو عالمِ انسانیت کو اس سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ متعیّن شکل میں اس سوال کا مطلب یہ ہوگا کہ قرنِ اوّل کے اسلام نے دنیائے انسانیت کو کیا دیا؟

ہنگامی انقلاب سے کیا فائدہ؟

اس نے دنیائے انسانیت کو بہت کچھ دیا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ خدا کے ابدی قوانین وحقائق

ایک مدوّن کتابی شکل (قرآن کریم) میں دنیا کے سامنے آگئے کہ جس کا جی چاہے انہیں عملی پیکر میں لاکر ان کے خوشگوار نتائج حاصل کرلے۔

دوسرے یہ کہ دنیا کو معلوم ہوگیا کہ یہ قوانین ایسے ہیں جن پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ یعنی یہ محض "شاعر کا خواب" UTOPIA نہیں، ایک ممکن العمل PRACTICABLE ضابطۂ حیات ہے جس پر تاریخ کے ایک دَور میں عمل کیا گیا تھا۔ اور اس کے نتائج سامنے آگئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے انقلابی دَور زمانے کی امامت کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے، عقل کا طریق کار تجرباتی ہے۔ وہ ایک نظریہ وضع کرتی ہے۔ اس پر عمل کرتی ہے۔ صدیوں کے تجربات کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا اس لئے تجربہ ناکام رہا۔ اس کے بعد، عقل کسی دوسرے نظریہ پر تجربہ شروع کر دیتی ہے۔ لیکن اگر کسی انقلابی دَور کے نتائج اس کے سامنے ہوں تو اسے اپنے تجربہ کے متعلق صحیح نتیجہ تک پہنچ جانے کے لئے زیادہ وقت درکار نہیں ہوتا۔ تم سلیم! زمانہ قبل از اسلام کی انسانی تاریخ، اور زمانہ بعد از اسلام کی تاریخ پر نظر ڈالو اور پھر دیکھو کہ دنیا نے جس تیزی سے زمانہ بعد از اسلام میں ترقی

اسلام نے دنیا کو کیا دیا؟

کی ہے، اس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اور یہ بھی اس صورت میں ہوا ہے جب کہ اسلام کے قرنِ اوّل کی صحیح اور خالص تاریخ دنیا کے سامنے نہیں۔ اگر اس دَور کی غیر مخلوط تاریخ دنیا کے سامنے ہوتی تو تم دیکھتے کہ آج دنیا کا نقشہ کیا ہوتا؟ یوں سمجھو کہ اس قسم کا انقلابی دَور زمانے کی گاڑی کو ایسا دھکا PUSH دے دیتا ہے جس سے اس کی رفتار میں خاصی تیزی آجاتی ہے اور کتنا ہی فاصلہ وہ محض اپنے زورِ دروں MOMENTUM سے طے کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ اسی زورِ دروں کا اثر تھا کہ اگرچہ صحیح اسلامی معاشرہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا، لیکن مسلمان (اس کے بعد بھی) صدیوں تک دنیائے علم و فن میں اقوامِ عالم کی امامت کرتے رہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف مغرب کے بڑے بڑے مفکرین

یورپ کو مہذب اسلام نے بنایا

اور مؤرخین تک نے کیا ہے۔ مثلاً برفالٹ BRIFFAULT نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب THE MAKING OF HUMANITY میں ایک خاص باب اس موضوع کے لئے وقف کیا ہے اور اسی کا نام ہی اس نے "دارالحکمت" رکھا ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے کہ

یورپ کو حیاتِ نو پندرہویں صدی میں نہیں ملی۔ یہ اسے عرب اور اندلسی مسلمانوں کے کلچر کے اثرات سے ملی۔ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کا گہوارہ، اٹلی نہیں بلکہ ہسپانیہ تھا۔ جب یورپ آہستہ آہستہ، وحشت اور بربریت کے انتہائی پست نقطہ تک پہنچ چکا تھا تو اس وقت بغداد، قاہرہ، ٹالیدو، نئی تہذیب اور تازہ افکار کے مراکز بن رہے تھے۔ یہی وہ مراکز تھے جن سے دنیا کو نئی زندگی عطا ہوئی جس نے ارتقائے انسانیت کی ایک جدید منزل بننا تھا۔ جب مسلمانوں کی نئی ثقافت محسوس شکل میں سامنے آئی تو دنیا میں حیاتِ تازہ کی نمود شروع ہوئی..... اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کو کبھی تہذیب کا مُنہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

(صفحہ ۹۰ — ۱۸۹)

یہ ہے جو کچھ دنیا کو اسلام کے انقلابی دَور کے دھکے سے ملا۔

اب چوتھی شق کو سامنے لاؤ۔ یعنی یہ سوال کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ اسلام کے ابدی حقائق اپنی معمولی رفتار سے آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ کسی جگہ رُک کر کھڑے نہیں ہوگئے۔ اس کے لئے سلیم! پہلے اس زمانے کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا جب قرآن نازل ہوا۔ اور اس کے بعد، اس تیرہ سو سال

اس کا ثبوت کہ اسلام آگے چل رہا ہے

میں انسانی تاریخ کا مطالعہ۔ اس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس تیرہ سو سال میں انسان، مختلف تجارب کے بعد، ان تصوّرات کو اختیار کرتا چلا آ رہا ہے۔ جو قرآن نے دیئے تھے، یا اُن تصورات کی طرف جا رہا ہے جو قرآن سے پہلے دنیا میں عام طور پر پھیلے ہوئے تھے۔

دُنیا کے فیصلے

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، انسانی ذہن کا اس وقت فیصلہ یہ تھا کہ ملوکیت "عین" فطرتِ انسانی" کے مطابق نظامِ جہاں بانی ہے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور یہ تصوّر دیا کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اس وقت ذہنِ انسانی کے لئے یہ تصوّر نامانوس تھا۔ تم بتاؤ کہ اس کے بعد اس تیرہ سو سال میں، ذہنِ انسانی کا رُخ ملوکیت کی سمت رہا ہے یا وہ آہستہ آہستہ "اسلام قبول کرتا" چلا گیا ہے اور قبول کرتا چلا جا رہا ہے؟

ذہنِ انسانی کا اس وقت فیصلہ یہ تھا کہ غلاموں کا وجود معاشرہ کا جزوِ لاینفک ہے اور فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ۔ اس لئے اس نظام کو کبھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ قرآنِ کریم نے یہ انقلابی تصوّر دیا کہ تمام افرادِ انسانیہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہیں۔ اس لئے کسی فرد کا دوسرے فرد کو غلام بنالینا یکسر خلافِ انسانیت ہے۔ اس وقت ذہنِ انسانی کی عام سطح نے اس تصوّر کو ناقابلِ قبول سمجھا۔ لیکن بتاؤ کہ اس کے بعد زمانے نے اس تصوّر کو قابلِ قبول سمجھا یا اپنے قدیم تصوّر کو؟

ذہنِ انسانی کا اس وقت کا فیصلہ تھا کہ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر، ایک قوم کو دوسری قوم پر، یعنی ایک نسل کو دوسری نسل پر فوقیت حاصل ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ محض توہم پرستی ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہرِ ذاتی سے ہے نہ کہ انتساباتِ نسبی سے۔ اس زمانہ نے اس تصوّر کو اپنے لئے ناآشنا پایا۔ لیکن تم غور کرو کہ اس زمانے کے بعد زمانہ نے اپنے لئے کیا فیصلہ کیا؟ کیا وہی نہیں جسے قرآنِ کریم نے پیش کیا تھا؟

اس زمانہ میں ذہنِ انسانی کا فیصلہ یہ تھا کہ قومیں شخصیتوں کے سہارے آگے بڑھتی ہیں اس لئے ہیرو ورشپ (مشاہیر پرستی) عین تقاضائے فطرت ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ یہ تصوّر ذہنِ انسانی کے عہدِ طفولیت کی یادگار ہے۔ اب قومیں آئیڈیالوجی کی بنیاد پر مرتّب ہوں گی اور اپنے نظام کی خوبیوں کے سہارے آگے بڑھیں گی۔ اس زمانے نے اس تصوّر کو اپنے لئے ناآشنا پایا اس لئے اسے ردّ کر دیا۔ لیکن تم بتاؤ کہ کیا آج تمہارے زمانہ کا رُخ اس رَدکردہ تصوّر کو گلے لگانے کی طرف نہیں ہے؟

اس زمانے میں جاگیرداری، زمینداری، سرمایہ پرستی کا نظام عین مطابقِ فطرت سمجھا جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے یہ انقلاب انگیز تصوّر پیش کیا کہ ہر فردِ انسانی کا فریضہ تمام نوعِ انسانی کی نشو و نما ہے اس لئے وسائل و ذرائع پیداوار کسی انسان کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتے۔ زمین پر سانپ کی طرح بیٹھ جانا اور چاندی اور سونے کے ٹکڑوں کو جمع کرتے چلے جانا انسانیت کی عدالت میں بدترین جرم ہے۔ جس کی سزا تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اس زمانے نے اس تصوّر کو ٹھکرا دیا لیکن ذرا غور کرو سلیم! کیا زمانہ اسی ٹھکرائے ہوئے تصوّر کو اپنانے کے لئے مضطرب اور بے چین نہیں ہے؟

اس زمانے میں مختلف خاندانوں، قبیلوں، قوموں کا تو تصوّر تھا لیکن عالمگیر انسانیت کا تصوّر

کسی کے سامنے نہیں تھا۔ قرآنِ کریم نے آکر کہا کہ نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری ہے اور اس کی عملی تشکیل اس طرح ہوسکتی ہے کہ تمام دنیا کا نظامِ حکومت ایک ہو۔ یہ بات اس زمانے کے عام ذہن میں نہ آئی۔ لیکن ذرا غور کرو سلیم! کہ اس کے بعد دنیا کا رُخ عالمگیر انسانیت کی منزل کی طرف ہے یا انسانوں کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹنے کی طرف؟ آج دنیا نیشنلزم کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہے؟ اس کی تفصیل معلوم کرنی چاہو تو (میری کتاب) "انسان نے کیا سوچا؟" میں سیاسیات سے متعلق باب پڑھو۔ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی۔ نیشنلزم کے بعد، مغربی مفکرین نے انٹرنیشنلزم (بین الاقوامیت) کی طرف رُخ کیا۔ لیکن چند ہی قدم چلنے کے بعد انہوں نے محسوس کرلیا کہ یہ راستہ بھی انہیں انسانیت کی صحیح منزل کی طرف نہیں لے جاسکتا۔ چنانچہ اب وہ اسے چھوڑ کر، عالمگیر انسانیت UNIVERSALISM اور تمام دنیا میں واحد حکومت ONE WORLD GOVERNMENT کے تصورات کی طرف آرہے ہیں لیکن اس کے لئے انہیں کوئی بنیاد نہیں ملتی جس پر اس کی عمارت استوار کریں (یہ بنیاد، قرآنِ کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی)۔

میں نے یہ چند باتیں سلیم! محض بطورِ مثال لکھ دی ہیں، ورنہ زندگی کا کونسا شعبہ ہے جس میں انسان، اپنے ناکام تجارب کے بعد، اس راستہ پر چل نہیں پڑا، یا اس راستے کی تلاش میں نہیں، جسے قرآنِ کریم نے کاروانِ انسانیت کو منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والا راستہ بتایا ہے۔ زمانہ قرآنِ کریم کے انقلاب آفریں حقائق میں سے بعض کو اپنا چکا ہے، بعض کو اپنانے کے لئے مضطرب و بے قرار ہے۔ اور جو حقائق باقی ہیں وہ اس زمانے کی سطح سے بھی اونچے ہیں۔ یہ اس لئے کہ قرآنِ کریم تمام نوعِ انسان کے لئے آخری اور مکمل راہنمائی ہے، لہٰذا اس کے حقائق زمانے کی لہروں کے ساتھ ساتھ کھلتے جائیں گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ (۴۱/۵۳)

"ہم نوعِ انسان کو اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں دکھاتے جائیں گے تا آنکہ یہ بات اُبھر کر سامنے آجائے کہ قرآنِ کریم ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔"

زمانہ، انفس و آفاق کی ان نشانیوں کو دیکھ کر، قرآنِ کریم کے ابدی حقائق کو اپناتے اور اس طرح رفتہ رفتہ

"مسلمان ہوتے" چلا جا رہا ہے۔

جو کچھ شروع میں کہا گیا ہے اسے مختصر الفاظ میں پھر سُن لو کہ:۔

نگۂ بازگشت

(۱) اسلام مجموعہ ہے ان ابدی حقائق، غیر متبدل قوانین اور مستقل اقدار کا جنہیں نوعِ انسان کی راہنمائی کے لئے بذریعہ وحی عطا کیا گیا ہے اور جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔

(۲) اسلام اپنی آفاقی رفتار سے (جو ہمارے حساب و شمار کے مطابق بہت سُست ہوتی ہے) چلا آرہا تھا اور اس طرح عام ارتقائی طریق سے BY EVOLUTION اپنے حقائق کو آہستہ آہستہ انسانی معاشرہ کا جزو بنا رہا تھا کہ نبیِ اکرمؐ کا ظہور ہوا۔

(۳) نبیِ اکرمؐ نے برسوں کی سعیٔ پیہم سے، ایک جماعت تیار کی جس کے عملی پروگرام سے اسلام کے حقائق کی آفاقی رفتار میں بڑی تیزی آگئی اور ان کے نتائج، انسانی حساب و شمار کے مطابق، محسوس شکل میں سامنے آگئے۔ یہ ہے وہ دَور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسلام ایک کامیاب تجربہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا۔

(۴) کچھ عرصہ کے بعد، وہ طریقِ کار (یعنی دعوت الی اللہ علیٰ وجہ البصیرت اور تعلیم کتاب و حکمت) جسے نبیِ اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا باقی نہ رہا۔ اس طرح وہ خارجی قوت جس نے اسلام کے ابدی قوانین کی رفتار میں اس قدر محیّر العقول تیزی پیدا کر دی تھی، ختم ہو گئی اور اسلام پھر اپنی سابقہ آفاقی (سُست) رفتار سے آگے چلنے لگ گیا۔ اس سے سطح بین لوگ اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اسلام تھوڑی دُور چل کر ناکام رہ گیا۔

ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم اسلام اور مسلمان قوم کو ایک ہی تصوّر کر لیتے ہیں اور مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اسلام دنیا میں ناکام رہا ہے۔ وہ چند قدم چل کر رُک گیا اور زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ اگر ہم اسلام اور مسلمان قوم

اسلام اور مُسلمان قوم کا فرق

کے فرق کو سمجھ لیں تو پھر اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، اسلام کے حقائق کی نمود تخلیقِ کائنات کے ساتھ ہی ہو گئی تھی اور انہوں نے رفتہ رفتہ آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ راستے میں مختلف زمانوں میں،

مختلف اقوام نے انہیں اپنایا تو انہیں سرفرازیاں اور خوشگواریاں نصیب ہوگئیں۔ جب انہوں نے ان حقائق کا ساتھ چھوڑ دیا تو (باقی اقوام کی طرح) مصیبتوں کا شکار ہوگئیں۔ آج سے قریب چودہ سو سال پہلے، سرزمینِ عرب کی ایک قوم نے ان حقائق کو اپنایا تو اسے محیّر العقول ترقی نصیب ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اسے چھوڑ دیا تو اس پر زوال آگیا۔ لیکن اسلام بدستور آگے چلتا رہا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اسلام کس طرح خراماں خراماں آگے بڑھتا اور زمانہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے، ہمیں مسلمانوں کی تاریخ نہیں بلکہ نوعِ انسان کی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ ہر وہ نظام جسے ذہنِ انسانی نے وضع کیا، چند دنوں تک زندہ رہ کر ناکام ثابت ہوگیا۔ اور آگے صرف اسلام بڑھا۔

اسلام کی تاریخ کے شواہد

جب فرانس کے گلی کوچوں میں ملوکیت کو مٹا کر جمہوری نظام کی طرح ڈالنے کے لئے انقلاب برپا کیا گیا ہے، تو وہ بھی اسلام کی ایک کڑی تھی۔ اور جب امریکہ میں غلامی کے انسداد کے لئے لڑائیاں لڑی گئیں تو وہ بھی اسلام ہی کی زرّیں داستان کا ایک باب تھا۔ جب ہندوستان میں اچھوتوں کو "ہری جن" (روحِ خداوندی کے حامل) قرار دیئے جانے کی تحریک اُٹھی تو وہ بھی اسلام ہی کی ایک ابدی حقیقت کی نمود تھی۔ اور اب جو امریکہ میں سیاہ اور سفید فام افراد میں تمیز رنگ و نسل مٹانے کی جدّوجہد ہو رہی ہے تو یہ بھی اسلام ہی کی طرف ایک قدم اٹھ رہا ہے۔ جب اقوامِ عالم نے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ مختلف قوموں کے تنازعات کا فیصلہ باہمی مشاورت سے کیا جائے تو وہ بھی اسلام کی پیش کردہ تجویز پر عملدرآمد کی صورت تھی۔ اور اب جو ذہنِ انسانی میں یہ خیال انگڑائیاں لے رہا ہے کہ دنیا سے اسلحہ کا وجود ختم کر دیا جائے تو یہ بھی اسلام ہی کے پروگرام کی ایک کڑی ہے (جس نے چودہ سو سال پیشتر کہا تھا کہ جنگ کی اس وقت تک ضرورت ہے جب تک جنگ خود اپنے ہتھیار نہ رکھ دے) (۴۷/۴)۔ غرضیکہ اس ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں جہاں جہاں کوئی تحریک نوعِ انسانی کو صحیح آزادی اور ترقی کی طرف لے جانے کے لئے اٹھی ہے وہ قرآن ہی کی شمعِ نورانی کی ایک کرن تھی، اور جہاں جہاں انسانوں کے خود ساختہ نظام ہائے حیات ناکام ثابت ہوئے ہیں، وہ اسلام کے ابدی قوانین کی صداقت ہی کا ثبوت تھا۔ تم اگر اس نگاہ سے دیکھو سلیم! تو یہ حقیقت واضح طور پر تمہارے سامنے آجائے گی کہ دنیا کی تاریخ اور انسان کی تلاش پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

تاریخ انسانیت کا اس انداز سے مطالعہ کرنے سے علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لوگے کہ (نہ صرف یہ کہ) اسلام کسی مقام پر رُک نہیں گیا، بلکہ یہ بھی کہ اسلام کے سوا کوئی نظامِ زندگی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی مقام پر جا کر ناکام نہ ثابت ہو گیا ہو اور اس کی جگہ اسلام کے اصول نے نہ لے لی ہو۔ قرآنِ کریم نے جب اسلام

اسلام ہی آگے بڑھ رہا ہے

کے متعلق کہا تھا کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (۴۸/۲۸) کہ یہ نظامِ خداوندی، تمام انسانی نظامہائے زندگی پر غالب آئے گا۔ تو یہ ایک حقیقت کا بیان تھا۔ قرآنِ کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ انسان کا مستقبل روشن ہے۔ جب (تخلیقِ آدم کے سلسلہ میں) ملائکہ نے خدا سے کہا کہ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (۲/۳۰) کہ یہ دنیا میں فساد انگیزیاں اور خوں ریزیاں کرے گا۔ تو اس کے جواب میں خدا نے کہا کہ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۲/۳۰) میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی آخری منزل، جس میں یہ صحیح مقامِ آدمیت پر پہنچے گا، وہ ہوگی جس میں فساد انگیزیوں اور خوں ریزیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۳۸) کا دَور دَورہ ہو گا۔ انسان کو اس منزل کی طرف اسلام لئے جا رہا ہے اور یہ اسے وہاں تک پہنچا کر رہے گا۔ اس لئے کہ یہ خدائے "رب العالمین" کا تجویز کردہ نظام ہے اور رب کہتے ہی اسے ہیں جو کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے، بتدریج، نقطۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ اگر خدا کا تجویز کردہ نظام آخری منزل تک نہ پہنچے اور راستے ہی میں رُک جائے تو وہ خدا رب العالمین نہیں ہو سکتا۔ دنیا اس پروگرام کے مختلف اجزاء کو ایک ایک کر کے اپنا رہی ہے۔ لیکن ان الگ الگ اجزاء سے قرآنی نظام کے نتائج کلی مرتب نہیں ہو سکتے۔ نظام ایک غیر منقسم وحدت ہوتا ہے جو اسی صورت میں اپنے نتائج مرتب کرتا ہے جب اسے بالکلیہ AS A WHOLE اختیار کیا جائے (جس طرح دوا کا نسخہ اسی صورت میں اپنے صحیح نتائج پیدا کر سکتا ہے جب اس کے تمام اجزاء صحیح اوزان کے ساتھ جمع کر کے دوائی بنائی جائے)۔ جو قوم اس نظام کو بالکلیہ اختیار کر لے اسے جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے اور یہی لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کی مصداق قرار پا سکتی ہے۔ انسان نے

آخرالامر اس مقام تک پہنچنا ہے، خواہ یہ اپنے تجرباتی طریق سے پہنچے یا ایمان کی رُو سے۔ ایمان کی رو سے یہ صدیوں کی مسافت لمحوں میں طے کر لے گا اور ان تمام نقصانات سے بچ جائے گا جو تجرباتی طریق کا لازمی نتیجہ ہیں۔

اس مقام پر یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ یہ کیا وجہ ہے کہ دنیا کی باقی قومیں اس قدر آگے بڑھ رہی ہیں اور مسلمان ان سب سے پیچھے ہیں۔ اس کی تفصیلی وجوہات تو تمہیں "اسبابِ زوالِ امت" میں ملیں گی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ دنیا کی دیگر اقوام "انفس و آفاق کی نشانیوں" پر غور و فکر کے بعد، قرآنی حقائق کو اپنائے جا رہی ہیں اور مسلمان اس "عجمی اسلام" کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں جس کی رُو سے سوچنا اور سمجھنا حرام ہے۔ لہٰذا یہ اقوامِ عالم میں سب سے پیچھے ہیں۔ جس دن انہوں نے پھر سے "یتلوا علیھم اٰیٰتہ" کا پروگرام اپنے سامنے رکھ لیا۔ یعنی خالص قرآن کریم کو اپنا نصب العین بنا لیا، اقوامِ عالم کی امامت ان کے حصے میں آجائے گی۔

کہو سلیم! اب بھی تمہارا یہی خیال ہے کہ اسلام آگے نہیں چلا؟ اسے پھر سمجھ لو کہ (گوئٹے کی تشبیہ کے مطابق) اسلام ایک صاف اور شفاف ندی ہے جو رواں دواں اپنی منزل کی طرف بہے جا رہی ہے۔ جو قوم اس ندی کے پانی سے اپنی زمین سیراب کرے گی اس کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی۔ تاریخ کے ایک دَور میں عرب کی قوم نے ایسا ہی کیا تو اسے "ایک دانے کے عوض سات سو دانے ملے" (۲/۲۶۱)۔ جب اس نے اس ندی سے پانی لینا بند کر دیا تو اس کی کھیتیاں سوکھ گئیں۔ سطح بین نگاہوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ وہ ندی ہی سوکھ گئی۔ یہ غلط ہے۔ وہ ندی بدستور بہے جا رہی ہے جس کا جی چاہے اس سے اپنے کھیتوں کو سیراب کرے۔
كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰)
تیرے نشوونما دینے والے کا ابرِ کرم، ہر ایک کو (اس کی سعی و عمل کے مطابق) سیرابی عطا کئے جا رہا ہے۔ اس کی یہ بخشش کبھی نہیں رکتی بلکہ جوئے رواں کی طرح جاری و ساری رہتی ہے۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

مسلمانوں کی کھیتیاں اس لئے سوکھ گئیں کہ انہوں نے اس آسمانی ندی سے آبیاری چھوڑ دی۔ ندی بدستور بہے جا رہی ہے۔ اگر سلیم! تمہارے ریڈیو سے نغمۂ نو بہار کی حیات بخش آواز آنی بند ہو گئی ہے تو

تمہارے ریڈیو سیٹ میں نقص پیدا ہو گیا ہے۔ خدائی ریڈیو اسٹیشن سے بدستور پروگرام نشر ہو رہا ہے اور نشر ہوتا رہے گا۔ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷/۵)۔

قرآن کریم نے اسلامی نظام کی اس خصوصیتِ کبریٰ کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (۱۴/۲۴) کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے خوشگوار نظریۂ حیات کو (کس طرح) مثال دے کر سمجھایا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے بار آور درخت کی سی ہے جس کی جڑ مضبوط ہو اور اس کی شاخیں بلند فضا میں پھیلی ہوئی ہوں" یعنی اس نظامِ زندگی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی جڑیں پاتال تک پہنچی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے یہ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ حوادثِ زمانہ کی آندھیاں اور جھکڑ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ اپنی جگہ مضبوط اور محکم کھڑا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شاخیں فضا کی بلندیوں میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ کسی ایک ملک تک محدود نہیں۔ (دوسرے مقام پر اس کے متعلق کہا ہے کہ لَا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ (۲۴/۳۵) یہ مشرق و مغرب کی نسبتوں سے بلند ہے)۔ اس کے بعد ہے تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا (۱۴/۲۵) قرآنی نظام کا یہ شجرِ طیّب، اپنے نشوونما دینے والے کے مقرر کردہ قانون کے مطابق، اپنا پھل ہر وقت دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ کسی خاص موسم (خاص زمانہ) میں اس نے پھل دیا اور اس کے بعد خشک ہو گیا۔ یہ ہمیشہ پھل دیتا ہے۔ یعنی یہ نظام جہاں مکاں SPACE کی حدود سے ماورا ہے وہاں زماں TIME کی قیود سے بھی ناآشنا ہے۔

اس حقیقت کو سورۃ الرعد میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ جس جنّت کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے اس کی مثال (اس باغ کی سی) ہے جس میں ہمیشہ پانی کی ندیاں رواں ہوں اور اس کی وجہ سے اس کے درخت ہر وقت سبز و شاداب رہیں۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا (۱۳/۳۵) اس باغ کے پھل بھی ہمیشہ رہیں اور اس کا سایہ بھی۔

اب ظاہر ہے کہ جس شجرِ طیّب کے متعلق خدا یہ کہتا ہو کہ وہ ہمیشہ پھل دیتا رہے گا اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے ایک زمانہ میں تو پھل دیا اور پھر خشک ہو گیا، حقیقت کو جھٹلانا ہے (جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں) جس زمانہ کے متعلق سطح بین نگاہیں یہ کہتی ہیں کہ صرف اس میں شجرِ اسلام نے اپنا پھل دیا تھا،

اس میں ہوا یہ تھا کہ مومنین کی جماعت نے اپنے حُسنِ عمل کی آبیاری سے اس کی ثمر باری کی رفتار کو تیز کر دیا تھا۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗٓ (۴۸/۲۹) کی اس سعی و کاوش کے نتیجہ کو بھی قرآنِ کریم نے کھیتی کی مثال سے سمجھایا ہے جہاں کہا ہے کہ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَہٗ۔ اس کھیتی کی طرح جو پہلے اپنی ننھی سی سوئی نکالتی ہے۔ فَاٰزَرَہٗ پھر وہ اسے مضبوط کرتی ہے۔ فَاسْتَغْلَظَ سو وہ موٹی ہو جاتی ہے۔ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ۔ پھر وہ اپنی نالوں پر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّارَ ط (۴۸/۲۹) وہ (اس طرح بار آور ہو کر) کسان کے دل کو خوش کرتی ہے ان لوگوں کو غصّہ میں لاتی ہے جو اس نظام کی صداقت کا انکار کرتے تھے۔ یعنی جس شجرِ طیّب نے اپنی آفاقی رفتار سے دیر میں جا کر ثمر بار ہونا تھا اس جماعت کے سعی و عمل سے وہ دیکھتے ہی دیکھتے بار آور ہو گیا۔ جب انسانی دست و بازو کی یہ رفاقت ساتھ نہ رہی تو وہ درخت پھر اپنی معمولی رفتار سے بڑھنے، پھولنے اور پھلنے لگا۔

باقی رہی وہ جماعت جس نے اس زمانے میں اس شجرِ طیّب کے ثمرِ شیریں سے اس طرح جھولیاں بھر لیں تھیں، تو اس کی یہ خوشحالی اس نظام سے پیوستگی کا نتیجہ تھی۔ جب اس نے اس نظام کو چھوڑ دیا تو وہ اس نظام کے ثمرات سے بھی محروم ہو گئی۔ اس کے متعلق سورۂ ابراہیم کی اس آیت کے تسلسل میں جسے اوپر درج کیا گیا ہے قرآنِ مجید نے کہا ہے کہ یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ ج وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ قف وَ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ ع (۱۴/۲۷) اللہ، جماعتِ مومنین کی، دنیا اور آخرت میں جو جڑیں مضبوط کرتا ہے تو اس نظریۂ زندگی کی رُو سے ایسا کرتا ہے جو خود محکم اور مضبوط ہے۔ جب تک وہ اس کے ساتھ پیوست رہتی ہے، ثابت اور مستحکم رہتی ہے۔ جب اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے تباہ اور برباد ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ نہ کسی کو یونہی ثبات و قرار عطا کرتا ہے نہ بلا سبب کسی کی جڑیں اکھیڑتا ہے۔ جس قسم کا نظام کوئی قوم اختیار کر لیتی ہے اس قسم کا اس کا انجام ہوتا ہے۔ اسلام نہ کبھی ناکام ثابت ہوا ہے، نہ ناکام ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ ہر نظام آخرالامر ناکام رہے گا۔ وَ الْعَصْرِ۔ زمانہ (کی تاریخ) اس حقیقت پر شاہد ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۵ انسان (اپنے خود ساختہ نظامہائے حیات پر چلنے سے) ہمیشہ نقصان میں رہے گا۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۵ کامیاب وہ جماعت رہے گی جو نظامِ خداوندی کی

صداقت پر یقین رکھے اور اپنے اعمالِ صالحہ (سے اس کی ثمرباری کی رفتار کو تیز کر دے)۔ لیکن یہ ہنگامی پروگرام نہیں کہ کسی ایک زمانے میں اس پر عمل پیرا ہو کر وہ قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کامیاب و کامران رہے خواہ بعد میں اس نظام کو چھوڑ ہی کیوں نہ دے۔ بالکل نہیں۔ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۱-۳)۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ اس جماعت کے افراد ایک دوسرے کو اس نظامِ حق و صداقت کی تلقین کرتے رہیں اور اس پر ثابت قدمی سے قائم رہنے کی تاکید کریں۔ جب تک مسلمان اس پروگرام پر عمل پیرا رہے، قوانینِ خداوندی کے نتائجِ حسنہ نے ان کی جھولیاں بھر دیں۔ جب انہوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو وہ ان کے ثمرات سے محروم ہو گئے۔ اور اس کے بعد وہ قوانین اپنی سابقہ رفتار سے آگے چلتے گئے اور چلے جا رہے ہیں! یہ ہے سلیم! مختصر الفاظ میں، اس سوال کا جواب کہ اسلام آگے چلا ہے یا نہیں؟ کہو! تمہارا کیا خیال ہے؟ اسلام آگے چلا ہے یا نہیں؟

والسلام
پرویز

جنوری ۱۹۶۰ء

تینتالیسواں خط

فرائضِ رسالت

بسلسلہ "اسلام آگے کیوں نہ چلا؟"

مجھے خوشی ہوئی سلیم! کہ میرے سابقہ خط سے تمہارے شکوک و شبہات رفع ہو گئے. حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان، اپنے ذاتی معتقدات و نظریات سے الگ ہٹ کر، قرآنِ کریم پر غور و فکر کرے تو شکوک و شبہات باقی نہیں رہ سکتے. یہی تو اس کتابِ عظیم کا اعجاز ہے۔

جس نکتہ کی تم نے مزید وضاحت چاہی ہے، وہ فی الواقعہ ایک مستقل موضوع ہے اور سابقہ خط میں وہ محض ضمناً سامنے آیا تھا. مختصر الفاظ میں تمہارا سوال یہ ہے کہ تشکیلِ دین کے سلسلہ میں جو کچھ نبیِ اکرمؐ نے کیا تھا، وہ اگر آپؐ کے نبی ہونے کی حیثیت سے تھا، تو پھر حضورؐ کے بعد کوئی اور ان امور کو سرانجام نہیں دے سکتا تھا. نہ ہی اب دے سکتا ہے، (کیونکہ نبوت حضورؐ پر ختم ہو چکی ہے)؛ لہٰذا حضورؐ کی وفات کے بعد، دین کی وہ شکل قائم نہیں رہ سکتی تھی. نہ ہی اب دوبارہ قائم کی جا سکتی ہے. اس صورت میں یہ سوال ہی بیکار ہے کہ "اسلام آگے کیوں نہ چلا". وہ آگے چل ہی نہیں سکتا تھا. لیکن اگر وہ ایسے امور تھے جنہیں "غیر از نبی" بھی سرانجام دے سکتے تھے (اور دے سکتے ہیں) تو پھر اسلام کا وہی سلسلہ بدستور قائم رکھا جا سکتا تھا (اور اب بھی اسے قائم کیا اور آگے چلایا جا سکتا ہے. اس خط میں، اسی نکتہ کی مزید وضاحت مقصود ہے، اگرچہ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، ضمناً یہ نکتہ سابقہ خط میں بھی سامنے آ چکا ہے۔

نبی اور رسُول

قرآنِ کریم کی رُو سے، نبی اور رسول، ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رسول صاحبِ کتاب ہوتا ہے اور نبی صاحبِ کتاب نہیں ہوتا، یہ قرآنِ کریم سے بے خبری کی دلیل ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے ہر مامور من اللہ (خواہ اسے نبی کہہ کر پکارا جائے یا رسول کے لقب سے) صاحبِ کتاب ہوتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے "انبیاء" کے متعلق کہا ہے کہ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (۲/۲۱۳) "اللہ نے ان سب کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب نازل کی"۔ اور سورۃ حدید میں "رسولوں" کے متعلق ارشاد ہے۔ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (۵۷/۲۵) "ہم نے ان سب کے ساتھ کتاب نازل کی"۔ یہ بات ہے بھی بالکل ٹھیک۔ جو بھی خدا کی طرف سے آئے گا وہ خدا کا پیغام لے کر آئے گا (اسی کو خدا کی کتاب کہتے ہیں)۔ اگر وہ خدا کا پیغام لے کر نہیں آتا تو اس کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ لہٰذا، نبوّت اور رسالت میں، اس جہت سے کوئی فرق نہیں۔ لیکن جو سوال تم نے اٹھایا ہے، اسے ذہن نشین کرنے کی خاطر اتنا سمجھ لو کہ (میرے اس خط میں) "نبوّت" سے مفہوم

نبوّت اور رسالت

ہو گا نبیِ اکرمؐ کا خدا کی طرف سے وحی پانا۔ اور "رسالت" سے مقصود ہو گا، اُس وحی کے مطابق، معاشرہ کی تشکیل کرنا۔ اسے عملی شکل میں نافذ کرنا! اس اعتبار سے نبوّت نبیِ اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گئی۔ حضورؐ کے بعد کوئی شخص خدا سے وحی نہیں پا سکتا۔ خدا نے جس قدر وحی انسانوں کی راہنمائی کے لئے بھیجنی تھی وہ قرآنِ کریم میں منضبط ہو گئی اور قرآنِ کریم کی حفاظت کا ذمّہ خود اللہ نے لے لیا۔ لہٰذا اب گفتگو صرف ان امور کے متعلق رہ جاتی ہے جنہیں حضورؐ نے، اس وحی کو ایک عملی نظام کی شکل میں نافذ کرنے کے سلسلے میں، سر انجام دیا تھا۔ ان امور کو، محض سمجھنے سمجھانے کی خاطر، "فرائضِ رسالت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب تم غور سے سنو کہ یہ فرائضِ رسالت کیا تھے اور آیا یہ فرائض (نبوّت کی طرح) حضورؐ کی ذات تک محدود تھے یا ان کا سلسلہ آگے بھی چل سکتا تھا؟

تبلیغِ رسالت

خدا کی طرف سے وحی پانے کے بعد، رسولؐ کے ذمّے سب سے پہلا فریضہ یہ عائد ہوتا تھا کہ وہ اس وحی کو دوسروں تک پہنچائے۔ اپنی ذات تک ہی محدود نہ رکھے۔ چنانچہ حضورؐ کو حکم دیا گیا کہ

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (۵/۶۷)

اے رسول! جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تیری طرف نازل کیا گیا ہے اسے (دوسروں تک) پہنچاؤ۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو (اس کا مطلب یہ ہوگا کہ) تو نے خدا کے پیغام کو (دوسروں تک) نہیں پہنچایا۔

یعنی رسولؐ کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ خدا کی وحی کو، جو اس پر نازل کی جائے، دوسروں تک پہنچائے۔

تصوّف اور نبوّت

میں نے تمہیں ایک خط میں، تصوف کے متعلق تفصیل سے لکھا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ اس میں میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جب کسی صوفی سے کہا جائے کہ جو کچھ آپ نے دیکھا ہے (یعنی "مشاہدۂ حق") ذرا ہمیں بھی بتائیے کہ اس کی کیفیت کیا ہے، تو اس کے جواب میں وہ کہے گا کہ یہ باتیں سمجھنے سمجھانے کی نہیں، خود مشاہدہ کرنے کی ہیں۔ کون کسی کو بتا سکتا ہے کہ شراب کے نشے کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

تم وہاں کے احوال و کوائف کا پوچھتے ہو؟ وہاں کی تو کیفیت یہ ہے کہ

کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

جسے وہاں کی کچھ خبر ہو جاتی ہے، پھر خود اس کی اپنی خبر بھی نہیں ملتی (کہ وہ کہاں گیا اور اس کے ساتھ کیا ہوا؟) یہ اہلِ تصوّف کی باتیں ہیں (جو محض باتیں ہی باتیں ہیں)۔ لیکن نبی کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اسے خدا کی طرف سے جن حقائق کا علم حاصل ہوتا ہے وہ ان حقائق کو دوسروں تک پہنچاتا ہے اور اس طرح انہیں بھی "اس بادہ کے نشہ میں" برابر کا شریک کر لیتا ہے۔ نبوّت اور تصوّف کے اس فرق کو علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبہ میں نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس کے متعلق میں اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ لیکن یہ وہ حقائق ہیں جنہیں جتنی مرتبہ سامنے لایا جائے، کم ہے۔ تاج محل کو جتنی مرتبہ بھی دیکھئے، ہر بار ایک نئی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ کیٹس کے الفاظ میں، حسن، مسرتِ دوام کا موجب ہوتا ہے A THING OF BEAUTY IS JOY FOR EVER سنو،

وہ اس باب میں کیا کہتے ہیں۔

"محمدؐ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔"

یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبدالقدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوّف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے، جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوّت اور تصوّف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا۔ اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلّط پاکر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے۔ اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکّل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیّت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی رُوح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت اُبھر کر سامنے آگئی ہے، وہ کس انداز کی ہے۔

بہرحال رسول کا پہلا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی وحی کو دوسروں تک پہنچائے۔ یہ گویا تشکیلِ معاشرہ کی پہلی اینٹ ہوتی ہے۔

دعوت علیٰ وجہ البصیرت

رسول اپنا یہ پیغام دوسروں تک، علیٰ وجہ البصیرت پہنچاتا ہے۔ اس میں کسی معجزہ یا مافوق الفطرت قوّت سے کام نہیں

لیتا۔ وہ دلیل و بُرہان کی رُو سے اپنا پیغام دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جو اسے نہیں مانتے، ان سے بھی دلیل و بُرہان طلب کرتا ہے۔ وہ لوگوں کی عقل و فکر اور دانش و بینش کو اپیل کرتا ہے اور اس طرح، اپنے پیغام کی حقانیت کو ثابت کر کے، اسے دوسروں سے منواتا ہے۔ سورۃ یوسف میں ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣعَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (۱۲/۱۰۸)

ان سے کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں خدا کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی (ایسا ہی کرتے ہیں اور ایسا ہی کریں گے)۔

اس میں زبردستی نہیں

رسولؐ کو اس کا بھی اختیار نہیں ہوتا کہ وہ جسے چاہے صحیح راستے پر لگا دے۔ یعنی اس سے اپنا پیغام منوا لے۔ اس کا کام پیغام پہنچانا ہے۔ ماننا نہ ماننا دوسروں کے اختیار میں ہے۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ (۲۸/۵۶) "تو اسے ہدایت نہیں دے سکتا جسے تو محبوب رکھے۔ لیکن اللہ اسے ہدایت دیتا ہے جو ہدایت لینا چاہے" (یا جسے اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ہدایت دے)۔ اور وہ "قانونِ مشیت" یہ ہے کہ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَي الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (۱۰/۱۰۰) "جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ان پر معاملہ مشتبہ رہ جاتا ہے"۔

ایمان کے معنی ہیں کسی بات کی صداقت کو برضا و رغبت، بطیبِ خاطر تسلیم کر لینا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اعترافِ حقیقت میں کسی قسم کے جبر و اکراہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے رسول، نہ تو کسی سے بزورِ شمشیر، اپنے پیغام کو منواتا ہے (کہ یہ جسمانی اکراہ ہے) اور نہ ہی معجزات کے ذریعے (کہ یہ ذہنی اکراہ ہے)۔ سورۃ یونس میں ہے۔

وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّھُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۰/۹۹)

اگر تیرے ربّ کی مشیت ہوتی تو زمین میں جس قدر لوگ ہیں سب ایمان لے آتے (وہ انہیں پیدا ہی اس طرح کر دیتا)، تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا یہاں تک کہ وہ

ایمان لے آئیں۔

یہی وجہ ہے کہ رسولؐ بار بار اعلان کرتا ہے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ "میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں"۔ اس کے مخالف، جو اپنی توہم پرستیوں کی بنا پر سمجھتے تھے کہ رسول کو مافوق البشر

رسول کی بشریت

ہونا چاہیئے۔ اس پر اعتراض کرتے۔ وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ مِنْهَا....... (۲۵/۷-۸) "اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسولؐ ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے (اگر یہ خدا کا فرستادہ تھا تو) اس کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا جو اس کے ساتھ ہو کر لوگوں کو ڈراتا۔ یا اس کی طرف کوئی خزانہ بھیجا جاتا۔ یا اس کا کوئی (طلسماتی قسم کا) باغ ہوتا جس سے یہ کھاتا......" یعنی انہیں اس پر اچنبھا ہوتا کہ رسولؐ بھی انہی جیسا ایک انسان کیوں ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ....... فِی الْاَسْوَاقِ۔...... (۲۵/۲۰) "ہم نے تجھ سے پہلے بھی کوئی رسول نہیں بھیجے مگر یہ کہ وہ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے"۔

یہ ظاہر ہے سلیم! کہ قرآنِ کریم نے ان امور کی اس قدر وضاحت یہ بتانے کے لئے کی ہے کہ نبوّت (یعنی خدا کی طرف سے وحی کا ملنا) تو ایسی خصوصیت تھی جس میں کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ یعنی وہ مافوق الفطرت خاصہ تھا۔ لیکن اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے میں کوئی مافوق الفطرت قوّت یا ذریعہ کارفرما نہیں تھا۔

جماعت کی تشکیل

جو لوگ اس طرح رسولؐ کے پیغام کو تسلیم کر لیتے، رسول انہیں ایک جماعت کے رشتے میں منسلک کئے جاتا۔ شاہراہِ حیات پر گامزن ہونے کے لئے انہیں ایک قافلہ کی شکل میں ترتیب دیئے جاتا۔ اسے تزمیل کہتے ہیں۔ اسی بنا پر رسول اللہؐ کو يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ کہہ کر پکارا گیا ہے (۷۳/۱) یعنی نہایت حسن و خوبی اور شدّت و کثرت سے عملِ تزمیل کرنے والا۔ قافلہ کی بہت عمدہ ترتیب دینے والا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اَلدِّین، اپنے اپنے طور پر، پوجا پاٹ، یا ایشور بھگتی کا نام نہیں۔ یہ اجتماعی نظامِ زندگی ہے اور رسولؐ کا فریضہ، ہم آہنگ افراد کو جماعت کے رشتے میں پرونا ہے۔

یہ جماعت محض فارم ممبری پر دستخط کرنے سے وجود میں نہیں آتی۔ اس کے لئے ان کی تعلیم و تربیت

تعلیم و تربیت

کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ چیز بھی فرائضِ رسالت میں داخل ہوتی ہے۔ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (۲/۱۵۱) "جیسا کہ ہم نے تم میں، تم ہی میں سے ایک رسولؐ بھیجا۔ وہ خدا کی آیات تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔ تمہاری ذات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا ہے اور تمہیں قوانینِ خداوندی اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے"۔ وہ انہیں تلقین کرتا کہ وہ کتاب اللہ کا اتباع کریں۔ اور اس کے سوا کسی اور کی بات نہ مانیں۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۔۔۔۔۔۔ (۷/۳) جو کچھ

اتباعِ کتاب اللہ

تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے سوا کسی دوسرے چارہ سازوں کا اتباع نہ کرو"۔ لیکن وہ کتاب اللہ کے اتباع کی تلقین صرف اپنی جماعت کے افراد ہی کو نہیں کرتا خود بھی اس کا اتباع کرتا اور اس کا کھلے الفاظ میں اعلان کرتا تھا۔ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ (۷/۲۰۳) "ان سے کہو کہ میں صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کیا جاتا ہے"۔

اس جماعت کے ایمانِ محکم اور عملِ پیہم سے آہستہ آہستہ ایک مملکت وجود میں آجاتی ہے۔ جس میں یہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ خود بھی خالص قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں اور دوسروں کو بھی ان کی انسانیت ساز برکات میں شریک کر سکیں۔ یہ مملکت یونہی اتفاقی طور پر وجود

مملکت کی تشکیل

میں نہیں آجاتی بلکہ خدا کے اٹل پروگرام کے مطابق متشکل ہوتی ہے، جس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۔۔۔۔۔۔ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۴/۵۵) "جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور اعمالِ صالح کریں، ان سے اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں استخلاف فی الارض (ملک میں حکومت) عطا کرے گا جیسا اس نے ان لوگوں کو حکومت عطا کی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ اور وہ ان کے لئے ان کے اس دین (نظامِ زندگی) کو متمکن کر دے گا جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اور وہ ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ (اس طرح وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ) وہ صرف میری محکومی اختیار کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو کوئی اس کے بعد اس سے انکار کر دے گا تو یہی لوگ

ہوں گے جو (امن و آزادی کی اس راہ سے نکل کر) دوسری راہ پر چل پڑیں گے۔" اس مملکت کے قیام کے لئے، انہیں ان کے "مخالفین کی زمینوں، بستیوں اور مال و دولت کا وارث" بنادیا جاتا ہے۔ (۳۳/۲۷)

سورۂ نور کی مندرجہ بالا آیت (۲۴/۵۵) میں کہا گیا ہے کہ یہ اسی قسم کا استخلاف فی الارض ہے جس قسم کا تم سے پہلے ان اقوام کو عطا ہوا تھا جنہوں نے ایمان و اعمالِ صالح سے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں دوسرے مقام پر ہے۔ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا۝ (۴/۵۴) "یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت بھی عطا کی اور ایک بہت بڑی مملکت بھی"۔

صدرِ مملکت ظاہر ہے کہ اس مملکت کا رئیس HEAD OF THE STATE بھی رسولؐ ہی ہوتا ہے۔ اس کی موجودگی میں اور کون صدرِ مملکت ہو سکتا تھا؟ وہ اس مملکت میں "معروف کا حکم دیتا اور منکر سے روکتا ہے" (۷/۱۵۷) یعنی کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرتا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ...... (۴/۱۰۵) "ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تو لوگوں میں، اس علم کی رُو سے جو اللہ نے تجھے دیا ہے (متنازعہ فیہ امور کے) فیصلے کرے۔" اس لئے کہ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

مملکت کے واجبات کی وصولی رسولؐ، صدرِ مملکت کی حیثیت سے، لوگوں سے مملکت کے واجبات وصول کرتا تھا (۹/۱۰۳؛ ۸/۱؛ ۸/۴۱؛ ۵۹/۷)۔ ان آیات میں مالِ غنیمت، انفال، فے، صدقات وغیرہ کی وصولی کا ذکر ہے۔ وہ میدانِ جنگ میں فوجوں کی کمان بھی کرتا تھا۔

وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۭ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۝ ۙ (۳/۱۲)

اور جب تو صبح سویرے اپنے اہلِ خانہ سے رخصت ہوا۔ اور پھر (میدانِ جنگ میں)

مومنین کو لڑائی کے مورچوں پر بٹھاتا تھا۔ اور اللہ (سب کچھ) سننے والا جاننے والا ہے۔

فوجوں کی کمان چنانچہ قرآن کریم میں متعدد لڑائیوں کا ذکر ہے جن میں رسول اللہ بحیثیت سپہ سالار شریک تھے۔

امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لئے، وہ مختلف علاقوں میں افسرانِ ماتحت مقرر کرتا تھا۔ اور لوگوں کے نام فرمان جاری کرتا تھا کہ وہ ان افسران کے احکام کی اطاعت کریں۔ لیکن لوگوں کو ان افسروں

افسرانِ ماتحت کے فیصلوں کے خلاف اپیل کا حق حاصل ہوتا تھا۔ یہ اپیل، مرکزِ مملکت (یعنی خود رسولؐ) کے پاس آتی تھی۔ جس کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوتا تھا۔

سورۂ نساء کی اس آیت میں اسی نظامِ مملکت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس میں فرمایا ہے کہ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ (۴/۵۹)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور رسولؐ کی، اور تم میں سے جو صاحبِ اختیار بنا دیئے جائیں، ان کی۔ پھر اگر کسی معاملہ میں (تمہارا اور ان افسرانِ ماتحت کا) تنازعہ ہو جائے تو اس معاملہ کو اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹا دو، اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ (طریقِ کار) بہتر اور انجام کار اچھا ہے۔

میں تمہیں سلیم! اس سے پہلے متعدد خطوط میں بتا چکا ہوں کہ قرآنِ کریم میں "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت سے کیا مقصود ہے۔ اس لئے اس نکتہ کی مزید وضاحت کی یہاں ضرورت نہیں۔ اس مقام پر میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ رسولؐ (بحیثیت صدرِ مملکت) افسرانِ ماتحت کا تعین کرتا تھا اور ان کے فیصلوں کے خلاف اپیل سنتا تھا۔

وہ یہ تمام نظم و نسق، اپنی جماعت کے مشورہ سے کرتا تھا۔ اسے خدا کی طرف سے اس کا حکم دیا جاتا تھا۔ اس سے کہا جاتا تھا کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ..... (۳/۱۵۹) "تو معاملات میں ان کے ساتھ مشورہ کیا کر۔ اور پھر جب کسی معاملہ کا فیصلہ کرلے اور اسے انجام

دینے کا تہیہ، تو قانونِ خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہو جا۔"

اپنی جماعت کے ساتھ یہ مشاورت محض "رسمی" نہیں ہوتی تھی۔ قرآنِ کریم نے اس جماعت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ سورۃ انفال میں ہے یَاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ o (۸/۶۴)۔ اس آیت کے یہ معنی بھی ہیں کہ اے نبیؐ! اللہ تیرے لئے' اور مومنین میں سے جو تیرا اتباع کرتے ہیں' ان کے لئے کافی ہے۔ اور یہ معنی بھی کہ اے نبیؐ! اللہ' اور مومنین میں سے جو تیرا اتباع کرتے ہیں' وہ تیرے لئے کافی ہیں۔ یہی وہ جماعتِ مومنین ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم نے اس وجد و مسرت

جماعت کی اہمیت

کے ساتھ کیا ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ ...... اَجْرًا عَظِیْمًا (۴۸/۲۹) "محمدؐ، اللہ کا رسول اور اس کے ساتھی! ان کی کیفیت یہ ہے کہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور باہمدگر بڑے ہمدرد اور مشفق۔ تو انہیں دیکھتا ہے' کبھی رکوع میں ہیں' کبھی سجدے ہیں (ہمیشہ قوانینِ خداوندی کے سامنے تسلیم خم کئے) وہ اپنے رب کا فضل اور اس کے قوانین سے ہم آہنگی چاہتے ہیں۔ اطاعتِ خداوندی کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ہیں۔ توریت اور انجیل میں یہ ان کی مثال ہے۔ کھیتی کی طرح جو پہلے اپنی ننھی سی سوئی نکالتی ہے۔ پھر اسے مضبوط کرتی ہے سو وہ موٹی ہو جاتی ہے۔ پھر اپنی نالوں پر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ کسان کا دل اس (کھیتی کی برومندی سے) باغ باغ ہو جاتا ہے اور ان کے مخالفین اس سے غم و غصہ میں (اپنی انگلیاں کاٹتے) ہیں۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لاتے اور اعمالِ صالح کرتے ہیں' اللہ نے ان سے (تباہیوں سے) حفاظت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔" یہ تھی وہ جماعت جس کے ساتھ مشورہ سے

اجتہادی غلطیاں

رسول اللہ امورِ مملکت کو سرانجام دیتے تھے۔ ان فیصلوں میں کبھی غلطی بھی ہو جاتی تھی۔ اس کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَاۤ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ ۚ وَ اِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْۤ اِلَیَّ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ o (۳۴/۵۰)

ان سے کہہ دو کہ اگر میں غلطی کرتا ہوں تو یہ (غلطی) میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے (اور اس کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے) اور اگر میں سیدھے راستے پر ہوں تو یہ اس وحی کی بنا پر ہے جو میرا رب میری طرف بھیجتا ہے۔ وہ سب کچھ) سننے والا اور (سب

چوالیسواں خط

ضبطِ ولادت

FAMILY PLANNING

"سلیم کے نام خطوط" کی اس جلد کو سابقہ خط کے ساتھ ختم ہو جانا چاہیئے تھا. لیکن اس دوران میں، عنوانِ بالا پر' ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے اس جلد میں شامل کیا جائے.

○

بالخصوص اس لئے کہ اس جلد میں "جنسیات کا تمدن پر اثر" کے عنوان سے جو خط شائع ہو رہا ہے' ضبطِ ولادت' اسی کی کڑی ہے. امید ہے قارئین اس اہمیت کے پیشِ نظر' ترتیب کی اس بے ربطی سے درگذر فرمائیں گے. (طلوعِ اسلام ٹرسٹ)

○

تم نے ٹھیک کہا ہے، سلیم! کہ آجکل دنیا میں، جس مسئلہ نے (ایٹم بم کے بعد) اقوامِ عالم کی توجہات کو سب سے زیادہ اپنی طرف مرکوز کر رکھا ہے' وہ برتھ کنٹرول یا ضبطِ ولادت ہے. اس سے پہلے' ضبطِ ولادت کے آلات و ادویات یا طرق و ذرائع محض انفرادی دلچسپی کا موجب تھے لیکن

اب انہوں نے اجتماعی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اسی نسبت سے اس مسئلہ کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے۔ اس وقت مانع حمل تدابیر بالعموم اس مقصد کے لئے استعمال کی جاتی تھیں کہ ناجائز جنسی اختلاط پر مہرِ تصدیق ثبت نہ ہونے پائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اُس وقت یہ تدابیر بعض حالات میں جائز مقصد کے لئے بھی استعمال کی جاتی تھیں۔ مثلاً بیوی کی صحت کے پیشِ نظر۔ لیکن ان کا عمومی مقصد ناجائز تعلقات کے نتائج و عواقب سے محفوظ رہنا ہی تھا۔ اب اس مسئلہ نے اور شکل اختیار کر لی ہے۔ اور وہ یہ کہ جس رفتار سے دنیا کی آبادی بڑھ رہی ہے' زمین کی پیداوار (یعنی سامانِ خورونوش) میں اس نسبت سے اضافہ نہیں ہو رہا۔ نہ ہی سردست (یا یوں کہیئے کہ فوری طور پر) ایسا کیا جانا ممکن ہے۔ اس لئے خدشہ یہ ہے کہ اگر صورتِ حالات کچھ وقت تک یہی رہی تو دنیا بھوک سے مر جائے گی۔ اس خدشہ کے پیشِ نظر سوچا یہ جا رہا ہے کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے آبادی کا یہ بے محابا اضافہ محدود ہو جائے۔ اسی کو خاندانی منصوبہ بندی (یا FAMILY PLANNING کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ نہ ہو کہ (جس طرح آجکل ہمارے ہاں ہو رہا ہے) ایک میاں بیوی کے ہاں جتنے بچے پیدا ہو سکتے ہیں' ہوتے چلے جائیں' بلکہ ایسا انتظام کیا جائے کہ ملک میں سامانِ خوراک کی نسبت سے' بچوں کی تعداد کی حد بندی ہو جائے۔

دیگر اقوامِ عالم اس مسئلہ پر قومی مصالح کی روشنی میں غور و فکر کر رہی ہیں۔ یعنی وہ یہ سوچتی ہیں کہ اس سوال کا قومی معیشت' ملکی سیاست اور عوام کی صحت پر کیا اثر پڑے گا لیکن تم جانتے ہو سلیم! کہ ہمیں اس پر (ان مصالح کے علاوہ) ایک اور نقطۂ نگاہ سے بھی غور کرنا ہو گا۔ یعنی یہ کہ اسلام کا اس باب میں کیا حکم ہے؟ ہمارے مذہبی طبقہ میں' اس سلسلہ میں دو گروہ سامنے آ رہے ہیں۔ ایک کا خیال ہے کہ ضبطِ ولادت بالکل جائز ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ قطعاً ناجائز ہے۔ اس حد تک ناجائز کہ

> ایسی کوئی تحریک اگر آنحضرتؐ کے سامنے اُٹھتی تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس پر لعنت بھیجتے اور اس کے خلاف ایسا ہی جہاد کرتے جیسا شرک و بُت پرستی کے خلاف آپ نے کیا۔
>
> (ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۶۰ء' سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

جو گروہ ضبطِ ولادت کو جائز قرار دیتا ہے وہ اپنے خیال کی تائید میں ان احادیث کو پیش کرتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ نبیٔ اکرمؐ نے عزل[1] کی اجازت دی تھی۔ دوسرا گروہ ان احادیث کی صحت سے تو انکار نہیں کرتا لیکن کہتا یہ ہے کہ

> عزل کی اجازت میں جو چند روایات مروی ہیں ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوریاں بیان کیں اور آنحضرتؐ نے انہیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دے دیا۔ اس طرح کے جو جوابات نبیؐ سے حدیث میں منقول ہیں ان سے اگر عزل کا جواب نکلتا بھی ہے تو وہ ہرگز ضبطِ ولادت کی کی اس عام تحریک کے حق میں استعمال نہیں کیا جا سکتا جس کی پشت پر ایک باقاعدہ خالص مادہ پرستانہ اور اباحت پسندانہ فلسفہ کارفرما ہے۔ (ایضاً)

لیکن سلیم! میں کہتا ہوں کہ عزل سے متعلق روایات سے اس مسئلہ کے جواز یا عدم جواز کی سند پیش کرنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس لئے کہ یہ روایات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ نبیٔ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اطہر کی طرف ان کی نسبت کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ یعنی ان روایات کا مضمون بتا رہا ہے کہ یہ وضعی ہیں۔ حضورؐ نے ایسا کبھی نہیں فرمایا ہوگا۔ عزل سے متعلق بخاری کی ایک روایت میں ہے:۔

> حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن وہ نبیؐ کے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے کہا کہ ہم (جہاد میں) قید کی ہوئی لونڈیوں سے جماع کرتے ہیں۔ چونکہ ہم ان کو بیچنا چاہتے ہیں (اس لئے یہ نہیں چاہتے کہ وہ حاملہ ہو جائیں) پس آپ عزل کی نسبت کیا رائے دیتے ہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ تم لوگ ایسا کرتے ہو؟ تم کو کچھ مجبوری نہیں ہے اگر تم ایسا نہ کرو اس لئے کہ جس جان کا پیدا کرنا اللہ نے مقدر کر دیا وہ ضرور پیدا ہو گی[2]۔

دوسری روایت ہے کہ

---

[1] جنسی اختلاط تو کرنا لیکن مادۂ تولید کا انزال رحم کے اندر نہ ہونے دینا۔
[2] بخاری جلد اول، ترجمہ شائع کردہ نور محمد کراچی صفحہ ۲۹۲۔

ابنِ محریز کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید کو دیکھا ہے اور میں نے ان سے (کچھ) دریافت
کیا تھا تو انہوں نے کہا کہ غزوہ بنی مصطلق میں ہم نبیؐ کے ہمراہ گئے تو ہم نے
عرب کے قیدیوں میں سے کچھ قیدیوں کو پایا۔ پھر ہمیں عورتوں کی خواہش ہوئی
اور تجرد نے ہم پر غلبہ پالیا تو ہم نے عزل کی خواہش کی۔ پس ہم نے رسولِ خداؐ سے
اس کے بارے میں پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا اگر تم یہ نہ کرو تو تم کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔
کیونکہ قیامت تک جو جان پیدا ہونے والی ہے وہ تو ضرور پیدا ہو گی[1]۔

یہ روایات کسی تبصرہ، اور اپنے وضعی ہونے کے لئے، کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ میرے نزدیک انہیں نبیِ اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کرنا بہت بڑی جسارت اور حضورؐ کی شانِ اقدس میں انتہائی سوءِ ادبی ہے۔

مذہبی طبقہ کی طرف سے ضبطِ ولادت کے خلاف جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ اس نوعیت کے ہیں کہ:-

(۱) اس سے حرامکاری کے دروازے کھُل جاتے ہیں۔
(۲) یہ قتلِ اولاد ہے جو اسلام میں بہت بڑا جرم ہے۔
(۳) بھوک کے خوف سے ایسا کرنا، خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی ہے۔

قبل اس کے کہ اس سوال (ضبطِ ولادت) کے متعلق قرآنی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے، مختصر طور پر مندرجہ بالا اعتراضات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس سے حرامکاری کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اوّل تو یہ دیکھو سلیم! یہ اعتراض "ضبطِ ولادت" کے خلاف نہیں بلکہ ان تدابیر کے خلاف ہے جو عام طور پر اس مقصد کے لئے اختیار کی جاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ضبطِ ولادت کا مسلک اختیار کرتا ہے لیکن حرامکاری سے بچا رہتا ہے، تو اس کا یہ مسلک اسلامی نقطۂ نگاہ سے کیسا ہوگا۔ اگر یہ مسلک جائز ہوگا تو پھر ضبطِ ولادت کے خلاف کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ اعتراض ان تدابیر کے خلاف ہونا چاہیئے جن

[1] بخاری جلد اوّل، ترجمہ شائع کردہ نور محمد کراچی، صفحہ ۵۷۳۔

سے حرامکاری کے پھیلنے کا اندیشہ ہو۔ اور اگر ضبطِ ولادت، بہرحال ناجائز ہے تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کے لئے ذرائع کس قسم کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر ضبطِ ولادت ناجائز نہیں، اور ملک کے اجتماعی مصالح کے پیشِ نظر اس کا اختیار کیا جانا ضروری ہے تو پھر سوچنا یہ چاہیئے کہ

(i) اس کے لئے ذرائع ایسے اختیار کئے جائیں جو حرامکاری پھیلانے کا سبب نہ بن سکیں اور

(ii) اگر سرِدست ایسے ذرائع میسّر نہیں آسکتے، تو ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے لوگ ان ذرائع کا ناجائز استعمال نہ کریں۔

یہ دلیل کہ چونکہ لوگ ان ذرائع کا غلط استعمال کریں گے اس لئے اصل مقصد ہی کو ختم کر دینا چاہیئے، جس قسم کا وزن رکھتی ہے، اہلِ علم و دانش کے لئے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے (مثلاً) یہ تجویز کیا جائے کہ چونکہ لوگ بلاٹکٹ سفر کرتے ہیں اس لئے ریلوں کو بند کر دیا جائے۔ یا عورتیں مٹی کا تیل کپڑوں پر چھڑک کر خودکشی کر لیتی ہیں، اس لئے مٹی کے تیل کا استعمال (بلکہ یوں کہئے کہ ماچس کا استعمال) ممنوع قرار دے دیا جائے۔ یا ملک میں آئے دن چاقو چلنے کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں اس لئے چاقو بننے بند کر دینے چاہئیں۔ حتیٰ کہ اس دلیل کو اور آگے بڑھایا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ حرامکاری بہرحال عورتوں کی موجودگی سے ہوتی ہے اس لئے حرامکاری کو بند کرنے کے لئے تمام عورتوں کو ملک بدر کر دیا جائے!

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اگر ضبطِ ولادت فی نفسہٖ ناجائز نہیں، تو ہمارے لئے سوچنے کی بات صرف یہ ہوگی کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ذرائع کیا اختیار کئے جائیں۔ اور وہ کون سی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے ان ذرائع کا غلط استعمال نہ ہو۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ "قتلِ اولاد" ہے۔ یعنی اگر جنسی اختلاط کیا جائے اور حمل قرار نہ پانے دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی اولاد کو قتل کرتے ہیں۔ یہ اعتراض بے حد کمزور ہے۔ اوّلاً یہ کہ جو بچہ وجود ہی میں نہیں آیا اسے قتل کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کے مادۂ تولید میں بچہ بن جانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اگر استقرارِ حمل روک دیا جائے تو وہ صلاحیت محسوس پیکر اختیار نہیں کرتی اس لئے یہ قتلِ اولاد ہے۔ تو اس دلیل کا بودا پن واضح ہے۔ مثلاً

(۱) اگر ایک شخص جوان ہونے کے باوجود' نکاح نہیں کرتا. یا دیر میں نکاح کرتا ہے تو اسے بھی قتل کا مرتکب قرار پانا چاہیئے. اس لئے کہ اس نے اپنے اس عمل سے' نہ معلوم کتنے بچوں کو وجود میں آنے سے روک دیا!

(۲) مادۂ تولید کے ایک قطرہ میں کروڑوں نہیں لاکھوں جرثومے ہوتے ہیں جن میں سے ہر جرثومہ میں بچہ بن جانے کی صلاحیت ہوتی ہے. اوّل تو یہ بھی نہیں ہوتا کہ ہر جنسی اختلاط پہ بالضرور حمل قرار پا جائے. اس صورت میں' ہر اختلاط سے لاکھوں بچے قتل ہو جاتے ہیں. اور جب حمل قرار پا جائے تو' ان لاکھوں جرثوموں میں سے' صرف ایک جرثومہ بچہ کی صورت اختیار کرتا ہے. (یا زیادہ سے زیادہ دو تین جرثومے). باقی تمام جرثومے ضائع چلے جاتے ہیں. ان جرثوموں کو بھی ہلاک شدہ اولاد تصوّر کرنا چاہیئے.

(۳) استقرارِ حمل کے بعد جنسی اختلاط تو بہرحال قتلِ اولاد قرار پا جائے گا. کیونکہ اس کے بعد تمام جرثومے ضائع ہو جاتے ہیں. نیز اگر میاں بیوی میں سے کوئی عقیم (بانجھ) ہو تو فریقِ ثانی کے تمام حیات آور جرثومے مستقلاً ضائع ہو جاتے ہیں. کیا اسے بھی قتلِ اولاد تصوّر کیا جائے گا.

ان اعتراض کرنے والوں کی کوتاہ نظری پر غور کرو. یہ لوگ ان بچوں کے "قتل" پر توماتم کرتے ہیں جو وجود ہی میں نہیں آتے لیکن ان بچوں کی طرف ان کی نگاہ قطعاً نہیں اٹھتی جو (غذا کی کمی کی وجہ سے) کمزور پیدا ہوتے ہیں. کیڑے مکوڑوں کی طرح گلیوں کی گندی نالیوں میں رینگتے پھرتے ہیں اور طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں. یہ محض اس لئے ہوتا ہے کہ ان کی پرورش اور خوراک کا مناسب انتظام نہیں ہو سکتا. یہ حضرات بچوں کے اس طرح قتل کو تو قابلِ اعتراض نہیں سمجھتے لیکن بچوں کو وجود میں نہ لانے کو جرمِ عظیم قرار دیتے ہیں. اگر اتنے ہی بچے پیدا ہوں جتنوں کی عمدہ پرورش ہو سکے تو اس طرح بچوں کا قتل واقعہ ہی نہ ہو.

اب تیسرے اعتراض کو لو. یعنی یہ کہ بچوں کی پیدائش پر حد بندی کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اللہ کی رزاقیت پر ایمان نہیں. یہ سوال نسبتاً تفصیلی گفتگو چاہتا ہے.

قرآنِ کریم میں ہے وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۚ (۶/۱۵۲ ؛ ۱۷/۳۱) " اور تم اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو. ہم انہیں بھی رزق

دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔" اس سے بھی وسیع مفہوم میں دوسرے مقام پر ہے۔ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) "زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔" ان اور انہی جیسی دیگر آیات کو اس خیال کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے کہ جب رزق کا ذمہ اللہ نے لے رکھا ہے تو پھر اس خیال سے کہ اگر آبادی زیادہ ہو گئی تو انہیں کھانے کو نہیں ملے گا، پیدائش پر تحدید خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی ہے۔ ان آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے، اس کی بابت میں تمہیں شرح و بسط سے متعدد بار لکھ چکا ہوں۔ اس لئے اس کا بار بار دہرانا ضروری نہیں۔ تم اس مقام پر صرف یہ دیکھو کہ جو مطلب ہمارا مذہب پرست طبقہ لیتا ہے، اس کا عملی نتیجہ کیا ہے۔ مثلاً

۱۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی (کم از کم) آدھی آبادی ایسی ہے جسے دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ اور جب قحط پڑتا ہے تو لاکھوں افراد بھوک سے مر جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب تمام مخلوق کے رزق کی ذمہ داری خدا نے لے رکھی ہے تو اس قدر مخلوق خالی پیٹ کیوں سوتی ہے اور اتنی آبادی بھوک سے کیوں مر جاتی ہے؟

۲۔ کہا جائے گا کہ یہ لوگ حصولِ رزق کے لئے کوشش نہیں کرتے۔ لیکن یہ بھی غلط ہے۔ قحط کے زمانے میں ہزار کوشش کے باوجود کچھ نہیں ملتا۔ اور عام حالات میں بھی کیفیت یہ ہے کہ (مثلاً) ایک مزدور دن بھر محنت کرتا ہے۔ شام کو اسے دو روپے ملتے ہیں۔ اس کی ایک بیوی اور آٹھ بچے ہیں۔ دو روپے میں اتنا آٹا نہیں ملتا جس سے ان افرادِ خاندان کا دو وقت پیٹ بھر سکے۔ اس لئے انہیں ایک وقت فاقہ کرنا پڑتا ہے۔

۳۔ اس پر یہ لوگ کہہ دیں گے کہ یہ ملک کا غلط معاشی نظام ہے جس کی وجہ سے اس مزدور کو اتنا نہیں ملتا جس سے اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا پیٹ بھر سکے۔ اسے اُجرت اتنی ملنی چاہیئے جس میں اس کا گذارہ ہو جائے۔

لیکن یہ کہنے سے یہ حضرات نہیں سوچتے کہ اس سے یہ خود "خدا کی رزاقیت" سے نیچے اُتر کر، انسانوں کے معاشی نظام کی طرف آجاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ چیز خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی نہیں؟ ان حضرات کے مسلک کی رُو سے یہ چیز یقیناً خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی ہے۔ لیکن تم جب ان آیات کے صحیح مفہوم کو سامنے لاؤ گے تو اس نتیجہ پر پہنچ جاؤ گے کہ یہ چیز خدا کی رزاقیت

کے منافی نہیں۔ ان آیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ ملک کا معاشی نظام ایسا ہونا چاہیئے جو خدا کی اس ذمّہ داری کو لپنے اوپر لے اور افرادِ مملکت کو اطمینان دلا دے کہ ان کے رزق کی ذمّہ داری مملکت کے سر ہے۔

اب ایک قدم آگے بڑھو! اگر صورتِ حالات ایسی ہو کہ، مملکت کی تمام کوششوں کے باوجود، ملک میں اتنی پیداوار نہ ہو سکے جس سے تمام آبادی کو ضرورت کے مطابق رزق مل سکے اور مملکت کے پاس اتنے ذرائع بھی نہ ہوں کہ باقی ماندہ ضرورت پوری کرنے کے لئے باہر سے غلّہ منگا سکے، اور اس کے ساتھ ہی ملک کی آبادی میں بے محابا اضافہ ہوتا جارہا ہو تو ایسی صورت میں وہ مملکت کیا کرے؟ کیا ایسی صورت میں یہ بہتر ہوگا کہ آبادی بے حدو نہایت بڑھتی اور بھوک سے مرتی جائے یا یہ کہ آبادی کے بڑھنے کی حد بندی کر دی جائے تاکہ لوگوں کو بافراط رزق مل جائے؟ ہمارا مذہب پرست طبقہ کہتا ہے کہ پہلی صورت اسلام کی تعلیم اور منشائے خداوندی کے مطابق ہے اور دوسری شکل شریعت کی رُو سے ناجائز۔ اس میں کلام نہیں کہ بہترین شکل یہ ہوگی کہ ملک کی آبادی کی نسبت سے پیداوار بڑھائی جائے، لیکن میں اسے پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ اگر صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ پوری کوشش کے باوجود ملک کی پیداوار، آبادی کی بڑھتی ہوئی رفتار کا ساتھ نہ دے سکے، تو اس وقت کیا کیا جائے؟

ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ اگر تمام دنیا کی پیداوار اور آبادی کو سامنے رکھا جائے تو پیداوار ضرورت سے کم نہیں ہو گی۔ سو اوّل تو یہ گفتگو محض قیاسی ہے۔ اعداد و شمار پر مبنی نہیں۔ (بلکہ جس قدر اعداد و شمار مہیا ہو سکتے ہیں وہ اس مفروضہ کے خلاف جاتے ہیں) لیکن دنیا آج کل جس طرح اقوام کے دائروں میں بٹی ہوئی ہے، اس کے پیشِ نظر، ہر قوم کی اپنی اپنی ضرورت اور اسے پورا کرنے کے اپنے اپنے ذرائع ہیں۔ جن اقوام میں فاضلہ پیداوار ہوتی ہے، وہ، اس کی قیمت وصول کئے بغیر، دوسری اقوام کو نہیں دیتیں۔ اور اس کی قیمت میں جو کچھ دینا پڑتا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ اس لئے سردست ساری دنیا کی پیداوار اور آبادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب، قرآنی تصوّر کے مطابق، تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری کی شکل اختیار کرے گی اور "مافی السمٰوٰت والارض" انسان کے زیرِ تسخیر آجائے گا۔ اس وقت رزق کی کمی کا مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ بحالاتِ موجودہ اس کا کیا حل ہے؟

●

آؤ اب دیکھیں کہ "ضبطِ ولادت" کے معاملہ میں قرآنِ کریم سے ہمیں کیا راہنمائی ملتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ سمجھ لو سلیم! کہ قرآنِ کریم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ تم ساری عمر بچے پیدا کرتے رہو اور اگر کسی نے اس میں کوتاہی کی، یا ایک حد تک پہنچ کر رُک گیا، تو قیامت میں اس سے بازپُرس کی جائے گی۔ انسان میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے لیکن جس طرح دیگر صلاحیتوں اور قوتوں کو بہرحال عندالضرورت استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح اسے بھی ضرورت کے مطابق استعمال کیا جائے گا۔ اگر کسی کے بازوؤں میں قوت ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ وہ ضرورتاً یا بلا ضرورت اس قوت کو استعمال کرتا رہے۔ اسے بہرحال عندالضرورت ہی استعمال کیا جائے گا۔ یہی کیفیت دیگر صلاحیتوں اور قوتوں کی ہے۔ ان کا بلا ضرورت استعمال اسراف و تبذیر ہے۔ جس کی قرآنِ کریم میں سخت ممانعت آئی ہے۔ لہٰذا اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کو اس وقت بروئے کار لانا چاہیئے جس وقت اولاد پیدا کرنے کی ضرورت ہو۔ اب رہا اولاد کی ضرورت کا سوال! سو اس میں شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم نے بیوی بچوں کی محبت کو وجہِ جاذبیت بتایا ہے (وہ رہبانیت کی زندگی بسر کرنا نہیں سکھاتا) لیکن اس نے یہ کہیں نہیں کہا کہ اولاد پیدا کرنے کا سلسلہ متواتر جاری رکھو۔ یعنی جب ایک بچہ پیدا ہو جائے تو دوسرے بچے کی پیدائش کی بنیاد فوراً رکھ دو۔ بچوں کو عندالضرورت پیدا کرنا ہی اس صلاحیت کا صحیح استعمال ہے۔ قرآنِ کریم کی اس آیت کا یہی مفہوم ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (۲/۲۲۳) "تمہاری عورتیں تمہارے لئے کھیتی (کے بمنزلہ) ہیں۔ سو تم اپنی کھیتی میں جب چاہے آؤ"۔ کھیتی کی تشبیہ سے یہ کہنا مقصود ہے کہ عورتیں اولاد کی پیدائش کا ذریعہ ہیں۔ اور "جب چاہو" سے مراد یہ ہے کہ جس طرح کھیت میں عندالضرورت فصل اگائی جاتی ہے۔ اسی طرح اولاد بھی عندالضرورت پیدا کی جائے گی۔ مثلاً کھانے پینے کے معاملہ میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا (۲/۵۸) "تم اس سے جب جی چاہے بافراغت کھاؤ"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد "عندالضرورت کھانا" ہی ہے نہ کہ ہر وقت کھاتے رہنا۔ (اس نکتہ کی مزید وضاحت آگے چل کر آئے گی)۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ تم مسلسل بچے پیدا کرتے رہو۔ نہ ہی فطرت نے انسان کو حیوانوں کی طرح مجبور کیا ہے کہ ایک وقت کے بعد اسے ضرور بچہ پیدا کرنا ہوگا۔ انسان کے ہاں بچے عندالضرورت پیدا کئے جائیں گے۔ اسی کو خاندانی

منصوبہ بندی یا FAMILY PLANNING کہتے ہیں. اگر بیوی کی صحت خراب ہے تو آپ کو کوئی مجبور نہیں کرتا کہ آپ ضرور بچہ پیدا کریں. اگر (موجودہ معاشی نظام میں) آپ کی آمدنی اتنی نہیں کہ آپ زیادہ بچوں کی کفالت کرسکیں تو آپ بچوں کی تعداد پر خود حد بندی عائد کرسکتے ہیں. یہ انفرادی مثالیں ہیں. اگر اجتماعی مصالح کا تقاضا ہے کہ ملک میں زیادہ بچے پیدا نہ ہوں تو افزائشِ نسل کی تحدید کی جاسکتی ہے. اگر اجتماعی مصالح کی خاطر خوراک کا راشن کیا جاسکتا ہے (اور راشن اس کے سوا اور کیا ہے کہ خوراک کی حد بندی کردی جاتی ہے) اگر جانوروں کی کمی کی وجہ سے ہفتہ میں دو دن گوشت کا ناغہ کیا جاسکتا ہے تو اس قسم کے ہنگامی حالات میں بچوں کی تعداد پر حد بندی کیوں نہیں عائد کی جاسکتی؟ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے ایک شخص کے انفرادی ذوق کو ٹھیس لگتی ہے (یعنی اس کا جی چاہتا ہے کہ اس کے ہاں زیادہ بچے ہوں). لیکن اجتماعی مصالح کی خاطر، انفرادی ذوق کا کسی حد تک ایثار کرنا ہی پڑتا ہے. کتنے لوگ ہیں کہ ہفتہ بھر کے راشن کی شکر، ان کے ایک دن کے ذوق کی تسکین بھی نہیں کرسکتی. لیکن اجتماعی ضرورت کے لئے انہیں راشن قبول کرنا پڑتا ہے. البتہ مستثنیات کی ہر قانون اور قاعدے میں رعایت رکھی جاتی ہے.

میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان میں ضبطِ ولادت (یا خاندانی منصوبہ بندی) کی سکیم بالضرور نافذ ہونی چاہیئے. مطلب یہ ہے کہ اگر تمام حالات کا جائزہ لینے اور زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے پوری پوری کوشش کے بعد بھی حالات ایسے ہوں جن میں آبادی کی تحدید ناگزیر ہوجائے، تو اس صورت میں اس قسم کا اقدام قرآنی تعلیم کے خلاف نہیں ہوگا.

اب میں اس سوال کی طرف آتا ہوں کہ اس کے لئے (عند الضرورت) ذرائع کیا اختیار کئے جائیں. یہ سوال بڑا اہم ہے اور گہری توجہ کا محتاج. اس لئے کہ اس میں بنیادی نکتہ ایسا ہے جو شاید تمہارے سامنے پہلی مرتبہ آئے اور چونکہ وہ ہمارے عام تصورا ور دنیا وجہان کی روش کے خلاف دکھائی دے گا، اس لئے اگر تم نے اسے سطحی نظر سے دیکھا تو بات کی تہہ تک پہنچنا مشکل ہوگا.

ہمارے ہاں ازدواجی زندگی کا بنیادی مقصد، جنسی اختلاط ہوتا ہے[1]. باقی مقاصد ثانوی حیثیت رکھتے ہیں. لیکن قرآن کریم کی رُو سے اس کا بنیادی مقصد، رفاقت COMPANION SHIP ہے (زوج کا

---

[1] یہی وجہ ہے کہ رخصتی کے بعد اس جوڑے کی پہلی ملاقات، جنسی اختلاط پر منتج ہوتی ہے.

مفہوم ہی یہ ہے)۔ وہ واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۳۰/۲۱) "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی کہ اس نے خود تم میں سے تمہاری ازواج پیدا کیں تاکہ تمہیں ان سے سکون حاصل ہو۔ اور اس نے تم میں محبت اور رحمت پیدا کی۔ یقیناً اس حقیقت میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں"۔ یعنی محض جذباتی نگاہ سے دیکھو تو سلسلۂ ازدواج جنسی جذبات کی تسکین اور افزائشِ نسل کا ذریعہ دکھائی دے گا۔ لیکن ذرا فکر کی آنکھ سے دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ اس سے مقصود رفاقتِ باہمی، سکون، محبت اور رحمت ہے۔ جنسی جذبات کی تسکین یا افزائشِ نسل ثانوی چیز ہے۔

اس کے بعد جنسی جذبہ کی طرف آؤ۔ معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے ابنِ آدم کے کان میں یہ افسوں کچھ اس طرح پھونکا کہ اس کی ساری تاریخ اس سے متاثر چلی آ رہی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ میں تمہیں ایک خط میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ "انسانی فطرت" کا تصور فریب سے زیادہ کچھ نہیں۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ فطرت مجبور اشیاء کی روشِ زندگی کا نام ہے۔ جو صاحبِ اختیار ہو اس کی فطرت کیا؟ البتہ اس کی طبعی زندگی کے کچھ تقاضے ہیں، اور اس کے بعد بلند انسانی زندگی کے مقاصد۔ جہاں تک طبعی تقاضوں کا تعلق ہے وہ حیوانات اور انسان میں مشترک ہیں۔ بھوک اور پیاس انسان کے طبعی تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کی کیفیت یہ ہے کہ (مثلاً) تم کسی گہری سوچ میں منہمک ہو۔ تمہیں پیاس لگتی ہے۔ اس تقاضے کی ابتدائی منازل میں تم پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لیکن یہ تقاضا آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا ہے تا آنکہ یہ تمہارے انہماک پر غالب آ جاتا ہے۔ اگر تم اس پر بھی اس کی تسکین کا سامان بہم نہیں پہنچاتے (پانی نہیں پیتے) تو تم بیمار ہو جاتے ہو۔ اس پر بھی پانی نہیں پیتے تو تمہاری موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی حالت بھوک کے تقاضے کی ہے، اگرچہ اس میں موت نسبتاً زیادہ وقت کے بعد واقع ہوتی ہے۔ اس سے تم نے دیکھا کہ طبعی تقاضے جسم کی ضرورت کے ماتحت، از خود اُبھرتے ہیں اور اگر ان کی تسکین نہ کی جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اور آخر الامر مر جاتا ہے۔ تم سوچو سلیم! کہ کیا جنسی تقاضا بھی اسی قسم کا ہے؟ بادنیٰ تعمق تم اس نتیجہ پر پہنچ جاؤ گے کہ یہ تقاضا اس قسم کا نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا۔ ساری عمر میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوتا کہ تم اپنے کام یا خیالات میں منہمک ہو اور جنسی تقاضا (پیاس کی طرح از خود اُبھر آیا ہو۔

یہ تقاضا کبھی نہیں اُبھرتا جب تک تم اسے خود نہ ابھارو۔ یہ کبھی بیدار نہیں ہوتا جب تک تمہارے خیالات اسے بیدار نہ کریں۔

حیوانات میں یہ تقاضا از خود بیدار ہوتا ہے لیکن صرف اس وقت جب ان سے فطرت نے افزائشِ نسل کا کام لینا ہوتا ہے۔ تم سانڈ کو دیکھو۔ وہ سال بھر گایوں کے گلے میں پھرتا رہے گا لیکن نہ کبھی کوئی گائے اس کی توجّہ اپنی طرف مبذول کرائے گی، نہ وہ خود اس کی طرف متوجّہ ہوگا۔ لیکن جب ان کے اختلاط کا موسم MATING SEASON یا وقت آئے گا تو یہ جذبہ از خود بیدار ہو جائے گا اور اختلاط کے بعد از خود سو جائے گا۔ تم نے دیکھا کہ وہاں بھی یہ جذبہ بھوک اور پیاس کے جذبات کی طرح نہیں۔ یہ صرف اس وقت بیدار ہوتا ہے جب اس سے افزائشِ نسل مقصود ہو۔

لیکن انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ انسان ان تقاضوں کو اپنے اختیار سے اُبھار سکتا ہے۔ تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ فطرت نے حیوان اور انسان میں یہ فرق کیوں رکھا ہے؟ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ فطرت اولاد پیدا کرنے کے معاملہ میں انسان کو حیوانات کی طرح 'مجبور' نہیں رکھنا چاہتی۔ حیوانات کو جب "اُدھر کا اشارہ[1]" ہوتا ہے تو وہ اولاد پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن انسان کے معاملہ میں فطرت ایسا نہیں کرنا چاہتی۔ وہ اس معاملہ کو انسان کے اختیار میں دے دیتی ہے کہ وہ جب اولاد پیدا کرنا چاہے، اپنی مرضی سے اس جذبہ کو ابھارے اور افزائشِ نسل کی صلاحیت کو بروئے کار لے آئے۔

لیکن انسان، جس طرح دیگر معاملات میں اپنے اختیار کو ناجائز استعمال کرتا ہے اسی طرح اس معاملہ میں بھی کرتا ہے۔ فطرت نے اس کی طبعی ضروریات کو پورا کرنے کے سلسلہ میں یہ التزام بھی رکھا ہے کہ ضرورت پوری ہونے کے ساتھ کچھ لذّت بھی مل جائے۔ مثلاً غذا سے مقصود، جسم کی پرورش ہے لیکن فطرت نے غذاؤں میں لذّت بھی رکھ دی ہے۔ اب دیکھو کہ انسان نے اس باب میں کیا کیا ہے؟ اس نے ضرورت کے پہلو کو محض بامر مجبوری ساتھ رکھا ہے اور لذّت کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دیتا چلا گیا۔ چنانچہ اب حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہمارے (کھاتے پیتے گھرانوں میں) کھانوں میں ایک

---

[1] چاک مت کر جیب بے ایامِ گل کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے (غالب)

فیصد "ضرورت"، کا پہلو ہوتا ہے تو ننانوے فیصد لذّت کا۔ حصولِ لذّت ممنوع نہیں، بشرطیکہ لذّت ضرورت کے تابع رہے، نہ کہ مقصود بالذات بن جائے جس طرح انسان نے، اپنے اختیار و ارادہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر، کھانے پینے کے معاملہ میں لذّت کو مقدّم قرار دے لیا اور ضرورت کو مؤخر، اس طرح اس نے جنسی صلاحیّت کے ساتھ کیا۔ وہ صلاحیّت ملی تھی افزائشِ نسل کی خاطر (جس کے ساتھ فطرت نے لذّت بھی شامل کر دی تھی) لیکن اس نے جنسی لذّت کو مقصود بالذات سمجھ لیا اور ضرورت کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ حتّٰی کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس نے ضرورت کے عنصر کو خارج ہی کر دینا چاہا اور لذّت ہی لذّت کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔ (بعینہٖ جس طرح تم نے بعض لوگوں کے متعلق سنا ہوگا کہ وہ لذیذ ترین غذائیں کھاتے ہیں اور جب پیٹ بھر جاتا ہے تو حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دیتے ہیں اور پھر کھانے لگ جاتے ہیں)۔ ضرورت کے عنصر کو خارج کر کے، محض لذّت کو مقصود بنا لینا ایسی "جنسی بدنہادی" SEX PERVERSION پیدا کر دیتا ہے جس کی آخری حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ عام زناکاری اس کی ابتدائی شکل ہے جس میں ضرورت (یعنی اولاد پیدا کرنے کے مقصد) کو خارج کر کے خالص لذّت کو مقصود بنا لیا جاتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد حصولِ لذّت کے سینکڑوں طرق اطوار ایجاد و اختیار کئے جاتے ہیں۔

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ جنسی صلاحیّت کا مقصد افزائشِ نسل ہے۔ اس مقصد کو چھوڑ کر اسے محض حصولِ لذّت کے لئے استعمال کرنا مقصدِ فطرت کے خلاف ہے۔ قرآنِ کریم نے جنسی اختلاط کے جائز و ناجائز ہونے کے لئے دو اصطلاحات استعمال کی ہیں جو اس حقیقت کو نکھار کر سامنے لے آتی ہیں۔ وہ ان رشتوں کی فہرست دے کر جن سے نکاح حرام ہے، کہتا ہے کہ باقی عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں بشرطیکہ ان سے اختلاط "مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ (۴/۲۴) ہو۔ "محصنین" کے معنی ہیں حفاظت سے رکھنا۔ قلعہ بند کر لینا۔ اور "مسافحین" کے معنی ہیں محض بہا دینے کی خاطر جنسی اختلاط کرنا۔ چونکہ نکاح اور زنا میں ابتدائی فرق یہ ہے کہ نکاح میں جنسی اختلاط سے مقصد، نطفہ کو رحم میں محفوظ کر دینا ہوتا ہے تاکہ اس سے افزائشِ نسل ہو، اور زنا میں کوشش کی جاتی ہے کہ لذّت تو ملے لیکن نطفہ نہ ٹھہرے (وہ بہہ جائے) اس لئے قرآنِ کریم کی ان اصطلاحات کا اوّلین مفہوم بالترتیب نکاح اور زنا ہے۔ لیکن اس سے قرآنِ کریم نے خود جنسی اختلاط کی نوعیت اور رعایت کو بھی واضح کر دیا ہے۔ یعنی

(i) اگر جنسی اختلاط بلا نکاح ہے تو وہ ہر حال میں ناجائز ہے۔ اس سے مقصد محض حصولِ لذت ہوتا ہے۔

(ii) نکاح کے ساتھ، جنسی اختلاط سے مقصد افزائشِ نسل ہے۔ اگر یہ مقصد پیشِ نظر نہیں، اور اختلاط محض حصولِ لذت کے لئے ہے تو یہ فطرت کی عطا کردہ صلاحیت کا غلط استعمال ہے۔ اس صورت میں بیوی "حرث" (کھیتی) نہیں رہتی، عیاشی کا سامان بن جاتی ہے۔

(iii) اس صلاحیت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ نکاح کے بعد جنسی اختلاط افزائشِ نسل کے لئے ہو۔ بیوی "حرث" (کھیتی) رہے۔ لذت کی خاطر جنسی صلاحیت ضائع کرنے کا آلہ بن کر نہ رہ جائے۔

اس سے ضبطِ ولادت کا سارا مسئلہ صاف ہو جاتا ہے۔ یہ تم پہلے دیکھ چکے ہو کہ:-

(الف) اولاد عند الضرورت پیدا کرنی چاہیئے۔ انسان کو اس باب میں اختیار ملا ہی اس مقصد کے لئے تھا۔

اور یہ تم نے اب دیکھ لیا ہے کہ

(ب) غیر منکوحہ عورت کے ساتھ جنسی اختلاط حرام ہے۔ اور

(ج) منکوحہ بیوی کے ساتھ اختلاط اس وقت مطابقِ فطرت ہے جب اولاد پیدا کرنا مقصود ہو۔

لہذا جب اولاد پیدا کرنا مقصود نہ ہو، تو بیوی کے ساتھ جنسی اختلاط کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن کریم کی رُو سے، خاندانی منصوبہ بندی کے لئے نہ مانع حمل ادویات و تدابیر کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی مرد یا عورت کو بانجھ بنا دینے کی حاجت۔ وہ خود عائد کردہ پابندی کے ماتحت، باہمی اختلاط سے مجتنب رہتے ہیں اور اس وقت تک مجتنب رہتے ہیں جب تک انہیں بچہ پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ اس میں نہ "عزل" کی ضرورت پڑتی ہے[1] اور نہ ہی مانع حمل تدابیر کے عام ہونے سے، حرامکاری کے بڑھ جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔

---

[1] عزل افزائشِ نسل کے مقصد سے گریز اور لذت کے حصول کا اس زمانے کا وضع کردہ ذریعہ تھا جب ہنوز مانع حمل آلات وغیرہ ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ اس سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ جب میں نے کہا تھا کہ عزل سے متعلق روایات کبھی نبی اکرمؐ کی احادیث نہیں ہو سکتیں تو اس کی وجہ کیا تھی۔ کیا تم اسے تصور میں بھی لا سکتے ہو کہ صحابہ کبارؓ عزل کی اجازت مانگتے ہوں گے اور رسول اللہ اس کی اجازت دیتے ہوں گے؟ اور وہ بھی اس مقصد کے لئے کہ اگر لونڈیوں کو حمل قرار پا گیا تو ان کی

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

مجھے اندازہ ہے کہ تم جھٹ سے کہہ دو گے کہ یہ ناممکن ہے۔ بیوی بھلی چنگی موجود ہو اور مرد برسوں تک اس کے پاس نہ جائے۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہی وہ مقام تھا جس کے متعلق میں نے شروع میں WARNING دی تھی کہ چونکہ یہ بات تمہارے سامنے (غالباً) پہلی دفعہ آئے گی اور انوکھی سی معلوم ہوگی اس لئے تم سطحی طور پر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ جانا۔ گہرے غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔

یہ ناممکن نہیں سلیم! ممکن ہے۔ اور ایسا ممکن کہ اس کے لئے تمہیں کسی کاوش و تردّد کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ جنسی جذبات انسان کے اپنے خیال سے بیدار ہوتے ہیں۔ از خود کبھی نہیں ابھرتے۔ اور انسان کے خیالات، اس کی تعلیم و تربیت اور عقائد و نظریات کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ تم سوچو کہ بیوی کے "ایام" کے دوران ہمارا خیال تک بھی مقاربت کی طرف نہیں جاتا۔ لیکن ایک غیر مسلم اس میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ان دنوں مقاربت جائز نہیں۔ اس لئے ہمارا خیال بھی اس طرف نہیں جاتا۔ یا مثلاً ایک غلط کار نوجوان جو غیر عورتوں تک پہنچنے میں اپنی جان تک کی بازی لگا دیتا ہے، راتوں کی تنہائی میں، اپنی جوان ہمشیرہ کے پاس سویا رہتا ہے حالانکہ اس وقت کمرے میں کوئی تیسرا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کی طرف وہ نگاہِ بد سے دیکھتا تک نہیں۔

یہ سب خیالات کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے[1]؟ غالباً پچھلے سال کا ذکر ہے۔ اخبارات میں امریکہ کے ایک جوڑے کا حال شائع ہوا تھا جو آٹھ دس سال سے میاں بیوی کی حیثیت سے خوش و خرم رہتے تھے۔ (تم نے بھی شاید یہ واقعہ پڑھا ہو) ان کے ہاں نہایت خوبصورت دو تین بچے بھی تھے کہ ایک دن اتفاقاً ان کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ بہن بھائی ہیں۔ ہوا یوں کہ وہ بچے ہی تھے کہ انگلینڈ میں ان کے ماں باپ مارے گئے۔ لڑکے کو کوئی فوجی اپنے ساتھ لے گیا اور لڑکی کو ایک امریکن اپنے ساتھ لے آیا۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بالکل بے خبر تھے۔ بھائی کو اس کا علم نہیں تھا کہ اس کی کوئی بہن ہے۔

(سابقہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) قیمت کم ہو جائے۔ استغفراللہ!

[1] بعض اوقات ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں جن میں لوگ بہنوں بیٹیوں تک بھی دست درازی کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن یہ استثنائی حالات انتہائی درجہ کی مریض ذہنیت کے مظاہر ہوتے ہیں۔ انسان کی عمومی کیفیت وہی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ "انتہائی درجہ کے مجرم" تو مستثنیات میں سے ہوتے ہیں۔

اور بہن یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا کوئی بھائی ہے۔ اتفاق سے لڑائی کے بعد، وہ لڑکا امریکہ جا پہنچا۔ اور یونہی اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہو گئی (جو اب جوان ہو چکی تھی) اور اس طرح ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ اور برسوں تک انہیں اپنی سابقہ رشتہ داری کا علم نہ ہو سکا۔ کیونکہ بچپن کا کوئی واقعہ انہیں یاد نہیں تھا۔

جس دن انہیں معلوم ہوا ہے کہ وہ بھائی بہن ہیں، ان کی شادی کو آٹھ دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن اس بات کا علم ہونے کے بعد ان پر جو قیامت گزری ہے اس کا اندازہ ان بیانات سے لگ سکتا تھا جو انہوں نے اخبارات کو دیئے تھے۔ ان کے کتنے دن رونے میں کٹ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں؟ بہرحال پادریوں نے ان کی تسلّی تشفّی کی اور وہ پھر بہن بھائی کی زندگی بسر کرنے لگ گئے!

یہ کیا تھا؟ صرف اس خیال کا اثر کہ بہن بھائی، ازدواجی رشتہ میں منسلک نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ ایران کے شہنشاہ، کھلے بندوں اپنی بہنوں سے شادی کر لیا کرتے تھے۔ یہ ہے خیالات کا اثر!

لہٰذا اگر ہم قرآن کریم کے اس تصوّر کو اپنے عقیدہ کا جزو بنا لیں کہ بیوی سے جنسی اختلاط صرف افزائشِ نسل کے لئے کیا جا سکتا ہے تو ہمیں اس مقصد کے علاوہ جنسی مقاربت کا خیال تک بھی نہیں آئے گا اور ہم اس کے تصوّر سے اسی طرح دُور بھاگیں گے جس طرح "ایام" کے دوران میں مقاربت کے خیال سے۔ ہمارے ہاں بیس پچیس برس اُدھر تک (گاؤں میں بالخصوص) یہ خیال عام تھا کہ جب تک بچّہ دودھ پیتا ہے، مقاربت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس پر لوگ اس شدّت سے پابند تھے کہ اگر کسی سے اس کی خلاف ورزی ہو جاتی تھی تو وہ مُنہ چھپائے پھرتا تھا۔ ان تصریحات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جنسی جذبہ، انسانی خیالات کے تابع رہتا ہے اس لئے اس پر کنٹرول کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم جنسی جذبہ کے لئے "اضطراری حالت" کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ جہاں تک بھوک کا تعلق ہے وہ اضطراری حالت کے امکان کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی لئے اس نے ایسی حالت میں حرام تک کھانے کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن جنسی تقاضے کے لئے اس نے اس کی کہیں اجازت نہیں دی۔ اس کے برعکس اس نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا (۲۴/۳۳) "جو لوگ شادی کا سامان نہیں پاتے، انہیں ضبطِ خویش سے کام لینا چاہیئے"۔ یعنی اس نے یہ نہیں کہا کہ جس طرح کھانے کے معاملے میں اضطراری حالت میں حرام کھا لینے کی اجازت ہے اسی طرح ایسے شخص

کے لئے بھی، جسے جائز طریق سے جنسی تسکین کا سامان میسّر نہ ہو، حرامکاری کی اجازت ہے۔

یہ تھا جنسیّت کا وہ تصوّر جو قرآنِ کریم نے پیش کیا تھا ذرا غور کرو کہ اس تصوّر کی رُو سے قرآنِ کریم، انسانیّت کو کس مقام پر لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب ہمارے ہاتھوں سے قرآنِ کریم کا دامن چھوٹ گیا تو جنسیات کے متعلق ہمارا تصوّر پست ترین سطح پر پہنچ گیا۔ ذرا سوچو کہ جس قوم کی یہ حالت ہو کہ ان کے سلاطین کے محلّات میں دو دو تین تین ہزار ممتوعہ لونڈیاں ہوں۔ جن کے بازاروں میں عورتیں بھیڑ بکری کی طرح فروخت اور نیلام ہوتی ہوں۔ جو چار بیویوں کے لئے وجۂ جواز یہ قرار دیں کہ اس سے ایسا پروگرام مرتّب ہو جاتا ہے جس میں کوئی شب مقاربت سے خالی نہیں رہ سکتی۔ اور قیامت یہ کہ وہ ان چیزوں کو "شریعتِ حقّہ" کے عین مطابق قرار دیں۔ ان کے جنسی تصوّر کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت رہ جاتی ہے؟ ہماری قوم کس حد تک جنسیات میں ڈوبی ہوئی ہے اس کا اندازہ لگانا ہو تو تم طبِ یونانی کی کوئی کتاب (بلکہ کسی یونانی دواخانہ کی فہرستِ ادویات) اٹھاؤ اور دیکھو کہ اس میں کتنے فیصد دوائیاں جنسیات کے ذیل میں آتی ہیں؟ اسی جنسیت زدہ ذہنیّت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں اس قسم کے فتاوے دیئے جاتے ہیں کہ (مثلاً) اگر ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی کسی ایسے جزیرہ میں پہنچ جائیں جہاں کوئی تیسرا نہ ہو تو وہ آبادی کی طرف واپسی تک "عارضی نکاح" کر سکتے ہیں۔ یعنی یہ ذہنیّت اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی کہ ایک نوجوان جوڑا، چند دنوں کے لئے بھی، جنسی اختلاط کے بغیر گذارہ کر سکتا ہے۔ یہ اس قوم کی حالت ہے جس کی آسمانی کتاب جنسیات میں اضطراری کیفیت کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ اس لئے کہ وہ جنسیات کو اس مقام پر رکھتی ہے جو مقام اسے فطرت کے پروگرام کے مطابق ملا ہے۔ ہم نے جنسیات کو اس مقام سے اتار کر اپنے اعصاب پر سوار کر لیا ہے۔ اور پھر اسی کو اس کا صحیح مقام قرار دے کر اس سے پیدا شدہ مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے نکلتے ہیں! نتیجہ ظاہر ہے۔

ہمارا اپنا جنسی تصوّر یہ تھا۔ اس پر مغربی خیالات کے جھکّڑ نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ یہ وہ آتشِ ویرانہ ہے جس کے نرغے میں ہماری موجودہ نسل گھری ہوئی ہے۔ اسے اس عذاب سے نجات دلانے کی شکل اس کے سوا کوئی اور نہیں کہ

(i) جنسیات کے متعلق ہمارے قدیم مذہبی تصوّر میں بنیادی تبدیلی کی جائے اور

(ii) مغربی خیالات کے طوفان کو روکنے کے لئے محکم تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کے لئے ازبس

ضروری ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کو قرآنی خطوط پر متشکل کریں اور معاشرہ کی عمارت، قرآنی بنیادوں پر استوار کریں۔

جو کچھ گذشتہ صفحات میں کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

۱۔ ضبطِ ولادت کا سوال اس لئے اہمیت اختیار کر رہا ہے کہ ہمارے ملک کی پیداوار بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

۲۔ اس مشکل مسئلہ کے حل کے دو گوشے ہیں۔

(i) ملک کی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ حد تک بڑھانے کا انتظام کیا جائے۔ اور

(ii) اگر اس کے بعد بھی ضرورت رہے تو افزائشِ نسل پر حد بندی عائد کر دی جائے۔

۳۔ جہاں تک شق (i) کا تعلق ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں قرآنی نظامِ ربوبیت رائج کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذرائع پیداوار قوم کی تحویل میں رہیں تاکہ جو منافع اس وقت افراد کے ہاں جمع ہو جاتا ہے وہ پیداوار کے اضافہ کے لئے صرف کیا جا سکے۔ اور

(ب) رزق کی تقسیم ضرورت کے مطابق مملکت کی زیرِ نگرانی ہو۔

۴۔ جہاں تک شق (ii) کا تعلق ہے قرآن کریم کی رُو سے یہ چیز قابلِ اعتراض نہیں کہ اس قسم کی اجتماعی اور ہنگامی ضرورت کے لئے افزائشِ نسل پر پابندی عائد کر دی جائے۔ فطرت نے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کو انسان کی مرضی کے تابع رکھا ہی اس لئے ہے کہ اسے افزائشِ نسل پر کنٹرول رہے۔ یہ اس معاملہ میں حیوانات کی طرح بے بس اور مجبور نہیں۔

۵۔ لیکن برتھ کنٹرول (ضبطِ ولادت) کا طریقہ سیلف کنٹرول (ضبطِ خویش) ہے۔ آلات و ادویات کے ذریعہ ایسی شکل پیدا کرنا جس سے لذّت حاصل ہو جائے لیکن استقرارِ حمل نہ ہو، جنسی اختلاط کے فطری مقاصد کے خلاف ہے۔ جنسی اختلاط افزائشِ نسل کے لئے ہے نہ کہ حصولِ لذّت کے لئے۔ اگر افزائشِ نسل مقصود نہ ہو تو اختلاط بے محل ہو جاتا ہے۔

۶۔ اس قسم کا ضبطِ خویش، ناممکن تو ایک طرف، ذرا بھی مشکل نہیں۔ جنسی جذبہ انسانی خیالات کے تابع رکھا گیا ہے۔ اگر اس طرح خیال نہ کیا جائے تو یہ جذبہ بیدار ہی نہیں ہوتا۔

۷۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ

(i) جنسیات کے متعلق صحیح قرآنی تصور عام کیا جائے۔
(ii) معاشرہ میں عورت کو وہ عزت کا مقام دیا جائے جس سے وہ جنسی جذبہ کی تسکین کا ذریعہ متصور ہونے کے بجائے وجہِ تکریم انسانیت سمجھی جائے۔
(iii) ان تمام اسباب و ذرائع کو سختی سے روکا جائے جو جنسی جذبہ کی بیداری کو عام کر رہے ہیں جنسی اشتعال پیدا کرنے والی فلمیں، تصاویر، لٹریچر، آرٹ، نمودِ حسن اور عریانیت کے مظاہر وغیرہ وغیرہ۔ اور
(iv) تعلیمی نظام کو صحیح خطوط پر متشکل کیا جائے۔

اس طرح نہ صرف یہ کہ ضبطِ ولادت کا مسئلہ آسان ہو جائے گا بلکہ قوم کے پاس اس قدر عظیم توانائیاں محفوظ ہو جائیں گی جن سے ہر تعمیری پروگرام بطریقِ احسن تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ قرآن کی بتائی ہوئی یہ وہ حقیقت ہے جس کی شہادت مغرب کے محققین بھی دے رہے ہیں۔ میں تمہیں اس سے پہلے ایک خط میں تفصیلاً بتا چکا ہوں کہ جنسیات کے مشہور محقق ڈاکٹر J.D. UNWIN نے اپنی کتاب SEX AND CULTURE میں اپنی تحقیقات کے نتائج کس وضاحت سے پیش کئے ہیں۔ اس مقام پر اس کے دو اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔ تم دیکھو کہ وہ جنسی توانائی کے متعلق کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

> کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں۔ جب اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کر دیئے جائیں) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی۔ (صفحہ ۴۱۴)

وہ اپنی کتاب کے آخر میں لکھتا ہے۔

> اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدتِ مدید تک، بلکہ ابدالآباد تک، قائم اور آگے بڑھتی رہیں، تو اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ پہلے اپنی تخلیقِ نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر

اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع، ایک مدتِ مدید تک، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رُخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی۔ وہ تہذیب و تمدن کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی معاشرہ نہیں پہنچ سکا۔ اور انسان کی توانائیاں ان روایات کو ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی، جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں نہیں آسکتا۔

(صفحہ ۴۳۲)

لیکن یہ بات سلیم! ابھی انسان کی سمجھ میں شاید ہی آسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو ابھی تک بالعموم انسانی قامت نصیب ہی نہیں ہو سکا۔ یہ ابھی تک (بہ ہیئتِ مجموعی) حیوانیت کے دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ بلکہ اس کی سطح حیوانوں سے بھی پست ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ

۱۔ فطرت نے حیوانات کے جنسی جذبہ پر خود SAFTY VALVE لگا دیا ہے وہ اسے اس وقت بیدار کرتی ہے جب ان سے اولاد پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ حیوانات خاندانی منصوبہ بندی FAMILY PLANNING نہیں کر سکتے۔ انہیں اس کا اختیار ہی نہیں دیا گیا۔ لیکن اس عدمِ اختیار کا انہیں فائدہ یہ ہے کہ ان کی اس قدر قیمتی توانائی ضائع نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ محض لذّت کی خاطر جنسی اختلاط پر قادر ہی نہیں۔

۲۔ انسان کو فطرت نے اس کا اختیار دیا ہے کہ وہ FAMILY PLANNING کر سکے۔ یعنی وہ اس باب میں حیوان کی طرح مجبور نہیں کہ جب فطرت چاہے اس سے اولاد پیدا کرالے۔ انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے PLANNING کے مطابق اولاد پیدا کرے۔ یہ فطرت کی بہت بڑی گنجائش تھی جس سے اس نے انسان کو نوازا تھا۔

۳۔ لیکن انسان کیا کرتا ہے؟ یہ FAMILY PLANNING نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے یہ اپنے آپ کو حیوانات کے درجے تک رکھتا ہے۔ یعنی وہ فیملی پلاننگ کر نہیں سکتے۔ یہ کر سکتا ہے لیکن کرتا نہیں۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ لیکن یہ اس کے ساتھ ہی اپنی اس قدر قیمتی توانائی کو محض حصولِ لذّت

کے لئے ضائع کرتا ہے. اس اعتبار سے یہ حیوانات سے بھی پست درجہ پر ہے. وہ فیملی پلاننگ نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنی توانائی کو تو محفوظ رکھ سکتے ہیں! یہ اپنے اختیار کے غلط استعمال سے دوہرے نقصان میں رہتا ہے. اسی لئے قرآنِ کریم نے ایسے انسانوں کے متعلق جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے کہا ہے کہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۷/۱۷۹) یہ حیوانات کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ. دوسری جگہ ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ..... (۹۵/۵-۴) "ہم نے انسان کو بہترین توازن کے ساتھ حسین ترین ہیئت سے پیدا کیا تھا. لیکن (یہ جو کچھ کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) ہم اسے پست سے پست ترین سطح تک لے جاتے ہیں ____

____ کیا یہ انسان کی پست ترین سطح نہیں کہ فیملی پلاننگ کی جو امکانی صلاحیت اسے خصوصیت سے عطا ہوئی تھی، یہ اس سے تو فائدہ نہ اٹھائے اور اپنے اختیار کے بیجا استعمال سے اپنی توانائیوں کو ضائع کر کے حیوانات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ نقصان میں رہے؟ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۱۰۳/۲-۱) زمانہ کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان نے ہمیشہ اپنا نقصان کیا ہے.

کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ فیملی پلاننگ کا تعلق عقل و فکر REASON سے ہے اور جنسی لذت کے حصول کا تعلق جذبات سے. جب بھی انسان عقل و فکر کو جذبات کے تابع رکھے گا، نقصان اٹھائے گا. لیکن جب جذبات سے عقل و فکر کی راہ نمائی میں کام لے گا، کامیاب ہوگا. قرآنِ کریم یہی سکھانے کے لئے آیا تھا کہ جذبات کو کس طرح عقل و فکر کے تابع رکھا جاتا ہے. عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان کی ساری PROBLEMS تین ہیں. زر، زمین، زن. انسان نے ان تینوں معاملات میں، جذبات کو عقل و فکر (یا یوں سمجھو کہ حصولِ لذت کو ضرورت) پر غالب رکھا ہے. اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے معاشرہ میں فساد ہی فساد رونما ہوتا چلا جا رہا ہے. قرآنِ کریم نے ان تینوں (اہم ترین اور مشکل ترین مسائل کا حل ایک ایک فقرہ میں کر دیا. اس نے کہا کہ زر (دولت) مبادلۂ اشیاء کا آسان ذریعہ ہے اس سے یہی کام لینا چاہیئے. اسے ہوسِ زر اندوزی یا لذتِ اقتدار کی خاطر جمع کرتے رہنا اس کا بڑا غلط استعمال ہے اس نے کہہ دیا کہ صحیح معاشی نظام

وہ ہے جس میں فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے (۲/۲۱۹)۔ اس سے اس نے "زر" سے پیدا ہونے والے تمام مفاسد کا علاج کر دیا۔ یعنی اس نے زر کو ضرورت کی شے قرار دیا۔ جذبات کی تسکین کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔

زمین کے متعلق اس نے کہا کہ یہ نوعِ انسان کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتی ہے (۵۶/۷۳)(۲۰-۱۹/۱۵) اس لئے اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھنا چاہیئے (۴۱/۱۰)۔ اس (ذریعۂ رزق) کو ذاتی ملکیت میں لے لینا، تاکہ دوسرے انسان تمہارے دست نگر ہو جائیں اور یوں تم حکومت کرنے کے جذبہ کی تسکین کر سکو، بہت بڑا ظلم ہے۔ ("ظلم" کے معنی ہیں کسی شے کو اس مقام پر رکھنا جس کے لئے اسے بنایا نہیں گیا)۔ اس نے زمین کو بھی ضرورت کے لئے استعمال کرنا سکھایا۔ جذبات کی تسکین کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔

اسی طرح اُس نے "زن" کے متعلق کہہ دیا کہ جنسی اختلاط سے مقصد اولاد پیدا کرنا ہے، نہ کہ محض لذّت حاصل کرنا۔ یہاں بھی اس نے جذبات کو ضرورت کے تابع رکھا ہے۔ اس نے اس طرح اس مشکل ترین مسئلہ کو بھی حل کر دیا۔

زر اور زمین کے متعلق انسان رفتہ رفتہ قرآنی تصوّر کی طرف آ رہا ہے لیکن زن کے متعلق ابھی اس نے اپنے نظریہ میں تبدیلی کا احساس نہیں کیا۔ اگرچہ یہ مسئلہ اس کے لئے وبالِ جان بن رہا ہے۔

جس دن انسان نے فطرت کا یہ راز پا لیا کہ انسان کو جنسی جذبہ پر اختیار و ارادہ اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ افزائشِ نسل کو اپنے کنٹرول میں رکھ سکے اور جنسی اختلاط سے مقصود افزائشِ نسل ہے، نہ کہ محض حصولِ لذّت، وہ دن انسانیت کی تاریخ میں عظیم انقلاب کے آغاز کا دن ہو گا۔ دیکھیں یہ سعادت سب سے پہلے کس قوم کے حصے میں آتی ہے؟

جی چاہتا ہے کہ یہ سعادت پاکستان ہی کے حصے میں آتے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس پروگرام کی تکمیل میں وقت لگے گا۔ اس لئے اگر ہمارے حالات کا تقاضا یہ ہو کہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی فوری روک تھام کی جائے گی تو بامرِ مجبوری کچھ وقت کے لئے ضبطِ ولادت کی ایسی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں جو مضرِ صحت نہ ہوں۔ لیکن اس صورت میں اس پر کڑی نگرانی کی جانی ضروری ہے کہ یہ چیزیں ان ہاتھوں تک نہ پہنچنے پائیں جو ان کا ناجائز استعمال کریں۔ اگر ہمارے ہاں اسلامی

آئین نافذ ہو گیا تو اس وقت انسدادِ فحش کاری کے لئے محکم تدابیر اختیار کی جانی ضروری ہوں گی۔ یہ چیز بھی اسی ذیل میں آئے گی۔

لیکن یہ محض ہنگامی تدبیر ہو گی۔ مستقل اور مطابق منشائے فطرت وہی تدبیر ہو گی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یعنی جنسی اختلاط کو صرف اولاد پیدا کرنے کے لئے صحیح سمجھنا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ چیز صحیح تعلیم و تربیت سے حاصل ہو سکے گی۔

یہ ہے سلیم! ضبطِ ولادت کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم کا ماحصل۔

اچھا خدا حافظ! اس کے بعد دیکھئے کب ملاقات کا موقعہ ملتا ہے۔ طاہرہ بیٹی سے بہت بہت دُعا کہنا اور جاوید میاں کو دیدہ بوسی۔ اللہ اس قرآنی گھرانے پر اپنے سحابِ کرم کی بارش کرے۔

والسلام
پرویز

جولائی ۱۹۶۰ء

سلیم کے نام خطوط (جلد اوّل) کے موضوعات

صفحات ۲۶۴۔

طلوعِ اسلام ٹرسٹ ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

سلیم کے نام خطوط (جلد دوم) کے موضوعات

1. خُدا کا تصوّر
2. مقامِ محمّدیؐ
3. کائنات کے دو عظیم انقلاب!
4. عید میلاد النّبیؐ
5. رحمۃ للعالمینؐ
6. درُود کا مفہوم
7. اطاعتِ رسولؐ
8. اسلامی قانونِ شریعت کے مآخذ
9. پاکستان میں قانون سازی کے اصول
10. جشنِ نزولِ قرآن
11. اندھے کی لکڑی
12. فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں۔

ضخامت ۲۱۲ صفحات ــــــــ طلوعِ اسلام ٹرسٹ ۲۵۔بی گلبرگ ۲۔ لاہور